کشمیر کی کلی

الیاس سیتاپوری

www.taemeernews.com

الیاس سیتاپوری

ایشیا کا وہ واحد مصنف ہے جس کا
اسٹائل منفرد اور حقیقت سے بہت قریب ہے
اور جس کی کہانیاں قاری کی وسعتِ نگاہ میں اضافہ
اور سائنسی طرزِ فکر پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ اس کی کہانیاں ہر مکتبۂ فکر اور ہر طبقے میں دلچسپی
سے پڑھی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

الیاس سیتاپوری کی منتخب تاریخی کہانیاں

کشمیر کی کلی

اور دوسری کہانیاں

003
www.taemeernews.com

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : ۱۶ روپے RS.16/=

طباعت : نیو پبلک پریس، گلی قاسم جان، دہلی میں فوٹو آفسیٹ کے ذریعے طبع ہوئی۔

زیرِ اہتمام : مظفر الدین احمد

نئی نسل

—— اور اُن قاریوں کے نام، جنھوں نے اپنی تاریخ کی تلخ حقیقتوں کو گوارا کیا اور کہانیاں پسند کر کے میری ہمت افزائی کی۔

الیاس سیتاپوری

www.taemeernews.com

صوفی کا انجام 9

[illegible]

اسکندریہ کی دوشیزہ 37

[illegible]

خانِ اعظم کا تحفہ 68

[illegible]

برک کا غلام زادہ 95

[illegible]

عشقِ بلقیس 115

[illegible]

www.taemeernews.com

کافر کا عشق 133

[illegible] بہت ضروری ہے ۔

چھوٹی بیگم صاحبؒ کی داستانِ عشق 165

[illegible]

کشمیر کی کلی 200

[illegible] جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔

[redacted]

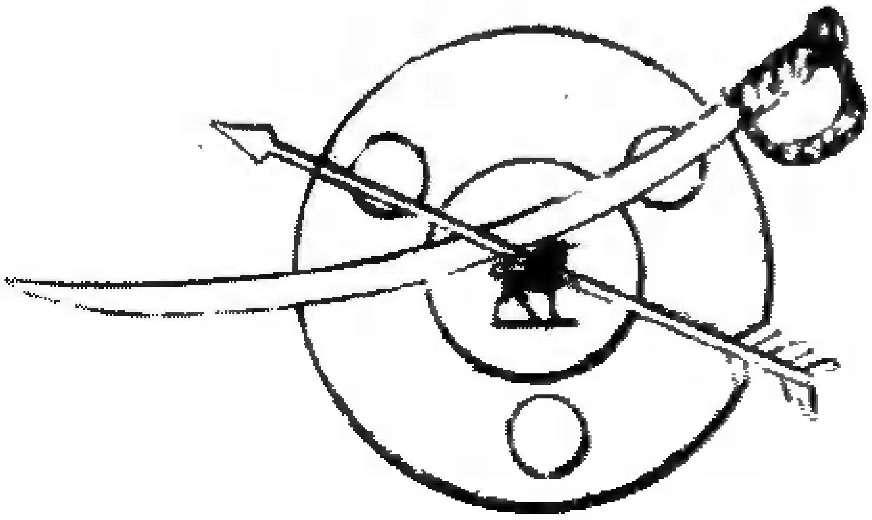

www.taemeernews.com

پہلی بات

کیا تاریخ واقعی خود کو دہراتی ہے؟

شاید نہیں، کیونکہ جسے اب تک تاریخ کے خود کو دُہرانے کا عمل کہا گیا ہے وہ دراصل انسان کے جبلی میلانات کا عمل ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کیجیے۔ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے، نت نئے عجیب و غریب واقعات کے انبار نظر آئیں گے۔ ان واقعات کی تہہ میں محبت، نفرت، ہمدردی، خودغرضی، خوف، غصہ، حسد، رشک، حرص و طمع، ہوس، اضطراب و اضطرار، عدم استغنا، غیر قانع فطرت اور ناشکرے پن کے جذبات اور احساسات کارفرما دکھائی دیں گے۔ انسان کی یہ خوبیاں اور خرابیاں اس کی فطرت، اس کے خمیر میں شامل ہیں۔ راعی، رعایا، راجا پرجا، حاکم محکوم، وزیر، امیر، عوام اور خواص، غرضیکہ انسان کچھ بھی ہو، کہیں بھی ہو اور کسی بھی زمانے کا ہو، اس میں ان خوبیوں اور خرابیوں کا عمل کارفرما نظر آئے گا۔ ایک مخصوص ماحول اور حالات میں چند صدی بیشتر جو کچھ ہو چکا ہے، اسی مخصوص ماحول اور انھی حالات میں آج بھی وہی کچھ ظاہر اور رونما ہوگا اور اسی کو تاریخ کا خود کو دہرانے کا عمل کہا جاتا ہے۔

وہ حسد اور محرومی کا احساس ہی تو تھا جس نے قابیل کو ہابیل کا قاتل بنا دیا تھا، اور آج بھی جب انسان حسد اور محرومی کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ قابیل سے ملتا جلتا کوئی کارنامہ انجام دے دیتا ہے۔ یہاں قابیل ایک علامت ہے۔ قابیل بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور وزیر بھی، امیر بھی، تاجر، سیاستدان، مذہبی پیشوا، عالم، جاہل، دہریہ، منکر، قائل، استاد، شاگرد، غرض کوئی بھی قابیل بن سکتا ہے اور ان سب کے اعمال اور کردار نوعیت میں یکساں اور فرق مراتب سے معمولی اور غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

جو مصنف انسانی جبلت اور فطرت کی اس گہرائی اور گیرائی سے واقف نہیں ہیں، یا اگر واقف بھی

ہی دکھ دن کے حقائد اور جذبۂ اسلاف پرستی پتا کر پتا کرنے میں مانع آتے ہیں تو وہ جب بھی کسی کے بارے میں لکھنے بیٹھیں گے تو وہ اس کے پیچھے پائے جانے کا یقین اور اعتقاد پیدا کریں گے۔ اس کے بجائے پر قلم اٹھائیں گے۔ ایسا کرتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ تاریخ اور اس کا عمل اور اس کے نتائج ہر کسی کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ مروّت، رعایت اور جانبداری تمام کی ان کے یہاں کوئی چیز نہیں۔ اگر ان سچائیوں کو نظر انداز کر کے کچھ لکھا جائے گا تو وقتی مصلحتوں کی وجہ سے جو قبولیت عام حاصل کرے تو کرے لیکن ترقی یافتہ غیر متعصب مستقبل کا انسانی معاشرہ اسے مسترد کر دے گا۔ شاید اسی وجہ سے نپولین نے کہا تھا "تاریخ جھوٹ کا مجموعہ ہے۔" اور میتھیو آرنلڈ METHEW ARNALD نے تاریخ کو "جھوٹ کا رسیتا دریا" قرار دیا ہے۔

ایکس سیتاپوری غالباً ایشیا کا واحد تاریخی افسانہ نگار ہے جس نے تاریخ کا مطالعہ انسانی جبلت اور نفسیات کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانیاں لکھتے وقت قطعی غیر جانبدار نظر آتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں تاریخ کے تمام پہلو نہایت مہارت اور چابک دستی سے سموئے ہوئے ملیں گے۔ علم و ادب، سیاست، اخلاقیات، معاشیات اور ثقافت، ان کی رمق ایکس سیتاپوری کی کہانیوں میں اس طرح پیوست اور مربوط ملے گی کہ قاری کو ان کی سچائی پر شبہ تک نہ ہوگا اور واقعات اور انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ اس مشاہدے کو خوبصورت اسلوبِ نگارش اور افسانوی تکنیک سے کاغذ پر منتقل کر دینے کا عمل اس غضب کا ہوتا ہے کہ قاری خود کو اس کی کہانیوں کے ماحول میں پہنچا ہوا پاتا ہے اور زمانی اور مکانی فصل کے باوجود ان کرداروں میں کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتا اور وہی احساسات اور جذبات محسوس کرنے لگتا ہے جو کہانیوں کے کرداروں میں پائے جاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ ایکس سیتاپوری کی ہر کہانی انسانوں کی کہانی ہوتی ہے اور جو ہر دور کے انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔

جی۔ ایم ٹریویلین G.M.TREVELYAN کہتا ہے کہ "تاریخی حقائق کو بہتر الفاظ کا جامہ پہنانے کے لیے ہمیں شاعرانہ تخیل کی ضرورت ہے۔" اس قول کی کسوٹی پر ایکس سیتاپوری کی کہانیوں کو پرکھ کر دیکھئے کہ یہ قول ان کہانیوں پر کتنا صادق آتا ہے۔

اس کی کہانیوں میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ملتی ہیں ان میں ایک یہ خوبی بھی ہے کہ جو کہانی، جس ملک اور جس زمانے سے متعلق ہوتی ہے اس کا لب و لہجہ، کرداروں کا اندازِ گفتگو، تشبیہ و استعارے، محاورات اور امثال اس ملک اور اس زمانے سے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات کہانی میں ذرا سا تلمیح یا ذرا سا اشارہ آنا ضروری اور وزنی ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے قاری اسی عہد میں پہنچ جاتا ہے۔

میں نے ایکس سیتاپوری کو کتابوں کے انبار میں لکھتے دیکھا ہے۔ ان سے باتیں کی ہیں، کہانیاں لکھنے کا نقطۂ نظر سمجھا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ کہانیاں لکھنے کے دوران مصنف کو ہر چیز کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیمرے کی آنکھ جس چیز کو جیسا دیکھتی ہے اسی طرح محفوظ کر لیتی ہے۔ اس کے پاس مروّت، رعایت، احترام یا جانبداری کے جذبات نہیں ہوتے۔ کیا آپ کیمرے سے لی ہوئی کسی تصویر پر یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ اس میں اصل کے خلاف کوئی گڑبڑ یا ملاوٹ کی گئی ہے؟ چیچک کے وہ داغ جو اصل چہرے پر موجود

www.taemeernews.com

تھے لیکن کیمرے کی آنکھ نے ان کی پردہ داری کی ہے یا اگر کسی کے چہرے پر تو ایک داغ تک نہ تھا لیکن کیمرے کی آنکھ نے پورے چہرے کو داغ دار بنا کر دکھا دیا۔ چنانچہ ایکس سیتاپوری نے کیمرے کی آنکھ کی مثال سامنے رکھ کر کہانیاں لکھی ہیں۔ اس نے وہ بہت سے بت توڑ دیئے جو ہمیں اس کی کہانیاں پڑھنے سے پہلے بہت عظیم اور فوق الانسان نظر آتے تھے۔

مثل مشہور ہے "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" جب تک اس پر عمل کیا گیا ناہموں اور نامعقولوں کی شان میں قصائد لکھے جاتے رہے اور ممدوحوں کو ان ساری خوبیوں کا پیکر قرار دیا جاتا رہا جن کے معانی و مطالب تک سے وہ ناآشنا رہے ہوں گے۔ آج جب ایکس سیتاپوری نے تاریخ کی اس تلخ حقیقت کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا تو لوگ چونک پڑے۔ اس کی صاف گوئی اور جرأت کو بعض نے ناپسند کیا اور ناراض ہو گئے لیکن بہتوں نے اسے بے حد پسند کیا اور بہت زیادہ سراہا۔ شاید اس لیے کہ باتیں دل سے کہی گئی تھیں اس لیے دلوں میں اترتی چلی گئیں۔

آج تک یہ بات پورے یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایکس سیتاپوری کی شخصیت اور اس کے فن نے اسے کچھ اور ہم عصروں کے مقابلے میں نہایت ممتاز اور ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے۔

"مشیر صدیقی"

www.taemeernews.com

اس کے ایک طرف بیس سال زہد و ریاضت اور دوسری طرف فتنۂ شباب سر تا پا قیامت تھی۔ عزیب صوفی اس دوراہے پر تماشا بن گیا۔ تاریکی کے ایسے منظر میں اپنی صداقتوں کی حامل ایک ایسی تاثر انگیز کہانی جس کے ہر لفظ میں تاثر، تجسس اور لطف رچا بسا ہے۔ انسانی کمزوریوں کے محور پر گردش کرتی ہوئی عجیب و غریب داستان۔

•••

صوفی کا انجام

جب اسلام نے صحرائے عرب سے اٹھ کر ایران کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو یہاں کے بہت سے عوام اور خواص نے اس کی سادہ اور دل نشیں تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ لیکن جو کسی حال میں بھی اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کو بالآخر رہایں الوداع کہا اور جس کا جدھر منہ اٹھا چل کھڑا ہوا۔ تجارت پیشہ افراد نے ہندوستان کے جنوب مغرب کے ساحلوں کو آباد کیا اور مذہبی پیشواؤں میں سے کچھ نے تو اندرونِ ہند کی راہ لی اور کچھ نے بلخ کے شمال میں ہجرت کی اور دریائے سیر کے کنارے دور تک آباد ہوتے چلے گئے۔ یہ مذہبی پیشوا جنہیں موبد کہا جاتا تھا۔ یہاں بھی زیادہ دنوں تک اہرمن اور یزداں کے زیر سایہ نہ رہ سکے۔ اسلام یہاں بھی پہنچ گیا اور جب انہوں نے اچھی طرح یہ یقین کر لیا کہ ان کے اہرمن اور یزداں اسلام کے مقابلے میں بے بس ہو چکے ہیں تو یہ بھی اسلام کی آغوش میں چلے گئے۔

ان موبدوں کو تلواروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے انہیں مسلمانوں کی تلواروں اور محاربوں سے

www.taemeernews.com

بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگیاں آتش کدوں کی حدود میں گزاری تھیں۔ اس لیے مسلمان ہو جانے کے بعد انہیں اسلام میں بھی اسی قسم کی پناہ گاہ تلاش کرنا پڑی۔ یہاں تصوف جنم لے چکا تھا چنانچہ یہ موبد تصوف کے حصار میں داخل ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے آتش کدے خانقاہوں میں بدل گئے۔

ان میں عارف بلخی کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اس پینتالیس سالہ صوفی نے اپنی زندگی کے پچیس سال گھر سے ملحق چھوٹی خانقاہ میں اس طرح گزار دیئے تھے کہ اب اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس کی بستی میں کتنے بازار، کتنی سڑکیں اور کس کس چیز کی کتنی یا کہاں کہاں دکانیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن پچیس سالہ عزلت نشینی اور گوشہ گیری بھی خالق اور مخلوق کے درمیان حائل رہنے والے پردوں کو دور نہ کر سکی۔ طبیعت میں استغنا اور بے نیازی اتنی تھی کہ ایران کے مختلف صوبوں کے گورنر اپنے آدمیوں کے ذریعے مال و منال کے بیش بہا تحفے بھیجتے اور اس کے صلے میں نیک دعاؤں کے طالب ہوتے۔ اس دولت سے صوفی عارف کے معتقد فائدے اٹھاتے۔ لیکن وہ انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

آہو چشم دوشیزائیں صوفی عارف سے تخلیے میں ملتیں اور اس سے اپنی سفلہ خواہشات میں کامیابی کیلئے دعاؤں کی طالب ہوتیں۔ عارف پر ان کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ انہیں اپنے اخلاق و مواعظ سے نواز کر واپس بھیج دیتا۔ لیکن جب لمبی لمبی سیاہ فام زلفوں والی کوئی مخمور چشم حسینہ اس بات پر مُصر ہو جاتی کہ جب تک با آواز بلند اس کے لئے یہ دعا نہ کی جائے گی کہ اس کا بے وفا محبوب جو کسی دوسری حسینہ کی محبت کے فریب میں مبتلا ہو چکا ہے دوبارہ اس کی طرف راغب ہو جائے وہ اس خانقاہ سے باہر نہ نکلے گی۔ تو صوفی عارف کو اس ضدی اور سرکش حسینہ سے پیچھا چھڑانے کے لئے مجبوراً یہ دعا بلند آواز میں کرنی پڑتی۔ تب کہیں جا کر گستاخ لڑکی اس کا پیچھا چھوڑتی۔ صوفی عارف کا عورت کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اس کا حُسن معصیت کا سب سے بڑا ذریعہ اور اس کا شباب انسان کے تقدس اور معصومیت کے حق میں خطرناک حربہ ہیں۔

اور یہ حقیقت تھی کہ پینتالیس سالہ صوفی عارف کے چہرے پر جیسی معصومیت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔ وہ اس بات کی گواہ تھی کہ اس شخص نے نہایت پاکباز زندگی گزاری ہے لیکن پچیس سالہ ریاضت اور مجاہدے کے باوجود صوفی عارف طمانیت قلب، آسودگی روح اور سیرابی ذہن سے محروم تھا۔ اس نے بغداد کے صوفیوں کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ ان میں سے کسی کامل کی نظر التفات کے بغیر سلوک کی منزل تک پہنچنا ممکن تھا۔ ایک دن اس نے یہ طے کر لیا کہ اب وہ جلد از جلد بغداد پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اپنے ڈیڑھ سو عقیدت مندوں کے ساتھ ایک قافلے کے ساتھ ہو لیا۔ یہ قافلہ بلخ ہوتا ہوا بغداد جا رہا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتا ہوا جب یہ قافلہ بلخ سے دو منزل کی دوری تک پہنچا تو شام کا وقت قریب تھا۔ سامنے دُور

تک سرو کے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قافلے نے یہیں پڑاؤ کیا۔ خیمے نصب کیے جانے لگے۔ صوفی نے زندگی میں شاید پہلی بار قافلے کی گزرگاہ کے آس پاس حدِ نظر تک پھیلے ہوئے آبادیوں کے آثار دیکھے۔ اسی دوران کچھ فوجی اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے اور گرد و غبار اڑاتے بخ کی راہ میں گم ہو گئے۔ کہیں دور سے جانوروں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ شاید گڈریے اپنے جانوروں کو گھروں کی طرف واپس لئے جا رہے تھے۔ یہ سارے مناظر ایسے تھے جو کبھی پہلے صوفی کی نظر سے نہ گزرے تھے۔ اسی دوران جب ایک طرف سے سناٹے میں حدی کی آواز گونجی تو صوفی کے دل کی عجیب حالت ہو گئی اور اسے ذرا سی دیر کے لئے شیطان نے ورغلایا کہ ماسوا میں بڑا حسن ہے۔

جب خیمے نصب کئے جا چکے تو صوفی نے ایک بار پھر گوشہ نشینی اختیار کی۔ اس کی ماسوا سے لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ کچھ پتا نہ تھا کہ اس کے قافلے میں کتنے آدمی شامل ہیں اور ان کا کن کن پیشوں سے تعلق ہے۔ مغرب کے بعد جب اس کے خیمے میں بڑی بڑی کئی موم شمعیں روشن کی گئیں تو ان کی روشنی میں پروانوں کی طرح اس کے اردگرد کئی عقیدتمند آکر بیٹھ گئے۔ سفید کرتے، سروں پر بالوں کی ٹوپیاں، ہاتھوں میں تسبیحیں، چہروں پر مختلف قامت کی داڑھیاں۔ صوفی صاحب اپنے ارادتمندوں کو بتا رہے تھے۔

"میرے دوستو! آج میں نے بغداد کے ایک کامل صوفی کا ایک قول پڑھا ہے، اس مردِ بزرگ نے ہم طالبانِ حق کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو ابھی طلب و جستجو میں ہیں۔ دوسرے وہ جو آستانۂ الٰہی پر پہنچ کر انتظار میں کھڑے ہیں اور تیسرے وہ ہیں جو اندر داخل ہو چکے ہیں اور وہاں خدا کے سامنے حاضری کے منتظر ہیں۔ جب میں نے ان تینوں درجات میں اپنے آپ کو تلاش کیا تو پتا چلا کہ ہم ابھی پہلی ہی منزل میں ہیں۔"

اتنا کہہ کر صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ارادتمندوں نے بھی تقلید کی اور ان کی زبان سے کلمات تحسین و استعجاب نکلنے لگے۔ ان کی آوازیں اور وجد ایسے لگتے تھے جیسے وہ کوئی آسیبی خیمہ ہو۔ عین اس ذکرِ الٰہی کے درمیان صوفی کا ایک دنیادار ارادتمند ٹپک پڑا۔ اس کا نام رشید تھا۔ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ دنیاداری کی باتیں کرتا تھا۔ جبر اور زبردستی سے اگر اس کو ذکرِ الٰہی کی طرف مائل بھی کیا جاتا تھا تو اس کا مزاج انتشار اور بے دلی کا شکار ہو جاتا تھا۔ کئی بار صوفی کے جی میں آیا کہ اس کو اپنے ارادتمندوں کے حلقے سے نکال باہر کرے۔ لیکن اللہ کی ناراضگی کے ڈر سے ایسا کرنے سے باز رہا۔ مگر اس وقت رشید صوفی کے خیمے میں جس طرح داخل ہوا تھا وہ بہت تکلیف دہ اور ایمان شکن تھا۔ رشید کے پیچھے ایک خوبصورت لڑکی اپنی جملہ فتنہ سامانیوں اور زہد شکن رعنائیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی سیاہ زلفیں سرخ رومال کے باہر

نکلی ہوئی تھیں اور ہلکے گلابی لباس میں سے اس کا شباب اُبلا پڑ رہا تھا۔ صوفی سمیت اس کے ارادتمندوں کی نظریں تقریباً ایک ساتھ رشید کے بعد اس لڑکی پر پڑیں تو انہیں اپنا زہد اور ایمان خطرے میں محسوس ہونے لگا۔ ان کی نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ لیکن ان کے سینوں میں طوفان کا مدوجزر برپا تھا۔

صوفی نے اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور رشید سے سوال کیا۔ "یہ کون ہے اور تو اس کو یہاں کیوں لایا ہے؟"

رشید نے نہایت ورد مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ "جناب یہ لڑکی ایران کے کسی معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کو تین تنور راگ آتے ہیں اور اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ علم مجلسی اور بذلہ سنجی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔"

صوفی نے بات کاٹ دی۔ "لیکن اسے تم میرے پاس کیوں لاتے ہو؟"

رشید کی آنکھیں جھلا گئیں۔ "جناب پیر و مرشد! آپ ہی کی طرح میں بھی مسلمان ہوں ۔۔۔ اس کے باوجود مجھے اپنے ایرانی ہونے پر بھی فخر ہے۔ آپ ہمارے آقا ہیں لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہماری عزت و آبرو کا عربوں کے ہاتھ سودا ہوتا ہے۔"

صوفی نے اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ایک اچٹتی نظر سے لڑکی کو ایک بار پھر دیکھا۔ "میرے بچے رشید! کیا بات ہے آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

رشید کی پیشانی پر نفرت اور کراہت سے لکیریں ابھر آئی تھیں۔ کہنے لگا۔ "جناب والا! جس قافلے میں ہم شریک سفر ہیں اس میں بردہ فروش بھی موجود ہیں اور یہ لوگ ایرانی بچوں اور عورتوں کو تجارت کے مال کی طرح بغداد لئے جا رہے ہیں۔ یہ بات کم از کم میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

صوفی کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میرے عزیز! ہم سب مسلمان ہیں اور اپنے معبود حقیقی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمیں اللہ کے سوا کسی چیز کا بھی خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ یاد رکھو یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں جو کچھ آدمی بوئے گا۔ آخرت میں وہی کاٹے گا۔ ہمیں صرف اپنے اعمال پر نظر رکھنی چاہیئے۔"

لیکن رشید نے اس نصیحت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے نفرت اور بے زاری سے کہا۔ "آپ کا ارشاد بجا لیکن میں مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ غیرت مند ایرانی بھی ہوں اور میں عربوں کے ہاتھوں اپنی عورتوں اور بچوں کی بے بسی برداشت نہیں کر سکتا۔"

اسی دوران صوفی کے ارادتمندوں نے شیطان لعین سے پناہ میں رہنے کی دعاؤں کا ورد شروع کر دیا تھا۔ صوفی نے ایک اچٹتی نظر ایک بار پھر اس لڑکی پر ڈالی۔ وہ نہایت استحقار سے ان دنیا بیزاروں کو دیکھ رہی تھی۔ جب صوفی کی نظریں اس سے ٹکرائیں تو وہ مسکرا دی اور صوفی کا سارا وجود کانپ گیا۔ وہ کانپ گیا۔ اس کے

ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں رشید سے دریافت کیا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟"

رشید نے کہا "میں اس لڑکی کو بڑی مشکلوں سے نکال کر لایا ہوں۔ میں اسے پناہ دینا چاہتا ہوں۔"

صوفی نے اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا۔ "تو اپنی مرضی کا مختار ہے۔ جو جی میں آئے کر۔ جہاں بھی لے جانا چاہے چھپا دے لیکن کل سے تو میرے ارادت مندوں کے حلقے میں شرکت سے محروم رہے گا۔"

رشید کے دل پر اس فیصلے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ غیر جذباتی آواز میں بولا۔ "منظور۔ لیکن آج کی شب یہ لڑکی اسی خیمے میں رہے گی۔"

"اس خیمے میں!!" صوفی اس طرح چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں۔ اسی آپ کے خیمے میں!!" رشید نے اسی طرح ڈھٹائی سے جواب دیا۔ اب تو صوفی کی نظریں مستقلاً ہی اٹھ گئیں۔ اس کی نظریں بظاہر تو رشید پر جمی تھیں۔ لیکن دزدیدہ نگاہوں سے وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ "میرے خیمے میں کیوں؟ آخر اس کا مقصد؟"

رشید نے جواب دیا۔ "بردہ فروش اس کو تلاش کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ ہم سب کے خیموں کی تلاشیاں بھی لی جائیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پورے قافلے پر پیر و مرشد کے زہد و تقوے کا ایک خاص اثر ہے۔ وہ اس خیمے کی تلاشی ہرگز نہ لیں گے۔ کل تک کسی سواری کا انتظام کر لوں گا۔ اور رات کی تاریکی میں کسی سمت نکل جاؤں گا۔"

صوفی نے اپنے ارادت مندوں سے مشورہ طلب کیا تو ہر ایک نے اس کا فیصلہ پیر و مرشد پر ہی چھوڑ دیا۔

صوفی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ اگر اس بات کا چرچا ہو گیا تو اس کی عزت آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر اس کی عزت آبرو کسی طرح بچ بھی جائے اور رشید پکڑا جائے تب بھی ایک ارادتمند کی حیثیت سے اس کی اور اس کے دوسرے ارادتمندوں کی بڑی رسوائی ہوگی۔ ان شرمناک نتائج سے خوفزدہ ہو کر اس نے وہ فیصلہ کر دیا جو عام حالات میں کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔

لڑکی کو وہ رات صوفی کے خیمے ہی میں گزارنے کی اجازت مل گئی۔ خیمے کے اندر دوسرے کنارے پر لڑکی کے لئے بستر بچھا دیا گیا۔ جہاں وہ ایک گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر دراز ہو گئی۔ عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ صوفی نے اپنے خیمے کے دروازے پر ڈیڑھ سو ارادتمندوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ حالت رکوع اور سجود میں اسے کئی بار اس لڑکی کا خیال آیا۔ وہ تلملا تلملا گیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اسے قطعاً یقین نہ تھا کہ اس کی نماز ادا بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ اسے اس کا بڑا ملال تھا۔ لیکن وہ سر دل پر اس کا اظہار بھی نہ کر سکتا تھا۔

رات کا کھانا اس لڑکی کو تنہا کھانا پڑا۔ صوفی صاحب کو اس بات کا البتہ اطمینان تھا کہ ان کے خیمے کے ارد گرد ان کے ارادتمندوں کے خیمے نصب تھے۔ گویا وہ اس حصار میں بالکل محفوظ تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد تھوڑی دیر کے لیے انھوں نے بستر سے پیٹھ لگائی۔ اس کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور تہجد کی تیاری میں لگ گئے۔ لڑکی لیٹے لیٹے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکے سُروں میں گنگنانا شروع کر دیا۔

"اس دُنیا کی مثال تو گلاب کے اُس پودے جیسی ہے۔ جس کی نرم و نازک پنکھڑیوں میں رنگ و بُو کا طوفان چھپا ہوتا ہے۔

اور اس کے سائے میں کانٹے ہوتے ہیں

یہاں احمقوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔

ایک وہ جو صرف پھول کے رسیا ہوتے ہیں

اور دوسرے وہ جو اپنی زندگی صرف کانٹوں میں گزارتے ہیں۔

او خدا کی جستجو کرنے والے صوفی! جو ہر جگہ موجود ہو

اس کا تلاش کرنا کیا معنی؟

کیا وہ میرے نغموں اور سُریلی آواز میں موجود نہیں ہے؟

بلا وجہ اپنے گرد تعمیر کیے ہوئے حصار سے باہر نکل

خدا تو خود تیرا منتظر ہے"

صوفی کے دل و دماغ کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ اس لڑکی سے ہمکلام ہو۔ اس نے سریلے سروں میں ایسی معنی خیز باتیں سُنی تھیں جن میں تصوف کی چاشنی موجود تھی۔ اس کا دل واقعی اپنے گرد تعمیر شدہ حصار سے باہر نکلنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دبے قدموں چلتا ہوا لڑکی کے پاس پہنچا اور خوفزدہ لہجے میں پُوچھا "ابھی تو یہ کس شاعر کا کلام گنگنا رہی تھی؟" لڑکی اٹھ کر مودبانہ بیٹھ گئی۔ اس کا سُرخ رومال نیچے بستر پر پڑا تھا۔ اور سیاہ فام زُلفیں دونوں شانوں پر شانِ بے نیازی سے بکھری ہوئی تھیں۔ لڑکی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وحشت زدہ صوفی تخلیے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے استعجاب اور سوالیہ نظروں سے صوفی کو دیکھا اور پھر شان دلربایانہ سے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "پیر و مُرشد کچھ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں!"

لڑکی کی مترنم آواز اور شستہ لہجہ قیامت ڈھا گیا۔ صوفی نے خاص مشرقی پُرتکلف لہجے میں اپنا سوال دُہرایا۔ "ہاں۔ اے خدا کے حسین ترین مظہر! سچ بتا ابھی تو کس شاعر کا کلام گنگنا رہی تھی؟"

لڑکی نے سادگی سے جواب دیا "یہ میرا اپنا کلام تھا۔ میں خود بھی شاعرہ ہوں۔"
صوفی حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ نیا انکشاف اور بھی حیرت انگیز تھا۔
صوفی نے اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کیا اور بدقت تمام ایک سوال اور کیا "تجھ میں ظاہری اور باطنی کمال اس طرح موجود ہیں جس طرح گلاب کے پھول میں رنگ اور خوشبو۔ تیرا نام کیا ہے؟"
لڑکی نے اسی شستہ اور سادہ لہجے میں جواب دیا "درخشندہ!"
صوفی نے زیر لب اس کا نام ایک بار دہرایا اور اس کے بعد نیازمندانہ عرض کیا "تیرے کلام میں تصوف کا درد ہے۔ اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ تو میری پچیس سالہ عبادت ضائع کر سکتی ہے تو میں تجھ کو اپنے ارادتمندوں کے حلقے میں ضرور شامل کر لیتا۔"
اسی لمحے خیمے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ صوفی نے بدحواس ہو کر خیمے کا دروازہ کھول دیا۔ رشید چوروں کی طرح خیمے میں داخل ہو گیا۔ صوفی رشید کو دیکھ کر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ رشید نے صوفی کے مصلے کی طرف دیکھا وہ ویران اور آزردہ بزبانِ حال صوفی کا شکوہ کر رہا تھا۔
رشید نے لڑکی سے دریافت کیا "ابھی جب میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے کسی کے گنگنانے اور پھر باتیں کرنے کی آوازیں سنی تھیں۔ کیا وہ تم تھیں؟"
لڑکی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ رشید نے عجیب معنی خیز نظروں سے صوفی کو دیکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ "جناب پیر و مرشد! لوگ درخشندہ کی جستجو میں ہیں۔ براہ کرم شمعیں بجھا دیں اور گفتگو سے باز رہیں۔"
رشید چلا گیا لیکن اس بات نے صوفی کو زخمی کر دیا۔ اس وقت وہ اپنی حالت اس چور جیسی محسوس کر رہا تھا جسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔
صوفی نے لڑکی سے مزید کوئی بات کئے بغیر پھونک مار کر شمع بجھا دی اور جیسے تیسے اندھیرے میں تہجد پڑھنا شروع کر دی لیکن آج اس کا حال بہت خراب تھا۔ بار بار درخشندہ کا خیال آتا تھا اور وہ بار بار لاحول پڑھ کر اس سے پیچھا چھڑاتا تھا۔ آٹھ رکعت کے بعد وہ اپنے بستر پر چلا گیا۔ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ لیکن جب اس کی آنکھ لگی تو اسے بڑا عجیب و غریب اور دہشتناک خواب دکھائی دیا۔
اس نے دیکھا۔ جنوب سے مرد انجم کا ایک عظیم لشکر اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل اس کے قریب آ گیا تو وہ صوفی کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گیا۔ لیکن صوفی نے اسے کراہت سے ٹھکرا دیا۔ اور اس سے ہٹ کر دور چلا گیا۔ لیکن یہاں بھی صوفی کے لئے ایک نئی مصیبت پہلے سے موجود تھی۔ ایک خوبصورت

ہرن اسے پیار بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ صوفی نے ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑنا چاہا تو وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گیا صوفی اور آگے بڑھ گیا۔ ہرن اور پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں تک کہ اسی ہٹ دوڑ میں اچانک زمین کی گہرائیوں سے آفتاب نمودار ہوا اور ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ صوفی نے اوندھے منہ گر کر آفتاب کو سجدہ کیا اور سجدہ کرتے ہی ہرن کسی قدر صوفی کے قریب آ گیا۔ یہاں تک کہ صوفی نے آفتاب کے آگے سجدوں کی بھرمار کر دی۔ اور ہرن بالکل اس کی آغوش میں آ گیا۔ اس کے بعد صوفی کی آنکھ کھل گئی۔ جب اس نے اس خواب کی ممکنہ تعبیر پر غور کیا تو اسے رونا آ گیا۔ اس کا دین و ایمان سخت خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ خوب جی بھر کے رویا۔ اور رو رو کر بستر تر کر دیا۔

صوفی کا پورا دن پریشانی میں گزر گیا۔ رخشندہ ایک آزمائش تھی۔ جس نے رشید کے سوا سبھی کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت سے ارادتمند اس شجر ممنوعہ کی موجودگی کی وجہ سے سارا دن صوفی کے خیمے سے دور دور رہے لیکن جن کے ایمان کمزور تھے وہ مختلف مسئلے مسائل پوچھنے کے بہانے اندر پہنچتے۔ صوفی سے باتیں کرتے اور دزدیدہ نظروں سے رخشندہ کو دیکھ کر قلب و جگر میں ایک آگ سی لگا کر واپس آ جاتے۔ خود صوفی کے جی میں کئی بار آیا کہ رخشندہ سے بات کر کے اس کی مترنم آواز اور شستہ لہجے کا لطف اٹھایا جائے لیکن ایسا کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اسی فکر و تردد میں شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔

مغرب کے بعد رشید نے صوفی کو مطلع کیا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ رخشندہ کو لے کر قافلے سے جدا ہو جائے گا۔ صوفی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ معلوم نہیں کیوں رخشندہ کی جدائی سے پریشان تھا۔ مغرب کے بعد صوفی نے اپنے تمام ارادتمندوں کو اپنے خیمے میں آنے سے روک دیا۔ وقت تیزی سے کھسکتا جا رہا تھا لیکن صوفی میں رخشندہ سے بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کئی بار اپنی جگہ سے اٹھا چند قدم رخشندہ کی طرف بڑھا۔ رخشندہ کے سراپا پر نظر ڈالی اور ہچکچا کر رہ گیا۔ رخشندہ نے صوفی کی ذہنی کشمکش کو محسوس کر لیا اور اس سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

صوفی نے بلا کسی تمہید کے اچانک سوال کیا۔ "کیا آج تم واقعی چلی جاؤ گی؟"

رخشندہ نے بے زاری سے جواب دیا۔ "ہاں۔ کیونکہ اس ویرانے سے تنگ آ گئی ہوں۔"

"ویرانہ! کیسا ویرانہ؟" صوفی نے ہمت کر کے سوال کیا۔

رخشندہ نے جواب دیا۔ "یہاں کے لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میں ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے یا تو میں ویرانے میں پھنس گئی ہوں یا پھر گونگوں میں رہ رہی ہوں۔"

صوفی نے مسکرانے کی کوشش کی جس سے صرف باچھیں کھل کر رہ گئیں۔ "لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ تو ہمارے

درمیان موجود بھی ہے اور اپنی جنس کے شر اور فساد کو دور بھی رکھے؟"

رخشندہ کھلکھلا کر ہنس دی، کہنے لگی۔ "کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان جنس کی فطری بھوک نظر انداز کر کے یادِ الٰہی میں مشغول بھی رہے اور خواہشات نفسانیہ اس کے عمل پر چھاپا بھی نہ ماریں؟"

صوفی لاجواب ہوگیا۔ باتیں زیادہ آگے نہ بڑھیں، عشاء کے بعد رشیا آیا اور رخشندہ کو لے کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی صوفی کا برا حال ہوگیا۔ دنیا اندھیر اور زندگی بے لطف ہوگئی۔ تہجد کی نماز اس رات پڑھی ہی نہ جا سکی۔ رخشندہ کی جدائی کا ملال صرف صوفی ہی کو نہ تھا بلکہ بعض دوسرے ارادتمند بھی خاصے متاثر نظر آتے تھے رخشندہ ایک کنکری تھی جو صوفیوں کے پرسکون تالاب میں گر کر ہلچل مچا گئی تھی۔

پوری رات کرب و اذیت میں گزر گئی۔ اس رات دل جس سوز سے آشنا ہوا تھا پچیس سالہ زہد و تقویٰ کا دور اس سے قطعاً محروم رہا تھا۔ صبح جب مرغانِ سحر نے اپنی خوش الحانیوں سے رات کا سکوت توڑا تو اس وقت بھی صوفی کی آنکھیں خواب سے محروم تھیں۔ فجر کی امامت کے دوران پیچھے سے کسی مقتدی نے انہیں مطلع کیا کہ غلطی سے ایک سجدہ سہو زائد ادا ہو چکا ہے۔

جب قافلے نے یہاں سے بھی کوچ کیا اور بلخ کی آبادی میں داخل ہوگیا تو قافلے کے بہت سے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوگئے۔ تاجروں نے اپنی اشیائے تجارت بلخ کے تاجروں کے ہاتھ بیچنا شروع کر دیں۔ بردہ فروشوں نے اپنے خیمے آتش کدہ نوبہار کے سامنے نصب کر دیئے۔ چونکہ صوفیوں کی منزلِ مقصود بھی بردہ فروشوں کی طرح بغداد تھی اس لیے یہ لوگ بھی ان کے قریب ہی خیمہ زن ہوگئے۔ یہاں صوفی میں پہلی بار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے خیموں کی چھتوں کے باہر بھی دیکھنا چاہیے۔ اور اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ارادتمندوں کو ایک سبق دیا۔ "ہمیں خدا کی مخلوق اور دنیا کے مظاہر میں بھی خدا کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔"

لیکن گوشہ نشین ارادتمندوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ لوگوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ "صوفی بہک گیا ہے۔ جب سے رخشندہ گئی ہے۔ صوفی کا بھی پتا نہیں مل رہا ہے۔ صوفی اپنے مسلک سے ہٹ رہا ہے اور بے دینی اور گمراہی کی طرف جا رہا ہے۔"

ظہر اور عصر کے درمیان صوفی نے اپنا خیمہ چھوڑ دیا اور اپنے دو ارادتمندوں کے ساتھ آتش کدہ نوبہار کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر وہ ماضی میں گم ہوگیا۔ اس کے آباؤ اجداد کبھی یہاں کے موبد تھے اور انہیں اتنی عظمت و برتری حاصل تھی کہ شہنشاہ ایران کے ہاں سے آنے والے سفیر اور نمائندگانِ مملکت اس کے آباؤ اجداد کی مرضی اور اجازت کے بغیر نہ مل سکتے تھے۔ صوفی اپنی چشم تصور سے یہیں سے زردشت کی مقدس آگ کے شعلوں کو اطراف عالم میں پھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور پھر اسی عبادت گاہ میں زردشت کو قتل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔

کبھی یہاں چاروں طرف بت ہی بت ہُوا کرتے تھے جنھیں ان کے ماننے والے دیبا و حریر کے لباس پہنایا کرتے تھے۔ صوفی کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس عبادت گاہ کے آس پاس کبھی تین سو ساٹھ حجرے ہوا کرتے تھے اور جعفر کے آباؤ اجداد بھی رہائش رکھا کرتے تھے اور کبھی اس کی وہی حیثیت اور عظمت تھی جتنی آج خانۂ کعبہ کو حاصل ہے۔ وہ اپنے ارادتمندوں کے ساتھ معبدِ نوبہار کا ایک ایک گوشہ حسرت و یاس سے دیکھتا رہا جب وہ وہاں سے باہر نکلا تو اس کی نظر دروازے کی ایک عجیب عبارت پر پڑ گئی۔ یہاں بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

"بادشاہ کے دروازے تین خصلتوں کے محتاج ہیں۔ وہ تین خصلتیں ہیں عقل، صبر اور مال۔"

صوفی کی بے نیاز اور قانع طبیعت نے جوش مارا اور اس نے اس عبارت کے نیچے کوئلے سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا۔

"یہ قول غلط ہے کیونکہ جس شخص میں ان تین صفات میں سے ایک صفت بھی ہوگی۔ اس کو بادشاہ کے دروازے تک جانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے گی۔"

آتش کدۂ نوبہار کے سامنے سڑک کے اس پار چند آتش پرست اُمرا کے مکانات تھے۔ صوفی اپنے ارادتمندوں کے ساتھ جب ان مکانات کے پاس سے گزر رہا تھا تو ان میں کسی ایک مکان سے بربط کی آواز آ رہی تھی۔ صوفی کے قدم رُکنے لگے۔ اس نے سوچا۔ ممکن ہے اس آواز کے ساتھ ہی کسی لڑکی کی مترنم اور خوشگوار آواز بھی سنائی دے لیکن ایسا نہ ہوا۔ صوفی مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بازار میں ایک جگہ طرح طرح کے خوش رنگ پرندوں کو بکتے دیکھا اور طبیعت میں ایک قسم کی کراہت اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ پھر ایک جگہ اس نے بردہ فروشوں کا بازار بھی دیکھا۔ یہاں لوگ انتہائی انہماک سے حسین و جمیل اور صحت مند لڑکیوں کا مول تول کر رہے تھے۔ صوفی کے قدم رک گئے اور وہ اس ہوشربا سامان تجارت کو بغور دیکھنے لگا۔ لوگ صوفیوں کے اس پرے کو تضحیک اور استہزائی انداز میں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ذرا سی دیر کے لئے صوفی کے دل میں خیال آیا کہ اسلام میں تو لونڈیوں اور کنیزوں کے رکھنے کی اجازت ہے لیکن پھر اسی لمحے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس سے دو گھڑی کی لذت تو ضرور مل جائے گی لیکن تصوف میں جو مقام ملنے والا ہے ہرگز نہ ملے گا۔ صوفی اس صنم کدے سے بھی گزر گیا۔ آگے کپڑے والوں کی دکانیں تھیں جہاں کم قیمت اور بیش قیمت کپڑوں کے رنگ برنگے تھانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ صوفی نے انسانی آسائشات اور تفاخر کے اس سامان کو بھی دیکھا اور ان کا اپنے دل پر ذرا سا بھی اثر لئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ لیکن جب وہ ان ترغیبات اور تحریصات کی دنیا سے بچ کر اپنے خیمے میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا اور یکے بعد دیگرے ایک ایک پر غور کیا تو اسے محسوس ہوا

کہ دنیا اس کے دل میں چپکے چپکے گھر کرتی جا رہی ہے۔ آہستہ سے لاحول پڑھی اور دافعِ شیطان دعاؤں کا ورد کر کے اپنے اوپر دم کیا۔

قافلے والوں کی زبانی صوفی کے زہد و تقوے کا چرچا دور دور پہنچ چکا تھا۔ لوگوں کی کثیر جمعیتوں نے صوفی سے طرح طرح کی کرامات وابستہ کر دی تھیں۔ خراسان کے عامل نے صوفی کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجے اور درخواست کی کہ انہیں شرفِ قبولیت بخشا جائے اور عامل کے حق میں دعا کی جائے۔

صوفی نے ان تحفوں کو واپس کر دیا۔ اور اپنے خط میں اس بات کا وعدہ کیا کہ رہا دعا کا سوال تو وہ بلا اجرت کر دی جائے گی۔ خراسان کے عامل کے دل پر صوفی کی بے طمع اور بے نیاز طبیعت کا بڑا اثر ہوا اور ایک دن وہ خود صوفی کے خیمے میں حاضر ہوا اور معانقے کی سعادت حاصل کی۔ اس بار پھر خراسان کے عامل نے بہ نفسِ نفیس تحائف پیش کرنا چاہے لیکن صوفی کے استغنا نے ایک بار پھر انہیں ٹھکرا دیا۔ اس مرحلے پر صوفی کے بعض ارادتمندوں کو اس کے استغنا سے تکلیف پہنچی۔ ان کا خیال تھا کہ جب ان کے زہد و تقوے کے انعام میں خدا نے انہیں دولتِ دنیا سے نوازنا چاہا تھا تو ان کے پیر و مرشد صوفی نے کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیوں کیا۔ وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے صوفی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور کچھ کہے سنے بغیر خاموشی سے اپنی راہ لی۔ صوفی کو جب اس کا علم ہوا تو اس کو خوشی ہوئی کیونکہ اس طرح اسے ان لوگوں سے نجات مل گئی تھی جن کے خلوص میں کھوٹ تھا۔

غیر شعوری طور پر صوفی زخشندہ کے اشعار کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ واقعی خدا کے وجود کو اپنی ذات اور اپنے دل کی تنہائیوں سے نکل کر اس کے مظاہر میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسی سُریلی آوازوں کا جویا تھا جو اپنے سوز اور زیر و بم سے انسان کے قلب و جگر کو پھونک دیتی ہیں۔ وہ اس حُسن کا متلاشی تھا جو بے نقاب ہو کر عقل و خرد کا شکار کر سکتا ہے اور جس کی جدائی میں دل ایک عجیب و غریب درد اور لطیف ترین لذت سے آشنا ہوتا ہے۔ اب وہ کفر و ایمان کے اس دوراہے پر کھڑا تھا۔ جہاں کچھ پتا نہ تھا کہ کفر کدھر ہے اور ایمان کس طرف؟

ایک دن چاشت کے بعد وہ اپنے دو ارادتمندوں کے ساتھ پھر آتش کدہ نوبہار کے دروازے پر پہنچ گیا جب وہ دروازے پر کھڑا کتبے سے لکھی ہوئی اپنی عبارت پر غور کر رہا تھا تو اس نے ایک آتش پرست نوجوان لڑکی کو نوبہار کے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ سرسری نظر سے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کے خد و خال اور چہرے کی بناوٹ زخشندہ سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ صوفی چونک پڑا اور اپنے دونوں ارادتمندوں کی موجودگی کا احساس کئے بغیر وہ اس لڑکی کے پیچھے چل پڑا۔ دونوں ارادتمند حیرت زدہ رہ گئے اور وہ بھی صوفی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

لڑکی نوبہار کے اس چبوترے کے سامنے پہنچ کر دوزانو ہو گئی۔ جہاں کبھی شت آفتاب کا بُت ہُوا کرتا تھا۔ لڑکی زیرِ لب کچھ دعائیں پڑھ رہی تھی۔ اور اسے کچھ پتا نہ تھا کہ کوئی اسے حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ صوفی دنیا و مافیہا سے غافل لڑکی کو دیکھنے میں محو تھا جب وہ دُعا سے فارغ ہو کر پلٹی تو اس کی نظریں صوفی سے چار ہو گئیں۔ وہ گھبرا گئی۔ صوفی کے سینے میں ایک تیر پیوست ہو گیا۔ یہ زخشندہ سے حیرت انگیز طور پر مشابہ تھی۔ لیکن اس سے کمتر تھی۔ زخشندہ کو وہ کھو چکا تھا لیکن اسے کھونے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ چند ثانیوں میں وہ فیصلہ ہو چکا تھا جس کے جلو میں ذلت، رسوائی، پشیمانی اور گمراہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ صوفی نے تمام آداب اور تکلفات کو نظرانداز کر دیا اور پھرتی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اور نہایت اشتیاق آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "کیا تو دینِ زردشت سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے شت آفتاب کو سجدہ کر رہی تھی۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی آنکھوں کی دہشت اس کے خوف کی غماز تھی۔

اب صوفی بالکل اس کے رُوبرو پہنچ گیا اور نیا سوال کر دیا۔ "خدا تجھے ایمان کی دولت سے مالامال کرے۔ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ لوگ تجھے کیا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں؟"

اسی دوران ایک بوڑھی عورت نوبہار میں داخل ہوئی اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔ صوفی اس نقصان کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھا، ان دونوں کے ساتھ ہی وہ بھی نوبہار سے باہر نکلا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ باہر نکل کر ان دونوں نے سڑک پار کی اور زردشتی امراء کے مکانات کی طرف بڑھنے لگیں۔ کچھ دور جا کر ان دونوں نے پلٹ کر صوفی کی طرف دیکھا۔ جس سے صوفی نے یہ اندازہ لگایا کہ اس وقت لڑکی صوفی ہی کی بابت کچھ باتیں کر رہی ہے۔ صوفی کا دل اس خیال پر جذبۂ مسرت سے لبریز ہو گیا کہ اس کا ذکر صوفی سے کہیں زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس وحشی دوشیزہ کی زبان پر تو ہے۔ صوفی کے دونوں ارادتمند سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اس عجیب انقلاب کی بابت سوچنے لگے۔ جو ان دونوں کے سامنے اچانک برپا ہو چکا تھا۔

لڑکی بوڑھی عورت کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اس مکان کے سامنے ہی آتشکدۂ نوبہار کھڑا تھا۔ مکان کے باہری دروازے سے ملحق ایک چھوٹا سا سبزہ زار تھا جس پر سرو کی جاو قطاریں بیچ سے نمودار ہو کر جمع کا نشان بنا رہی تھیں۔

صوفی دیر تک اس مکان کے سامنے کھڑا رہا اس کا خیال تھا کہ لڑکی ایک بار باہر ضرور نکلے گی اور اس سے ہمکلام ہو گی لیکن اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا اور لڑکی باہر نہ نکلی۔ صوفی مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا۔

کہ لڑکی اسی بوڑھی عورت کے ساتھ باہر گئی اور ایک صنوبر کے زیر سایہ جا کر بیٹھ گئی۔ صوفی نے اپنے آپ کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ کسی طرح اس سبزہ زار تک پہنچ جائے اور لڑکی کے نام وغیرہ سے واقفیت حاصل کرے لیکن ہمت نہ پڑ سکی۔ کافی دیر بعد جب وہ وہاں سے مایوس اور شکستہ دل واپسی کے ارادے سے مڑ رہا تھا تو اس کو یہ خوشی ضرور تھی کہ کم از کم وہ لڑکی کی قیام گاہ سے تو واقف ہی ہو چکا ہے۔

جب وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو اس کے دونوں ارادتمند صوفی کے بارے میں خاصی باتیں مشہور کر چکے تھے۔ کچھ نے اس پر یقین کیا اور کچھ نے ان باتوں کو ناقابل یقین ٹھہرایا لیکن بعد میں جس بے دلی اور ذہنی خلفشار سے صوفی نے امامت کی۔ اس نے صوفی کے بھرم کو مشتبہ ضرور قرار دے دیا تھا۔ اس رات صوفی نے ساری رات جاگ کر گزار دی اور ان تدبیروں پر غور کرتا رہا کہ کس طرح اس مہ جبین لڑکی سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہو جائے لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے میں ناکام رہا۔

فجر کی نماز کے فوراً بعد صوفی نے پھر رستے یار کا رخ کیا اور لڑکی کے مکان کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا لڑکی جیسے صوفی کی پہلے ہی سے منتظر تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا تو صوفی کو لام الف کی طرح کھڑکی کے سامنے کھڑا دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور لڑکی مسکرا کر واپس چلی گئی۔ اس منظر کو ان کے ارادتمندوں نے بھی دیکھا۔ اور ان کے دل رنج اور تکلیف سے چور چور ہو گئے۔ وہ واپس آ گئے۔ اور انہوں نے اس تازہ روداد سے دوسروں کو مطلع کیا۔ بعض سادہ لوح ارادتمند حیران اور پریشان تھے کہ صوفی کو آخر یہ کیا ہو گیا ہے۔

ظہر سے کچھ دیر پہلے صوفی نے امامت کی۔ لیکن اب لوگوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی لطف نہ مل رہا تھا۔ ظہر کے بعد خیمے اکھڑنے لگے۔ اور قافلے والے روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن صوفی چادر میں منہ لپیٹ کر بستر پر پڑا رہا۔ اب وہ مزید سفر کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ جب اس نے اپنے ارادتمندوں کو اس فیصلے سے مطلع کیا کہ وہ ابھی بلخ ہی میں رہے گا تو اس نے اپنا رہا سہا اعتبار بھی کھو دیا۔ اب ارادتمندوں میں ایک سرکش جماعت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی خاصی بڑی تعداد تھی، انہوں نے اپنے ایک نمائندے کو صوفی کے پاس بھیجا کہ وہ صاف صاف بات کر کے، اس جماعت کے صوفی سے کنارہ کش ہو جانے کے فیصلے سے آگاہ کر دے نمائندے نے سوالات سے صوفی کو ہلکان کر دیا لیکن صوفی میں ریاکاری نام کو نہ تھی۔ اس کو اپنے خلاف عائد شدہ الزامات سے بالکل انکار نہ تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواب تھا، ایک ہی بات تھی اور ایک ہی کلمہ تھا۔

"خدا کی تلاش مظاہر خداوندی کے ذریعے"

سرکش جماعت نے صوفی کو گمراہ قرار دے کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب صوفی کے آس پاس صرف دس

ارادت مند رہ گئے تھے اور یہ سب اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ ہوئے تھے کہ شاید اس میں پیر و مرشد کا کوئی رمز پنہاں ہے۔ قافلہ تو سے چلا گیا لیکن صوفی کے چار خیمے اب بھی وہیں کھڑے تھے اور ان میں صوفی کے ساتھ اس کے دس ارادتمند اب بھی موجود تھے۔

تیسرے دن پہر چاشت کے بعد صوفی اپنی گمنام محبوبہ کے مکان کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اس دن لڑکی صوفی کی پہلے ہی سے منتظر تھی۔ دونوں کی نظریں جیسے ہی چار ہوئیں لڑکی نے مسکرا کر کھڑکی کو بند کر دیا۔ صوفی کی سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ اس معاملے کو آگے کس طرح بڑھایا جائے۔ وہ ابھی اسی فکر میں گم تھا کہ مکان کے سامنے سے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی بڑھیا آتی دکھائی دی۔ صوفی سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

بڑھیا نے صوفی کو ایک خط پکڑا دیا اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ صوفی نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میرا باپ فیروز تجارت کے سلسلے میں بغداد گیا ہوا ہے۔ تمہارے لباس اور وضع قطع سے میں یہی سمجھ سکی ہوں کہ تم مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ہو۔ میں زرد شت کی پیرو ہوں اور تمہاری حکومت کو اپنے جان و مال کے تحفظ کا جزیہ ادا کرتی ہوں ہر چند میں کسی غیر مرد سے باتیں نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اگر تم مجھ سے واقعی ملنا اور بات چیت کرنا چاہتے ہو تو اس بوڑھی عورت کے ساتھ میرے مکان سے ملحق سبزہ زار تک آجاؤ۔ میں تم سے چند باتیں کر کے تمہیں رخصت کر دوں گی۔"

نیچے دستخط کی جگہ لکھا تھا۔ "یہ دین اور موبدین کی ادنیٰ پرستار۔ سیماں۔"

صوفی نے خط پڑھ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سیماں کی جھلک پلک جھپکتے ہی کھڑکی کے اوٹ میں چلی گئی۔ اس نے بوڑھی عورت سے کہا۔ "تم جاؤ اور اپنی آقازادی سے کہو۔ میں اس کے مجوزہ سبزہ زار پر اس سے ملنا چاہتا ہوں اور یہ کہ میں حق کا متلاشی ہوں اور حق کے مظاہر میں اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

بوڑھی عورت جب واپس چلی تو اس کے پیچھے پیچھے صوفی بھی چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ صوفی کو سبزہ زار پر ایک سرو کی آڑ میں چھوڑ کر مکان کے اندر غائب ہو گئی اور جب دوبارہ اندر سے نمودار ہوئی تو لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ اس وقت لڑکی نے جو لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اس کے متناسب جسم پر اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ صوفی خدا کے اس مظہر میں خود ہی کہیں گم ہو گیا۔ اس نے سیماں کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ پیشوائی کے لئے کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ وہ دونوں صوفی کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے ملیں اور سیماں کے چہرے پر حیا اور شرم کی سُرخی اس طرح دوڑ گئی جیسے کسی تپتی زمین پر ہلکے ابر کا سایا۔

سیماں اپنے بالوں کی ایک لٹ دونوں ہاتھوں میں لے کر انہیں اُنگلی کے گرد لپیٹ کر چھلا بنانے لگی۔

اس کی جگہ بوڑھی عورت نے زبان کھولی۔ "میری آقازادی سیماں پوچھتی ہے کہ تم اس کا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"
صوفی سیاہ لباس کے منہ سے تقریباً دوزانو ہو گیا۔ "اے بہ دین کی ماہتاب سیماں! تجھے نہیں معلوم کہ ابھی چند دن پہلے میں نے تیری ہی جیسی صورت شکل کی ذہین ترین شاعرہ اور ماہر فن مغنیہ کو اپنی جہالت سے کھو دیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ خدا کو مظاہر خداوندی میں تلاش کرو۔ وہ اچانک چلی گئی اور اب شاید میں اسے کبھی بھی نہ پا سکوں۔ اس کے بعد جب میں نے تجھے نوبہار میں شبِ آفتاب کے بیوتہ کے سامنے جلتے ہوئے دیکھا تو تیری شکل و صورت میں رشتہ سے حیرت انگیز شباہت پائی۔ بس اسی وقت سے میں تیرا پیچھا کر رہا ہوں۔ میں ایک پاکباز انسان ہوں۔ تجھ کو دیکھ کر میرا دل ایک عجیب سی لذت اور سکون سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اس کے سوا میرا اور کوئی مقصد نہیں کہ جب تک میں بلخ میں ہوں ہر روز تیری بارگاہ میں کچھ لمحات ضرور گزارنا چاہتا ہوں۔"

اب کے دوشیزہ سیماں نے خود زبان کھولی۔ آہستہ سے بولی۔ "لیکن میں زردشت کی پیرو ہوں۔ اور تو دین محمدی کا پرستار، ہم دونوں کس طرح قریب قریب ہو سکتے ہیں؟"

صوفی کی نظر اس کو ماضی میں لے گئی۔ صوفی نے جواب دیا۔

"میرا آبائی وطن بھی بلخ ہی ہے اور میرا خاندان بھی نوبہار کے موبدین سے تعلق رکھتا تھا لیکن اب ہم مسلمان ہیں اور تو آتش پرست۔ مگر ہم دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔"

سیماں نے دوسرا اندیشہ پیش کیا۔ "پھر تو کمبل پوش صوفی ہے۔ اور میں ایک عام دنیادار۔ جب تو اپنے اس خاص حلیے میں یہاں آئے گا، تو لوگوں کی نظر میں تماشا نہیں بن جائے گا؟"

صوفی نے بلا تامل جواب دیا۔ "اگر تو مجھ کو یہاں آنے کی اجازت عطا کر دے تو میں اپنے اس حلیے کو تبدیل بھی کر سکتا ہوں۔"

اور صوفی نے اسی لمحے اپنی بالوں کی ٹوپی سر سے اتار کر سبزہ زار پر پھینک دی۔

"تمہیں اپنا یہ صوفیانہ لباس بھی اتار دینا پڑے گا۔" سیماں نے کہا۔

صوفی نے جواب دیا۔ "منظور۔"

سیماں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ "داڑھی صاف کرا دینا پڑے گی!"

صوفی تلملا گیا۔ تڑپ کر بولا۔ "او بہ دین کی شریر لڑکی! یہ تو سنت رسول ﷺ ہے۔ میں اس کو کس طرح صاف کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر مختصر کرانی پڑے گی!" سیماں نے شرط میں ذرا سی تبدیلی کر دی!

"یہ منظور!" صوفی نے جواب دیا۔

"جب تم میرے گھر آؤ گے!" سیمان کہنے لگی۔ "تو تمہیں ہمارا لباس پہننا پڑے گا۔"

صوفی نے مجبوری ظاہر کی۔ "لیکن میرے پاس تیرا لباس کہاں سے آئے گا؟"

سیمان نے جواب دیا۔ "تیرا لباس میرے گھر میں موجود ملے گا۔ جب تو آئے گا تو پہلے اپنا لباس بدلے گا۔ اس کے بعد مجھ سے ہمکلام ہوگا۔"

صوفی نے اسے بھی مان لیا۔ اور جب صوفی اپنے خیمے کی طرف واپس جا رہا تھا تو اس پر اتنا نشہ چڑھا ہوا تھا کہ پیر کہیں رکھتا تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ اس نے رخشندہ کا بدل حاصل کر لیا تھا۔ اس کے دل میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ رخشندہ کے بعد اب "سیمان" میں ایک لذت تھی۔ ایک کسک تھی۔ اور ایک چمک تھی۔ رات کو جب صوفی نے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو دیکھا تو ان کی چمک نے صوفی کے زخم خوردہ دل کو اور زیادہ زخمی کر دیا۔ ستاروں کی چمک سے محبت زدہ دل پر چوٹیں لگنے لگیں۔

صوفی کی سیمان کے گھر میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ جب وہ حسین و جمیل سیمان کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتا۔ تو یہاں اس کو مجوسیوں کا لباس موجود ملتا۔ وہ اپنے صوفیانہ لبادے کو اتار کر ایک کونے میں رکھ دیتا اور مجوسیوں کا لباس پہن لیتا۔ سیمان کی ماں مر چکی تھی۔ باپ کی عدم موجودگی میں بوڑھی عورت اس گھر کی دیکھ بھال رکھتی۔ کبھی کبھار خاندان کے بعض دور کے رشتے دار بھی پرسش حال کے لئے سیمان کے پاس چلے آتے۔ جب صوفی کی آمد و رفت کا چرچا سیمان کے خاندان میں پھیلا تو ان میں سے بعض نے سیمان کو بڑی لعنت ملامت کی اور اس کو مجبور کیا کہ وہ اس وحشی کی آمد و رفت بند کر دے لیکن سیمان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اب کسی کسی وقت کی نماز بھی قضا ہونے لگی تھی۔ صوفی کا دل ایسے موقعوں پر ملامت کرتا اور کوئی اندر بیٹھ کر سوال کرتا۔ "تو یہ کیا کر رہا ہے؟ تو کس لئے گھر سے نکلا تھا اور یہ کہاں پھنس گیا ہے؟" لیکن عقل جواب دیتی "رخشندہ صحیح کہتی ہے کہ خدا کو اس کے مظاہر میں تلاش کرو۔"

ایک دن صوفی اپنے خیمے میں بیٹھا سیمان کے پاس پہنچنے اور اس سے ہمکلام ہونے کا تصوری نقشہ کھینچنے میں یکسو تھا کہ کسی نے خیمے کا در ہلایا۔ صوفی نے چونک کر حکم دیا۔ "اندر آجاؤ۔"

جواب میں دو طالبانِ حق اندر داخل ہو گئے۔ ان کی عمریں بمشکل سترہ سترہ یا اٹھارہ اٹھارہ سال کی ہونگی۔

صوفی نے کڑک کر دریافت کیا۔ "کہو میرے بچو! کیسے آنا ہوا؟"

ایک نوجوان نے جواب دیا۔ "ہم مرو سے آپ کا نام سن کر آئے ہیں۔ ہم علم دین اور علم الٰہی آپ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

صوفی نے مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔ "میں خدا اور حسن دین کو میں پچیس سال سے پا جانے کی کوشش کر رہا ہوں مجھ کو اب تک یہ دونوں نہیں ملے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا کو مظاہر خداوندی میں تلاش کیا جائے۔ میں تم دونوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ ان جھگڑوں میں مت پڑو اور زندگی کو پر لطف بناؤ۔ شیطان بن چور دروازوں سے ہمارے نفسوں پر شب خون مارتا ہے انہیں تشنہ مت رکھو۔ نفس کو مارنے کے بجائے اس کو آسودہ کر دو۔ جاؤ عشق کرو۔ اگر عشق نہیں مل گیا تو پھر کسی دوسری چیز کی تمہیں کبھی ضرورت نہ پیش آئے گی۔"

دونوں طالبان حق واپس چلے گئے۔ انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے بعد صوفی کے بقیہ ارادتمندوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب صوفی کی گمراہی میں کسی شک اور شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس دن صوفی جب سیمان کے گھر پہنچا تو وہ بہت فکر مند اور اداس تھی۔ اس نے صوفی پر کوئی خاص توجہ نہ دی بلکہ بوڑھی عورت سے یہ کہلا دیا کہ صوفی سے کہہ دو اب وہ یہاں کا آنا جانا ایک دم موقوف کر دے۔

صوفی نے اداس ہو کر سوال کیا۔ "کیوں؟ کیا میں کسی غلطی کا مرتکب ہو گیا ہوں؟"

سیمان نے خود جواب دیا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دو دن بعد میرا باپ بغداد سے واپس آ رہا ہے اور وہ کسی مسلمان کی اپنی لڑکی سے وارفتگی ہرگز برداشت نہ کرے گا۔"

صوفی لاجواب اور بے بس ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن یہ بات تو تجھ کو اسی دن سوچنا چاہئے تھی جس دن تو نے پہلی بار مجھے اس گھر میں داخل ہونے کی اجازت عطا کی تھی۔"

سیمان نے کہا۔ "یہ بات مجھے نہیں تجھے سوچنا چاہیئے تھی کہ ایک مجوسی لڑکی کسی مسلمان کے لئے کوئی قربانی کس طرح دے سکتی ہے؟"

صوفی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی منتشر داڑھی پر گالوں سے بہتے ہوئے آنسو ڈلکے قطرات شبنم کی طرح چمکنے لگے چہرہ شدت جذبات اور اندرونی صدمات کی وجہ سے تمتا گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا مجھے ہمیشہ کے لیے تیری قربت اور ملاقات سے مایوس ہو جانا پڑے گا؟"

سیمان نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اس کا انحصار تیرے آئندہ کے فیصلے پر ہے۔ ایک مجوسی لڑکی کو ایک مجوسی ہی حاصل کر سکتا ہے۔"

صوفی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے انتہائی بلندی سے انتہائی پستی میں دھکیل دیا ہو۔ اس نے تذبذب اور فکر مند لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک گمراہ مجوسی لڑکی حجاز کے پیغمبر صادق محمدؐ کے دین میں داخل ہو کر اپنی عقبیٰ سنوار لے۔"

سیمان نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "تب پھر آج کے بعد تیرا اس گھر میں داخلہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔"

صوفی سخت ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا وہ بڑی دیر تک کسی ایسے فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا، جس میں وہ سیمان کے زیاں سے بچ جائے اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر سیمان میں ذرا سی بھی لچک پیدا ہو جائے تو یہ بحران دور ہو سکتا ہے۔

صوفی نے سیمان کو زیر دام لانا چاہا۔ "لیکن یہ بھی تو ہے کہ اگر تجھ میں ذرا سی لچک پیدا ہو جائے۔ اور تو اس محبت کی قدر کرے جو میرے دل میں تیرے لئے پیدا ہو چکی ہے تو اس نازک بحران پر آسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔"

سیمان نے جھڑک دیا۔ "کس محبت کی بات کرتے ہو؟ وہی محبت نا جو مجھ سے تو قربانی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ لیکن خود قربانی نہیں پیش کر سکتی!!"

صوفی نے دریافت کیا۔ "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟ ذرا کھل کر کہہ!"

سیمان نے جواب دیا۔ "بس اتنا کہ ایک مسلمان کے لئے میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں جس دل میں زرتشت گا ہو وہاں کسی دوسرے کا گزر ممکن نہیں۔"

صوفی نے باحسرت و یاس دریافت کیا۔ "کیا تو اس پر مجھ کو غور کرنے کا موقع دے گی؟"

سیمان نے کہا۔ "بالکل ضرور۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ اگر غور و فکر کے بعد تیرا فیصلہ میری خواہش کے مطابق ہو تو تجھے اس مکان کے دروازے کھلے ملیں گے لیکن اگر تو نے اپنا فیصلہ اور اپنی خواہش مجھ پر مسلط کرنا چاہی تو تجھے شرمندگی، خجالت اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔"

صوفی وہاں سے واپس آ گیا۔ اس کے بعد اس کی ساری نمازیں قضا ہو گئیں۔ اس کو اپنا خواب یاد آ رہا تھا۔ اس کی تعبیر حیرت انگیز طور پر سامنے آتی جا رہی تھی۔ مہ و انجم کے وہ لشکر جنہوں نے اس کو سجدے کئے تھے لیکن انہیں صوفی نے ٹھکرا دیا تھا۔ خراسان کے عامل کے وہ تحفے تحائف تھے جنہیں اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اور وہ خوبصورت ہرن سیمان تھی جس کے پکڑنے کی خواہش اس نے خواب میں کی تھی اور زمین سے نمودار ہونے والا آفتاب مجوسیت تھی جو اس کو اپنی طرف بلا رہی تھی اور خواب میں آفتاب کو سجدے ادا کئے گئے تھے۔ اس کی تعبیر زرتشت کے دین میں داخل ہو جانے کے علاوہ نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ آفتاب کو سجدے کئے بغیر سیمان کی حصولیابی ناممکن تھی۔ صوفی نے باندوہ و یاس سوچا کہ جب خدا نے یہ سب کچھ اس کا مقدر ہی کر دیا ہے تو ایک اطاعت شعار اور نیک بندے کی حیثیت سے تقدیر کے اس فیصلے کو بلا چون و چرا تسلیم

کرلینا چاہیئے۔ پچیس سالہ زہد و تقوے کی عادی زندگی سے چھٹکارا اتنا آسان بھی نہ تھا لیکن اس پلے ہوئے میں جن چیزوں سے وہ یکسر محروم رہا تھا ان کی کشش اور رغبت میں بڑی قوت تھی۔ اس نے زہد و تقوے کو شکست دے دی۔ اور صوفی شکست خوردہ سپاہی کی طرح جب سیمان کے رُو برو پہنچا تو وہ اپنی شکست کا اعتراف بھی ذرا وقار اور آن بان کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت سہ پہر کی زرد دھوپ مکان کے باہر کے سبزہ زار پر پھیلی ہوئی تھی۔ سیمان نے اجنبی کی طرح اس سبزہ زار پر صوفی کو بٹھایا کیونکہ صوفی کے فیصلے سے آگاہ ہوئے بغیر اس گھر کے دروازے نہیں کھل سکتے تھے۔

سیمان نے بے نیازی سے دریافت کیا "میں تیرا فیصلہ سننا چاہتی ہوں۔"

صوفی نے افسردگی سے کہا "اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے میں چند باتوں کی وضاحت ضرور چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے تو ان کا فراخدلی اور سچائی سے جواب دے گی۔"

سیمان نے اس کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہی ہو "پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

صوفی نے دردمندانہ آواز میں کہا "مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو میرے پچیس سالہ زہد و تقوے کا ضرور خیال کرے ۔ میں تیری خاطر یہ دین زرد دشتی مذہب اختیار کر سکتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بعد تو یا تیرے گھر کا کوئی دوسرا فرد اسلام یا پیغمبر اسلام کی شان میں غیروں کی طرح گستاخی کرے، تو اور تیرے گھر کے جملہ افراد اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں گے۔"

"اور؟" سیمان نے دریافت کیا۔

"اور یہ کہ" وہ کہنے لگا۔ "یہ دین اختیار کرنے کے بعد تو میرے لئے کیا قربانی دے گی؟"

سیمان نے دو ٹوک جواب دیا۔ "ہمیشہ تجھ سے قریب رہوں گی!"

"اور؟" صوفی نے مزید وضاحت چاہی۔

"تو اس سے زیادہ چاہتا بھی کیا ہے؟" سیمان نے جواب دیا۔

"تو اگر پسند کرے تو" صوفی کہنے لگا۔ "ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو سکتے ہیں۔"

"یہ میں اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی!" سیمان نے نرمی سے جواب دیا۔

صوفی سوچ میں پڑ گیا۔ سیمان اس سے جو کچھ وصول کرنا چاہتی تھی۔ صوفی کو اس کے بدلے میں بہت کم مل رہا تھا اور جو مل رہا تھا۔ وہ بھی مشتبہ تھا۔

صوفی نے ذرا وضاحت چاہی۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کے ہوئے بغیر ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب کس طرح رہ سکیں گے؟"

سیمان نے جواب دیا۔ "میں جہاں کہیں بھی رہوں گی تجھے اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

صوفی ہر قیمت پر سیمان کی قربت کا خواہشمند تھا لیکن اس کے دل میں چھپے ہوئے زہد و تقوے نے اس کو لعنت ملامت کی کہ تجھے تو قرب الٰہی درکار ہے اور یہ قرب تو مظاہر خداوندی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے چنانچہ ایک ایسی محبت جس کی تہہ میں سفلی خواہشات کارفرما ہوں۔ اپنی معراج کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے علاوہ اس کو یہ فکر بھی لاحق تھی کہ اگر سیمان کے لیے واقعی اسلام کو ترک اور بہ دین کو اختیار کرنا پڑا تو کیا یہ فکری و نظری گمراہی نہ ہوگی؟" لیکن عیار اور حیلہ جو عقل اور خواہشات نفسانی نے اس کو سمجھایا کہ دنیا کے تمام دین انسان کی ابدی صداقت اور عظیم روح کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ سب وسائل خداوندی کے جدا جدا طریقے متعین کرتے ہیں۔ آخر زردشت بھی تو اپنے وقت کا عظیم ترین پیغمبر تھا اور صوفی آخر کار سیمان کے لئے اسلام کو ترک اور بہ دین کو اختیار کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

اس نے اپنے فیصلے سے سیمان کو مطلع کر دیا۔ "سیمان۔ اے سرزمین ایران کے آتشیں گلاب! صرف تیری خاطر میں اسلام کو ترک اور بہ دین کو اختیار کرنے پر آمادہ ہوں۔ بول یہ رسم کب اور کہاں ادا کی جائیگی؟"

سیمان کا چہرہ فرطِ خوشی سے گلنار ہوگیا، وہ اسی وقت صوفی کے آگے خم ہوگئی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ مکان کے اندر لے گئی۔ بوڑھی عورت نے گھر کے آتش کدے کے در کھول دیئے اور سیمان صوفی کے ساتھ اس میں داخل ہوگئی۔ دونوں نے آذرخش (مقدس آگ) کو سجدہ کیا۔ صوفی میں ذرا سی ہچکچاہٹ بھی پیدا ہوئی لیکن سیمان کی حسین قربت کے سحر نے اس ہچکچاہٹ کو زائل کر دیا۔ اور وہ تادیر آذرخش کے روبرو سجدے میں پڑا آنسو بہاتا رہا۔

صوفی کا خیمہ اُجڑ گیا اور وہ مستقلاً سیمان کے ساتھ رہنے لگا۔ صوفی کے بہت سے ارادتمند ابھی بلخ ہی میں موجود تھے۔ انہیں اب بھی صوفی سے عقیدت تھی۔ لیکن ان کے دل صوفی کے عبرتناک حشر پہ رونے پر مجبور تھے۔ دوسری طرف صوفی پر سیمان کی محبت کا نشہ کچھ اتنا طاری تھا کہ اسے صبح و شام کی بھی خبر نہ تھی۔ وہ گھنٹوں سیمان کے قریب بیٹھا اس کی صورت دیکھتا رہتا کانوں میں سیمان کی مترنم آواز محبت کا رس گھولتی رہتی سیمان کو اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ایک خدا پرست مسلمان کو زردشت کے بہ دین میں داخل کر لیا ہے۔ اور صوفی سیمان کی قربت اور ساتھ حاصل کر لینے کے باوجود کچھ کمی محسوس کرتا رہتا تھا۔ وہ خدا جسے وہ مظاہر خداوندی میں تلاش کر رہا تھا۔ خواب و خیال بنتا جا رہا تھا۔ اب وہ تھا سیمان تھی۔ آذرخش کی عبادت گاہ تھی اور کسی شے کی کمی کا مستقل احساس تھا۔ کسی وقت جب اس کو اسلام کا خیال آتا تو دل سے ایک ہوک اٹھتی اور چپکے چپکے آنسو بہاتا رہتا۔ اسی دوران سیمان کا باپ بغداد سے واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔

جب یہ دونوں گھر میں داخل ہوئے تو دیر تک اجنبی کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ سیمان نے جب صوفی کا ان سے تعارف کرایا تو دونوں کچھ خوش نہ ہوئے۔ انہیں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ اسلامی مملکت میں صوفی کا ارتداد کہیں کوئی مصیبت نہ نازل کر دے۔

دوسری طرف صوفی کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنے والا نوجوان سیمان کا محبوب ہے اور ان دونوں کی عنقریب شادی ہو جائے گی تو اس کے دل کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس کو سیمان پر بہت افسوس ہوا کہ اس نے یہ بات پہلے ہی کیوں نہ بتا دی تھی۔ اب سیمان کا زیادہ وقت بھی اسی نوجوان کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ سیمان کا محبوب صوفی کو شک اور شبے کی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس اضطراب اور غیر یقینی کیفیت کو سیمان نے بھی پڑھ لیا اور وہ ایک دن غروب آفتاب کے بعد اپنے محبوب کو آذرخش کے روبرو لے گئی اور اندر سے دروازے بند کر لیے۔ یہاں وہ اپنے محبوب کے قدموں میں دو زانو ہو گئی اور نہایت جذباتی انداز میں کہا۔ "دانیال! کیا تو اس شبے میں گرفتار ہے کہ میں اس مرتد صوفی سے محبت کرنے لگی ہوں۔ زردشت کی قسم! میں تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اس دل میں تیرے سوا کسی اور کی گنجائش نہیں۔"

دانیال نے سیمان کو دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور کہنے لگا۔ "کیا یہ صوفی واقعی اتنا بے وقوف ہو سکتا ہے کہ تیرے دُور کے جلوے ہی پر قناعت کر رہا ہے؟"

"بالکل!" سیمان نے برجستہ جواب دیا۔ "یہ ہم دونوں میں عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ میں اس سادہ لوح اور بے ضرر انسان کو ہمیشہ ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تیری مرضی!" دانیال نے مایوسی سے جواب دیا۔ "لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک مسلمان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔ یہ شخص اپنی ساری خوبیوں کے باوجود مسلمان تھا۔"

اسی لمحے کسی نے معبد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دانیال نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے صوفی کھڑا تھا۔ اس نے ان دونوں سے اندر آنے کی اجازت چاہی جو اسے مل گئی۔ صوفی نے ماحول کا جائزہ لیا اور دانیال کو مخاطب کیا۔ "دانیال! میں تیری ذہنی اُلجھن سے واقف ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ تو کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر سیمان کو چھوڑ دے۔"

اتنا کہہ کر صوفی رک گیا اور اس نے ایک حسرت ناک نگاہ سیمان پر ڈالی پھر دانیال کو دیکھتا ہوا بولا۔ "مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ تیری عدم موجودگی میں اس نے تیرا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا۔ اگر مجھے ان باتوں کا پہلے ہی علم ہو گیا ہوتا تو شاید میں اتنا عظیم نقصان نہ اٹھاتا۔"

سیمان تڑپ کر بولی۔ "میں دانیال کی بابت کچھ بتانا غیر ضروری سمجھتی تھی اور اپنی جگہ یہ بات بھی شروع

سے اِس وقت تک واضح اور صاف رہی ہے کہ میں نے کبھی بھی تجھ سے محبت کا اظہار نہیں کیا اور تو بھی ہمیشہ ایک تارک الدنیا صوفی کی طرح میری قربت کا خواہاں رہا ہے۔"

"مجھے اس کا اعتراف ہے!" صوفی نے مغموم لہجے میں کہا۔ "ظالم نفس نے مجھ کو قدم قدم پر دھوکے دیئے ہیں۔ پہلے میں غلطی اور نادانی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تیری ذات اور حسن سے متعلق میری خواہشات محض قربت کی حد تک محدود رہیں گی۔ لیکن بعد میں جلد ہی یہ تجربہ ہوا کہ خواہشات کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ جب مجھے سیمان کی قربت میسر آگئی تو اس کو مستقل اپنا لینے کی خواہش نے جنم لیا۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی لیکن جب تو اس کے محبوب کی حیثیت سے اچانک نمودار ہوا تو میرے دل میں خود بخود آتش حسد اور آتش رقابت شعلہ زن ہو گئی۔ اب میں اپنے نفس کو لاکھ قابو میں رکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ برابر سرکشی پر مائل رہتا ہے۔"

دونوں نہایت انہماک سے صوفی کی تقریر سن رہے تھے۔ صوفی کہتا رہا۔ "میں نے سیمان کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اتنی بڑی قربانیاں کہ اس سے بڑی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان قربانیوں کے معاوضے میں مجھے ملا کچھ بھی نہیں۔"

پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیمان سے جدا ہو جانے کے بعد میں زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکوں گا۔ لیکن مجھے جدا پھر بھی ہونا پڑے گا۔ میں عنقریب بلخ چھوڑ دوں گا۔ میرے ارادتمند میرے اس حشر پر آنسو بہا رہے ہیں اور میں اپنے ارتداد پہ رونے پر مجبور ہوں۔ کل قیامت میں میں کس طرح اپنے رسولؐ کو منہ دکھاؤں گا مجھے یہی غم کھائے جا رہا ہے۔"

اس کے بعد صوفی زار و قطار رونے لگا۔ سیمان نے پوچھا "کیا یہاں سے چلے جانے کے بعد تو پھر دین اسلام اختیار کرے گا؟ یہ دین ترک کر دے گا؟"

صوفی نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کل کیا ہو گا؟"

اس کے بعد صوفی وہاں سے نکل گیا۔ سیمان اور دانیال ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

دانیال کو سیمان کا یہ کھیل کچھ پسند نہ آیا۔ اس کے گداز دل کو صوفی کی المناک کیفیت اور پر سوز مکالمات نے ہلا ڈالا۔ اس نے پوری رات کروٹیں بدل کر کاٹ دی۔ دوسری طرف سیمان بھی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کے لئے صوفی نے جتنی بڑی قربانی دی تھی وہ ایسی نہ تھی کہ اسے بآسانی نظرانداز کر دیا جاتا۔ اس نے صوفی اور دانیال کو ذہنی اور جذبات کے معیار پر خوب اچھی طرح جانچا تو قربانی اور ایثار کے معاملے میں دانیال صوفی کا پاسنگ بھی نہ نکلا۔ اس کی پسند اور انتخاب ہچکولوں کا شکار ہو گئی اور ان ہچکولوں میں صوفی

کی طرف کچھ جھکاؤ آنے لگا تھا۔ ساری رات سیمان عجیب بے خوابی کا شکار رہی، رات کے پچھلے پہر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں اسے دانیال سے ایک بار تنہائی میں مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔

صبح جب وہ دانیال کے کمرے میں پہنچی تو وہ خالی تھا اور بستر پر دانیال کی جگہ ایک خط رکھا ہوا تھا۔ سیمان نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے خط اٹھالیا اور پڑھنے لگی!

"سیمان! افسوس کہ میں تجھے پیار اور محبت کے القاب نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ میرا ضمیر اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ تو نے صوفی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور افسوس کہ زردشت کے ایک حقیر پرستار کی حیثیت سے میں تیری اس زیادتی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں تجھ سے اس وقت تک جدا رہوں گا جب تک کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ تو نے میری جگہ مستقلاً صوفی کو نہیں دے دی ہے۔ صوفی کی عظیم الشان قربانی کا اس کے سوا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ تو اس کو مستقلاً اپنا لے۔ جب تو صوفی سے وابستہ ہو جائے گی تو میں تجھ سے مل کر درخواست کروں گا کہ تو نے جو مقام صوفی کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ مجھے عطا کر دے۔"

سیمان کا دل بھر آیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اسی لمحے سیمان کا باپ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیمان کو روتا دیکھ کر حیرت اور پریشانی سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سیمان سے اس کے رونے کا سبب پوچھے اس نے حوصلے سے کام لے کر دانیال کا خط باپ کی طرف بڑھا دیا۔ اسے سیمان کی اس کشمکش کا دراصل علم نہ تھا۔ خط پڑھ کر وہ بھی بے چین ہو گیا۔ لیکن اس نے نہایت صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنی پدرانہ شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ "مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کس نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان واقعات کے طشت از بام ہو جانے پر دنیا کیا کہے گی۔ میں تو صرف تیری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ تو کیا چاہتی ہے؟ دانیال کو یا صوفی کو؟ اگر تو دانیال کی جدائی سے افسردہ ہے تو میں اس کو ہر طرح اور دنیا کے کسی بھی گوشے سے تیرے لئے تلاش کر کے لا سکتا ہوں۔ لیکن اگر تو دین فراموش صوفی کی طرف مائل ہے تو میں تیری خاطر اس کو بھی گوارا کر لوں گا۔"

اس کے بعد وہ سیمان کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کو اپنی بیٹی کے جواب کا انتظار تھا۔ سیمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "مجھے سوچنے کا موقع دو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اور اسے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ جب اس کے دل کا بوجھ کسی قدر کم ہوا اور طبیعت ٹھہری تو اس کی خودداری صوفی کے لئے کسی حد تک رخصت ہو چکی تھی۔ معبد کی ملاقات کے بعد کچھ پتہ نہ تھا کہ صوفی کس حال میں ہے۔ اور کیا سوچ رہا ہے۔ سیمان آہستہ آہستہ دبے قدموں اور افسردہ انداز میں صوفی کے کمرے میں پہنچی تو صوفی اپنے

بستر پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ سیمان کے قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ صوفی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور زیادہ رونے کی وجہ سے دونوں پپوٹے سوج گئے تھے۔ سیمان اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ صوفی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیمان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنی گفتگو کا آغاز کس طرح کرے۔ کافی سوچ بچار کے بعد بھی اس نے سیدھا سادا انداز اختیار کیا۔ اس نے دانیال کا خط صوفی کی طرف بڑھا دیا۔ صوفی جیسے جیسے خط کی عبارت پڑھتا جاتا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا۔ جب وہ خط پڑھ چکا تو سیمان نے اس کی رائے معلوم کرنا چاہی۔ "اب تیری کیا رائے ہے؟"

صوفی نے آنکھیں بند کر لیں اور انتہائی تیرے کہا۔ "تو اپنے باپ سے دانیال کو تلاش کرا۔ اور اب میرا خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

سیمان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے صوفی کی بات کا یقین نہ آیا۔

صوفی نے اپنی بات کی مزید وضاحت کر دی۔ "سیمان! جو کچھ ہوا اس میں ہم دونوں بے قصور ہیں۔ مشیت نے ازل ہی سے ہماری قسمتوں میں یہ لکھ دیا تھا۔ جب مجھے دانیال اور تیری نسبت کا پہلی بار علم ہوا تھا۔ اور تو نے مجھے بالکل مایوس کر دیا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں تیرے بغیر زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اس وقت میرے دل میں بیک وقت دو صدمے جاگزیں ہو چکے تھے ایک تو یہ کہ میں نے اسلام ترک کر دیا اور دوسرا یہ کہ ترک اسلام کے بعد بھی میں تیری حصولیابی میں ناکام رہا۔ ابھی ابھی جب تو آئی تھی تو تو نے محسوس کیا ہوگا کہ میں رو رہا تھا لیکن یہ رونا تیرے لئے ہرگز نہ تھا۔ یہ رونا اپنی بدقسمتی کا تھا کہ وہ کون سی بدبختی تھی جس نے مجھ سے اسلام کا دامن چھڑوا دیا تھا اور میں آفتاب پرستوں کے زمرے میں داخل ہو گیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے وہ بستر پر گر گیا اور سیمان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ "تو دانیال کو شوق سے اپنا سکتی ہے کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرا دل دانیال کی حق تلفی اور اسلام سے روگردانی پر مزید آمادہ نہیں ہے۔"

سیمان اپنی بے عزتی برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ضبط سے کام لیا۔ اور یہ کہتی ہوئی وہاں سے نکل گئی کہ "تو اپنے اس فیصلے پر ایک دن اور غور کر لے۔ میرے مستقبل کا فیصلہ تیرے کل کے جواب پر منحصر ہوگا۔"

لیکن صوفی کے ارتداد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ خراسان کے عامل نے خلیفہ ہارون الرشید کو اس سے مطلع کیا۔ ہارون الرشید نے حکم دیا کہ مرتد صوفی کو ایک منٹ ضائع کئے بغیر فوراً پابجولاں حاضر کیا جائے۔ صوفی گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیا گیا۔ جہاں اس کو خلیفہ سے اپنے ارتداد کی سزا ملنے والی تھی رات بھر صوفی خدا سے توبہ واستغفار کرتا رہا۔ خدا سے زیادہ وہ اپنے رسولؐ سے شرمندگی اور ندامت

محسوس کر رہا تھا۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ پاپیادہ مدینہ منورہ کا رُخ کرتا اور اپنی زندگی وہیں گزار دیتا۔ اس دوران جب بھی سیمان کی یاد آتی وہ زبردستی اپنی فکر اور طبیعت کسی اور خیال کی طرف راغب کر لیتا۔

یہ لوگ باب خراسان سے بغداد کے اندر داخل ہو گئے۔ اسی دروازے کے ایک حصے میں بیٹھ کر عباسی خلیفہ منصور شہر کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ شہر کے اندر سڑکوں، کوچوں، بازاروں اور نہروں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ سڑکوں کے کنارے خوبصورت بازار اور ایوانات بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ رصافہ کے بازاروں سے گزرتے ہوئے جب العطاریہ کے سامنے سے گزرے تو مختلف النوع پھولوں اور عطریات کی خوشبو نے انہیں از خود رفتہ کر دیا۔ یہاں سے گزر کر یہ ہارون رشید کے قصر الذہب کے سامنے پہنچے تو صوفی کو حراست میں لانے والوں کی ذمہ داری چند دوسروں نے سنبھال لی اور صوفی کو ایک رات کے لئے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

دوسرے روز پہر دن چڑھے صوفی کو ہارون رشید کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ ہارون کے تخت کے دونوں جانب دو سیاہ چھتر تھے جنہیں غلام نیزوں کی چھڑوں پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ہارون رشید سیاہ حریر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ کاندھے پر سبز چادر نبوی پڑی تھی۔ ہاتھ میں عصائے خلافت تھا اور انگلی میں مہر خلافت، عام درباری بھی سیاہ لباس میں تھے۔ تخت کے دائیں بائیں ایرانی رومی اور حبشی غلام زریں وردیاں پہنے ایستادہ تھے۔ خلیفہ کے سرہانے خواجہ سراؤں اور جلادوں کا سردار مسرور ایک بھاری گرز لئے کھڑا تھا۔ اس کا سیاہ لباس چہرے اور جسم کی سیاہ رنگت کی وجہ سے حد درجہ خوفناک ہو گیا تھا۔ تخت کے سامنے زریں مسندیں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر خاندان کے بڑے بوڑھے اور شاہزادے جلوہ افروز تھے۔ امرائے برامکہ اور آل مطلب صف بستہ کھڑے تھے، لیکن تخت کے دائیں جانب یحییٰ برمکی اتالیق ہارون رشید اور بائیں جانب جعفر برمکی وزیراعظم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ صوفی اس شان اور دبدبے اور جاہ و جلال کو دیکھ کر سہم گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ آج وہ قتل سے بچ نہیں سکتا۔ دربار والوں کے لئے مرتد صوفی کے مقدمے میں دلچسپی کا بہت سامان موجود تھا۔ اور یوں بھی یہ مقدمہ عجیب و غریب نوعیت کا تھا۔

صوفی کو ہارون رشید کے مقابل ذرا فاصلے پرلے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ہارون نے گردن اٹھائی۔ اور سوال کیا۔ "خدا تجھے دولت ایمان اور نور اسلام سے دوبارہ سرفراز فرمائے کیا یہ صحیح ہے کہ تو نے ارتداد کے جرم کا ارتکاب کیا ہے؟"

ذرا سی دیر کے لیے صوفی سہم گیا۔ پھر بولا "ہاں یہ درست ہے لیکن اب میں مسلمان ہوں اور اگر امیر المومنین میری جاں بخشی فرمائیں گے تو میں اس کا کفارہ ضرور ادا کروں گا۔"

ہارون رشید نے دریافت کیا۔ "تو نے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب آخر کس طرح کیا؟ اس کی وضاحت کر۔"

صوفی نے پوری رُوداد سنادی اور آخر میں بولا "مجھے میرے نفس اور زخرد نے دھوکا دیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس گمراہی میں زیادہ دن مبتلا نہیں رہا۔"

صوفی کی رُوداد میں رخشندہ اور سیمان کا ذکر بھی آیا تھا۔ ہارون رشید نے کہا۔ "میرے چچا کے بیٹے اور افضل الکائنات رسُولؐ نے کسی ایسے تصوّف کا کبھی بھی ذکر نہیں کیا۔ سرکش نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نفسانی خواہشات کی تسکین کا دیانت دارانہ ذریعہ تلاش کیا جائے۔ واللہ اگر کسی نے اس کے برعکس کیا تو اس کا بھی تیرا ہی جیسا حشر ہوگا۔"

پھر ذرا سے تامّل کے بعد ہارون رشید نے دریافت کیا "کیا تو سچ مچ اپنے ارتداد سے تائب ہو چکا ہے اور دوبارہ پھر اسلام کی آغوش میں واپس آچکا ہے؟"

صوفی نے مختصر جواب دیا "امیر المومنین کو اس پر یقین کرنا چاہیئے۔"

ہارون رشید نے مسکرا کر جعفر برمکی کو دیکھا پھر صوفی سے سوال کیا۔

"لیکن تو نے تو اپنی زندگی کے پچیس سال زہد و تقوے میں گزار دیئے تھے۔ پھر یہ یکایک اتنا بڑا انقلاب کیونکر آگیا؟"

صوفی نے دل برداشتہ ہو کر جواب دیا "امیر المومنین! ساری تفصیلات میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، میرے معبود نے یہ سب کچھ روزِ ازل سے ہی میری تقدیر میں لکھ دیا تھا اور رویائے صادقہ میں اس کی خبر بھی دے دی تھی۔ پھر میں اس سے کیونکر بچ سکتا تھا امیر المومنین؟"

ہارون نے اہلِ دربار سے مخاطب ہو کر کہا "یہ صوفی جبریہ معلوم ہوتا ہے اور اپنے تئیں تقدیر کے ہاتھوں مجبور اور بے بس یقین کرتا ہے۔"

صوفی نے اسی شان بے نیازی اور دلیری سے جواب دیا "امیر المومنین! ہم سب مجبور ہیں۔ میں رخشندہ اور سیمان کے زہد شکن حسن اور رعنائی کا شکار ہو گیا تھا اور امیر المومنین سینکڑوں حرم اور کنیزوں کے دامِ حسن کے اسیر ہیں۔ یہ ہم دونوں کی مجبوری نہیں تو اور کیا ہے؟"

پورے دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔ یحییٰ اور جعفر اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جلادِ اعظم مسرور دو قدم آگے بڑھا اور ہارون رشید کی جنبشِ ابرو کا انتظار کرنے لگا۔ دربار کے دوسرے لوگ

حیرت اور خوف زدہ نظروں سے صوفی کو گھورنے لگے۔
غیر متوقع طور پر ہارون رشید نے دربار کو اچانک برخاست کر دیا۔ اور صوفی کے نگران افراد کو حکم دیا کہ وہ تا حکم ثانی یہیں اسی جگہ موجود رہیں۔ مسرور، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی بھی چلے گئے۔ ہارون رشید خود بھی قصر الذہب میں کسی طرف گم ہو گیا۔
کافی دیر بعد ایک خواجہ سرا اندر سے نمودار ہوا اور صوفی کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ صوفی کے نگراں واپس چلے گئے۔ صوفی محل کے پُر پیچ راستوں سے گزرتا ہوا اپنی دانست میں موت کی جستجو کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہال میں پہنچ گیا۔ یہ ہال انتہائی خوبصورت اور نرم و نازک اشیائے آرائش اور سامانِ تعیش سے آراستہ تھا۔ آس پاس قصر کے اندر لے جانے والے دروازوں پر نہایت نرم و نازک رنگین ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ صوفی کو یہاں ایک مرصع اور مزین تخت پر بٹھا دیا گیا۔ قصر کے اندر سے ایک مانوس آواز لحن اور سُر کے ساتھ صوفی کے کانوں کی راہ سے ہوتی اور بہاتی ہوئی دل میں اترتی چلی گئی۔

"اس دُنیا کی مثال تو گلاب کے اس پودے جیسی ہے۔
جس کی نرم و نازک پنکھڑیوں میں رنگ و بو کا طوفان چھپا ہوتا ہے۔
اور اس کے سائے میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔
یہاں احمقوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔
ایک وہ جو صرف پھول کے رسیا ہوتے ہیں
دوسرے وہ جو اپنی زندگی صرف کانٹوں میں گزارتے ہیں
او خدا کی جستجو کرنے والے صوفی! جو ہر جگہ موجود ہو
اس کو تلاش کرنا کیا معنی؟
کیا وہ میرے نغموں اور سریلی آواز میں موجود نہیں ہے؟
بلا وجہ اپنے گرد تعمیر کئے ہوئے حصار سے باہر نکل
خدا تو تیرا خود منتظر ہے۔"

ایک بار پھر صوفی کی کائنات دل میں زلزلہ آ گیا۔ یہ تو رخشندہ کی آواز تھی، وہ مضطرب اور بے قرار نظروں سے ادھر ادھر رخشندہ کو تلاش کرنے لگا۔ قصر کے ایک دروازے سے ہارون رشید اس طرح نمودار ہوا کہ اس کے پیچھے پیچھے رخشندہ تھی۔ صوفی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
ہارون رشید نے رخشندہ کو صوفی کی طرف چلے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "صوفی! تو نے ٹھیک

ہی کہا تھا کہ ہم دونوں ہی مجبور ہیں اور ابھی رخشندہ نے بھی ہم دونوں کو احمق قرار دینے میں حق و صداقت کا اظہار کیا ہے۔ ہم دونوں ہی احمق بھی ہیں۔ ایک نے اس حماقت کا اظہار تارک الدنیا بن کر کیا ہے اور دوسرے نے اپنی حماقت کا اظہار دنیا پر بُری طرح مر مٹنے کی صورت میں کیا ہے۔ صوفی! لے جا اسے۔ یہ تیری صاف گوئی اور جرأت مندی کا انعام ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تک یہ میری کنیز تھی لیکن اب یہ تیری رفیق ہے!"

صوفی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ رخشندہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر مسکرا رہی تھی۔ ہارون نے مزید کہا۔ "تیرے بقول یہی تو وہ تھی جس نے سیمان میں مشابہت اختیار کر کے تجھے ارتداد پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ تیری سپر ہے اب شیطان تجھ پر غلبہ نہ پا سکے گا۔ جا اور دین کے معاملے میں میانہ روی اختیار کر۔"

صوفی رخشندہ کو لے کر باہر آگیا قصر سے باہر نکلنے میں جو لوگ ان دونوں کی رہنمائی کر رہے تھے انہوں نے صوفی کو بتایا کہ امیر المومنین نے ان دونوں کی رہائش کے لئے باب خراسان کی راہ میں دجلہ کے کنارے ایک مکان بھی مرحمت فرمایا ہے۔ یہ دونوں اس مکان میں فروکش ہوگئے۔ چشم زدن میں ضروریات زندگی بھی فراہم ہوگئیں۔

اب صوفی کو ہر طرح طمانیت حاصل ہو چکی تھی۔ یہاں رخشندہ نے رشید کی بابت بتایا کہ خراسان کے عامل نے رشید کو خلافت کی امانت پر ہاتھ صاف کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا تھا۔ رخشندہ خلافت کی امانت تھی لیکن اب وہ امانت نفس کی سپر کے طور پر صوفی کے حوالے کی جا چکی تھی۔

سیمان اور دانیال کا کیا حشر ہوا؟ صوفی کو کچھ پتا نہ تھا لیکن جب دانیال اور صوفی کی طرف سے یکے بعد دیگرے سیمان کی خودداری اور جذبۂ محبت کو ٹھیس لگی اور صوفی بھی اس سے جدا ہو گیا تو اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ دانیال کو تلاش کرتے اور دانیال خود سے پھر کبھی واپس نہ آیا۔

اسکندریہ کی دوشیزہ

حسن؟ ایک طاقت ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قسمت بھی اس کا ساتھ دے۔ ایک ایسی دوشیزہ کی کہانی جسے قسمت اور وقت ہمیشہ بلندی سے پستی اور پستی سے بلندی کی طرف اچھالتے رہے وہ وقت کے قدموں میں گیند کی طرح پڑی رہی اور اسے ٹھوکریں لگتی رہیں۔

فاطمین مصر کی محلاتی سازشوں کی دلکش تصویر اور خلافت فاطمیہ کے زوال کی عبرت ناک داستان

مصر کے خلفائے بنو فاطمہ کے آخری نوجوان حکمران العاضد نے جب یہ محسوس کیا کہ مصری بساطِ سیاست کے سب سے بڑے شاطر شاور نے اپنے جملہ حریفوں کو شکست دے دی ہے تو اس کے لئے اب اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی کہ بجبر و کراہ شاور کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے بدرجہ مجبوری قلمدانِ وزارت شاور کے سپرد کر دیا اور خود قصرِ خلافت کی عظیم الشان چہار دیواری میں قیدیوں جیسی زندگی گزارنے لگا۔

شاور ملکی اور سیاسی میدان میں نٹوں جیسے کرتبوں کا ماہر تھا۔ جس طرح ایک نٹ پتلی رسی پر خلاء میں کھڑے ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی طرح شاور بھی مصری سیاست کی بال سے زیادہ باریک پل صراط سے پار اترنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اسے یہ کام بہت اچھا آتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ جب عیسائی افواج اسکندریہ سے ہوتی ہوئی قاہرہ کی طرف بڑھیں تو خلافت عباسیہ بغداد کے نمائندے نورالدین زنگی سے دوستانہ امداد طلب کر لی جائے۔ اور جب نورالدین زنگی کی فوج قاہرہ کا رخ کرے تو اسکندریہ میں فرنگش عیسائیوں کی اعانت حاصل کر لی جائے۔ حالانکہ شاور کو مصر کی وزارتِ عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچانے میں نورالدین زنگی کا بہت بڑا دخل تھا۔

شاور کی بے چین اور عیار طبیعت وزیراعظم بن جانے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوئی۔ کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ قاہرہ کی محلسرائے خلافت سازشوں اور جوڑ توڑ کی آماجگاہ ہے۔ اور کسی بھی ذہین وزیراعظم کے لئے ضروری تھا کہ وہ سراپردہ خلافت کی ایک ایک حرکت اور ذرا ذرا سی جنبش سے باخبر اور آگاہ ہوتا

لیے۔ بہت زیادہ غور و فکر کے بعد آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی طرح چند خوبصورت اور ذہین ترین کنیزیں کرگندم گوں نوجوان فاطمی خلیفہ العاضد کی خدمت میں بطور تحفہ بھیج دیا جائے اور ان کے ذریعہ محلسرا کی سازشوں اور منصوبوں کی نگرانی کی جائے۔ چنانچہ دس منتخب حسین ترین کنیزیں پچاس ہزار اشرفیوں کے ساتھ بطور نذرانہ العاضد کی خدمت میں روانہ کر دی گئیں۔ ان میں یونانی حسن بھی تھا اور ایرانی بھی لیکن ان سب میں اسکندریہ کی نومسلم جیلیا بے مثل تھی۔ اٹھارہ سالہ شوخ و شریر اور ذہین ترین یہ لڑکی جب اپنے ریشمی جالی کے کرتے، کلابتوں کے کام کی صدری اور بڑے پائنچوں کے پاجامے میں ملبوس ایک انداز دلربائی سے شاور کے سامنے لائی گئی تو تھوڑی دیر کے لئے شاور کے مکار دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور یہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جانے والا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کئی گھنٹے صرف یہ فیصلہ کرنے میں ضائع کر دیئے کہ جیلیا کو اپنے لئے مخصوص کرے یا پھر منصوبے کے مطابق محلسرا میں پہنچا کر العاضد کی نگرانی کی جائے اور بالآخر دل کو شکست ہوئی اور دماغ کامیاب ہوا۔

شاور نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ جیلیا کے کاندھے پر رکھ دیا اور جذباتی لہجے میں کہنے لگا۔ "جیلیا! تیرا صحیح مقام قصر خلافت نہیں میرا گھر ہے۔ بخدا! میں تجھے پسند کرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو اس پر مجبور پاتا ہوں کہ تجھے بیمار اور احمق العاضد کے حوالے کر دوں، چند گھنٹوں بعد تو محلسرائے خلافت میں ہوگی۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے تجھ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تو میرے منصوبے کا ایک ضروری کردار ہے۔ جب تو اندر پہنچ جائے تو تیری پوری پوری یہ کوشش ہوگی کہ تو اپنے بے مثال حسن اور ناز و ادا سے العاضد کے دل کو فتح کرے اور جب تو یہ کام کر چکے تو پھر تیرا دوسرا کام یہ ہوگا کہ محلسرا کے اندر کی واقعات کی تفصیلی روداد وقتاً فوقتاً مجھے بھیجتی رہے۔ محلسرا کا نگراں خواجہ سرا موتمن الدولہ اس کام میں تیرا مددگار اور ہمراز ہوگا۔"

جیلیا نے احتراماً سر جھکا دیا لیکن کنکھیوں سے مکار شاور کو دیکھتی رہی، آہستہ سے بولی۔ "میں کوشش کروں گی کہ خلافت فاطمیہ کے روح رواں اور اصل حکمراں کو مایوسی کا شکار نہ ہونا پڑے۔"

اسی قسم کی باتیں بقیہ نو کنیزوں سے بھی کی گئی تھیں لیکن جیلیا کے سوا کنیزوں کو آخر میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے بھی العاضد پر شاور کے منصوبے کا اظہار کر دیا تو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔

سائے کے پیروں تلے آنے میں ابھی دیر تھی کہ قصر خلافت کا حبشی النسل خواجہ سرا موتمن الدولہ العاضد کے نمائندے کی حیثیت سے شاور کے پاس پہنچ گیا۔ شاور نے دس کنیزیں اور پچاس ہزار اشرفیاں اس کے حوالے کر دیں۔ موتمن الدولہ کے ساتھی خواجہ سراؤں نے اشرفیوں کے خوان اپنے سروں پر رکھے ان کے

039
HARDAYAL PUBLIC LIBRARY, DELHI
Acc. No. 16177 — 1982

خوان پوش بھی بہت قیمتی تھے۔ ان ارغوانی کپڑوں کی زمین پر بناوٹ میں اونٹوں پر حملہ آور شیروں کی تصویریں بنائی گئی تھیں اور ان کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

"بالآخر فاطمی شیر اپنے دشمنوں کو ان اونٹوں کی طرح ہلاک کر دے گا۔"

جب جیلیا موتمن الدولہ کے ساتھ جانے ہی والی تھی کہ شاور کو اچانک العاضد کے خاص طبیب مشیر اور اتالیق تقی کا خیال آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ نوعمر فاطمی خلیفہ العاضد کے دل و دماغ پر اس پینسٹھ سالہ بوڑھے کی غیر معمولی گرفت ہے۔ اس نے جیلیا کو سرگوشی میں سمجھایا

"اور ہاں دیکھنا میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ نادان العاضد پر اس کے طبیب اور اتالیق تقی کا غیر معمولی اثر ہے۔ تجھ کو اس سے بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اور ہاں یاد رکھ۔ تو میرا اعتماد ہے۔"

جیلیا جواب میں اس طرح مسکرادی جیسے کہہ رہی ہو۔ "او بوڑھے! میں تجھ سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ اپنی ٹیں بند کر اور سارے معاملات میری ذمہ داری پر چھوڑ دے۔ جیسا مناسب سمجھوں گی، کروں گی۔"

شاور نے اپنا نذرانہ قصر خلافت تک پہنچایا اور خود ایک دوسرے دروازے سے بہ نفس نفیس العاضد کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

نوعمر العاضد جس تخت پر دراز تھا اس کے آس پاس حسین اور نوخیز کنیزیں ہلکے سروں والے آلات موسیقی سے اس کا دل بہلا رہی تھیں، آخری فاطمی حکمران کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے گندمی رنگ پر مستقل علالت نے زردی کی ہلکی سی تہہ جما دی تھی۔ قصر کی دیواریں شجر پردوں میں گم ہو گئی تھیں۔ ان پردوں پر مختلف جانوروں اور پرندوں کی تصویریں زردوزی سے بنائی گئی تھیں، کھڑکیوں اور دروازوں پر خس کے دبیز پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ان پردوں کے پیچھے پانی کا چھڑکاؤ کرنے والے خدام نہایت مستعدی سے اپنی خدمت انجام دے رہے تھے جب باہر کی گرم ہوائیں ان بھیگے پردوں سے ٹکراتیں تو کمرے کی فضا نہایت لطیف خنکی میں ڈوب جاتی۔ پردوں کا پانی ابھی ٹھیک سے خشک بھی نہ ہونے پاتا کہ ان پر پانی کا چھڑکاؤ شروع ہو جاتا۔

مگر ان العاضد کی نظریں نوجوانی کی آرزوؤں اور خواہشوں سے لبریز ان فتنہ سامان اور ہوشربا گلنے والیوں کے گداز اور معصیت ترغیب جسموں پر پڑتیں اور جم کر رہ جاتیں۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور عین اس وقت جبکہ اس کی طبیعت کسی عملی اقدام پر مائل ہوتی۔ اس کے کانوں میں طبیب تقی کی آواز گونجنے لگتی۔ "شہزادے! تم اپنے لئے نہیں فاطمی خلافت کی بقا کے لئے زندہ رہو اور اسی

زندگی کے لئے ضروری ہے کہ تم ان دلفریب لیکن تباہ کن پری پیکروں سے خود کو محفوظ رکھو۔
وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ ان میں کتنی ہی ایسی تھیں جو العاضد پر نہایت ہنرمندی سے کنڈیں پھینکتیں لیکن العاضد ان کے پھندے میں نہ آتا۔ اسی حال نما کمرے اور حسن اور شباب سے آراستہ تخلیے میں جب اس کو یہ خبر ملی کہ شاور کے نذرانے میں پچاس ہزار اشرفیوں کے علاوہ دس نہایت حسین و جمیل کنیزیں بھی آرہی ہیں تو وہ کسی قدر پریشان ہوگیا لیکن اس کے باوجود اس نے اشرفیوں کو خلافت کے خزانہ عامرہ میں اور کنیزوں کو اپنی خلوت گاہ میں لائے جانے کے احکام صادر کر دیئے۔ العاضد کو کسی کنیز نے پہلے ہی سے یہ بھی بتلا دیا تھا کہ ان نوواردوں میں جلیبا نامی قتالہ عالم بھی ہے۔ اور اس نے دبی زبان میں شوخی سے یہ کہنے کی جسارت بھی کی تھی کہ "اب دیکھوں گی کہ امیر المومنین کس طرح شکار ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔"

موتمن الدولہ ان کنیزوں کو العاضد کی خلوت گاہ میں چھوڑ کر الٹے پاؤں واپس چلا گیا، ان کنیزوں نے العاضد کے روبرو ضرورت سے زیادہ جھک کر سلام کیا اور وہ اس وقت تک برابر جھکی رہیں جب تک العاضد نے انہیں سیدھے ہو جانے کا حکم دے دیا۔ العاضد کی نظروں نے جلیبا کو پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اس کچے حالی کے کرتے سے اس کا شباب اُبلا پڑ رہا تھا۔ جلیبا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتنی خفیف تھی کہ اسے نوجوان لیکن تشنہ نظریں ہی محسوس کر سکتی تھیں۔

العاضد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور گاؤ تکیے سے لگ کر ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اطلاع ملی' امیر المومنین کا اتالیق' طبیب اور مشیر پینسٹھ سالہ بوڑھا تقی فوری ملاقات کا متمنی ہے۔ العاضد نے بجبر و کراہ اسے بلا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک دبلا پتلا الجھی داڑھی والا بوڑھا اندر داخل ہوگیا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا چہرے سے بلا کی ذکاوت اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ العاضد نے اپنے پھیلائے ہوئے پیر احتراماً سکیڑ لئے اور مودب ہوگیا

بوڑھے تقی نے ایک سرسری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا لیکن جب جلیبا پر نظر پڑی تو کچھ پریشان ہو گیا پھر کچھ تامل کے بعد العاضد کو مخاطب کیا۔ "شہزادے! اس وقت میں نہ تو تیرا مشیر ہوں اور نہ اتالیق اس وقت میں صرف تیرا طبیب ہوں اور یہ کہنے آیا ہوں کہ تجھے ایسے عطیات اور نذرانے ہرگز قبول نہ کرنے چاہئیں۔ جن سے فاطمی خلافت کے ستون کو دیمک چاٹ جائے، شہزادے! تو فاطمی خلافت کا آخری چراغ ہے۔ جسے بیماریوں کے تند و تیز جھونکے جھلائے دے رہے ہیں۔ عباسی خلافت جو تیری سب سے بڑی حریف اور رقیب ہے۔ اس چراغ کے بجھ جانے کی منتظر ہے۔ اسکندریہ کی راہ سے داخل ہونے والی مسیحی قوتیں الگ کسی بُری گھڑی کا انتظار کر رہی ہیں۔"

العاضد نے دزدیدہ نظروں سے تقی کو دیکھا اور گردن جھکا لی۔" اور رقص اور موسیقی کی بابت کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

بوڑھے تقی نے دلیری سے جواب دیا۔" رقص اور موسیقی روح کی غذا ہیں لیکن یہ دونوں گناہ کے بغیر بھی ہیں۔" کنیزیں تقی کی باتوں سے اندر ہی اندر کھول رہی تھیں اور جیلیا کا تو مارے غصے کے بہت بُرا حال تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت اس بوڑھے کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دے۔ اس کو اپنی ذات اور حسن پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر یہ خبطی بوڑھا درمیان میں حائل نہ ہو تو وہ العاضد کو بڑی آسانی سے اپنا شکار بنا سکتی ہے۔ اور نہایت اطمینان سے قصرِ خلافت پر قبضہ کر سکتی ہے۔ اس کو العاضد پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا نوجوان ہے جو ایک ٹھنڈے مزاج بوڑھے کی نصیحتوں کو اتنے انہماک اور سعادت مندی سے سُن رہا ہے۔ اس نے غیر معمولی جراٴت کا مظاہرہ کیا۔ العاضد کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ایک سوال تھا۔ اجازت طلبی تھی۔ کچھ کہنے کی خواہش کا اظہار تھا۔

العاضد نے دریافت کیا۔" کیا تو کچھ کہنا چاہتی ہے؟"

جیلیا نے جواب دیا۔" ہاں، لیکن امیر المومنین سے نہیں، امیر المومنین کی جاں بخشی اور اجازت کے بعد اس بوڑھے کی لن ترانیوں کا جواب ضرور دینا چاہتی ہوں۔"

بوڑھا تقی جیلیا کی طرف گھوم گیا۔ العاضد نے آنکھ کے اشارے سے جیلیا کو بولنے کی اجازت دے دی۔ اس نے بوڑھے تقی سے دریافت کیا۔" کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ اپنی عمر کے کس دَور سے تُو نے اپنی یہ بزرگانہ وضع قطع اختیار کر رکھی ہے؟"

تقی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔" تیرے اس سوال کا مقصد؟"

" مقصد میں بعد میں بتاؤں گی۔" جیلیا نے جواب دیا۔

العاضد نے جیلیا کو جھڑک دیا۔" اے لڑکی! یہ شخص میرا استاد ہے اس سے ادب و احترام سے بات کر۔ کیا تُو نے اس پر غور نہیں کیا کہ میں نے اس کے آتے ہی اپنے دونوں پیر سمیٹ لیے تھے!"

جیلیا نے آزردگی سے جواب دیا۔" بجا ارشاد امیر المومنین! لیکن اس بوڑھے کو بھی ہماری اس طرح اہانت نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے جو کچھ سمجھانا ہے امیر المومنین کو تخلیے میں سمجھائے۔ میں اپنی بے عزتی نہیں برداشت کر سکتی۔"

العاضد کا جیلیا کی جراٴت اور بے باکی نے دل موہ لیا اور وہ جیلیا کی اداؤں اس کی تمکنت اور اس کے پُر وقار انداز سے بہت متاثر ہوا۔ اسے دیکھ کر العاضد کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ایسی چمک جس میں جیلیا کے لئے

اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو وہ جیلیا کے معاملے میں بوڑھے اتالیق کی ایک بات بھی نہ مانے گا لیکن سر دست یہ طے کیا کہ جیلیا کی ذات سے اپنے انس اور لگاؤ کو راز ہی میں رکھا جائے۔

دوسری طرف جیلیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی مخمور آنکھوں میں بوڑھے کے لئے شدید نفرت موجود تھی۔ اس نے بوڑھے کو اشتعال کی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو "بوڑھے تو نے مجھے نہیں دیکھا مجھے سرکشوں کو شرمندہ کرنا آتا ہے۔"

العاضد کی کئی راتیں اس کشمکش میں گزر گئیں کہ وہ جیلیا کو تخلئیے میں بلائے یا نہ بلائے۔ پہلے تو اس نے یہ سوچا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے اتالیق اور طبیب تقی کو لاعلم رکھ کر جیلیا کی زلفوں کے سائے میں کچھ وقت گزار لیا کرے گا لیکن بعد میں اس کے ضمیر نے سخت ملامت کی کہ تو فاطمہؓ سے نسبی تعلق رکھتا ہے۔ ایک فاطمی کو یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ایسی حالت میں جبکہ اس کی زندگی پر موت سایہ فگن تھی اور کچھ پتا نہ تھا کہ کب کیا ہو جائے نامۂ اعمال گناہوں سے پاک رہے۔ ان حالات اور اس کشمکش میں وہ جیلیا کو اپنی خلوت گاہ میں بلانے کی ہمت نہ کر سکا۔ دوسری طرف جیلیا کو یہ یقین تھا کہ العاضد اس کا شکار ہو چکا ہے اور کسی بھی لمحے اس کا بلاوا آنے ہی والا ہے لیکن جب کئی دن گزر گئے اور العاضد کی خاموشی برقرار رہی تو وہ ذرا بے چین ہو گئی۔ اسی عالم میں اسے موتمن الدولہ کے ذریعے شادر کا ایک مختصر پیغام ملا۔ یہ قرطاس کا ایک چھوٹا سا پرزہ تھا جس پر تحریر یہ تھا۔

"امیرالمومنین العاضد خلافت عباسیہ کے بارے میں آج کل کیا رائے رکھتے ہیں اور آج کل ان کے مزاج میں کون لوگ زیادہ دخیل ہیں؟"

جیلیا نے جواب میں لکھ دیا "ابھی میں امیرالمومنین العاضد سے دور رہوں۔ یہاں بوڑھے اتالیق تقی کی حکومت ہے جو ابھی بڑھاپے کے زیر اثر ہے۔ وہ بوڑھا بڑا سرکش ہے۔"

لیکن عجیب اتفاق کی بات تھی کہ اس کے فوراً بعد العاضد نے جیلیا کو بلایا۔ جیلیا نے جانے میں تامل اختیار کیا۔ اور ایسے زیورات اور لباس زیب تن کئے جو العاضد کے بیمار اور نصیحت زدہ دل کو ایک ہی وار میں بے کار کر دیں۔ وہ اپنے حسن کی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں پہنچی۔

العاضد اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ محل کی فضا نغموں اور ساز کی سریلی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ العاضد نے تین کنیزوں کے سوا سب کو رخصت کر دیا۔ یہ تینوں کنیزیں راگ اور موسیقی میں بے مثل تھیں۔ العاضد کے کھڑے ہوتے ہی سازوں کی آواز تیز ہو گئی۔ العاضد دو قدم آگے بڑھا اور فرط محبت میں جیلیا کے ہاتھ پکڑنے چاہے لیکن جیلیا اس سے پہلے ہی العاضد کے احترام میں کچھ خم ہو چکی تھی۔

العاضد نے لرزتے ہاتھ سے جیلیا کی زلفیں چھو لیں اور آہستہ سے بولا۔ "تجھے آئندہ خلافت کے احترام سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے!"

جیلیا سیدھی ہو گئی اور شرمائی شرمائی لیکن شوخ اور متبسم نظروں سے العاضد کو دیکھا اور نگاہیں ہٹا لیں۔ العاضد نے ہمت کر کے اس کا بایاں ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اپنے مرصع تخت کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

"اے شوخ و شریر لڑکی! تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟"

جیلیا نے زمانہ سازی سے جواب دیا۔ "میں جو کچھ سمجھتی ہوں اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں!"

العاضد نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا اور ایک نیا سوال کر دیا۔ "تیرا کیا خیال ہے؟ کیا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں؟"

"نہیں میں ایسا نہیں سوچ سکتی!" جیلیا نے جواب دیا۔ "لیکن یہ خیال البتہ ہے کہ امیر المومنین اس کنیز پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور یہی میرے لئے باعث فخر ہے۔"

العاضد کی آواز اچانک تیز ہو گئی اور وہ پُر وقار لہجے میں بولا۔ "لڑکی! میں فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں بدعہدی یا دھوکہ دہی سے کام نہیں لے سکتا اور آج میری یہ بات غیر مبہم اور واضح آواز میں سن لے کہ میں تجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے اتالیق اور طبیب تقی کے زیر اثر ہوں۔ میں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ میں کسی لڑکی سے عشق نہ کروں گا۔ اس وعدے کو انشاء اللہ تازیست نباہوں گا۔ ہر چند کہ تیرا یہ گداز اور ریشمی جسم میرے وعدے کو متزلزل کرتا رہے گا۔"

جیلیا کی امیدوں پر بجلی گر گئی۔ وہ العاضد کو کوئی بھڑکتا ہوا چبھتا ہوا جواب دے سکتی تھی لیکن وہ سردست ایسا نہ کر سکتی تھی۔ وہ کسی موقعے کی منتظر تھی۔

العاضد نے ذرا صاف گوئی اور راست بیانی سے کام لیا۔ آہستہ سے کہا۔ "لیکن مجھے جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ مجھے حقیقتہً تجھ سے محبت ہو گئی ہے اور میں تجھے چاہتا ہوں لیکن تجھے اس کا پتا تک نہ ہو گا۔"

جیلیا پھر خوش ہو گئی۔ اس کے انگ انگ میں خوشی اور کیف کی لہریں دوڑنے لگیں لیکن یہ خوشی اور یہ کیف عارضی ثابت ہوا۔ العاضد نے جیلیا کو تنبیہہ کی۔ "لیکن میں اپنے بوڑھے اتالیق اور طبیب کی ہدایات اور مشوروں کے خلاف بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا احترام کرتا ہوں اور تجھے بھی اس کا احترام کرنا چاہیئے۔"

یہ کہتے کہتے العاضد نے افسردگی سے گردن جھکا لی۔ لیکن جیلیا کے سینے میں تقی کے خلاف

آگ لگ گئی۔ اسے یہ ملال کم تھا کہ العاضد اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اس کو غصہ تو اس پر آرہا تھا کہ بڈھا نقی درمیان میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ وہ اپنی تذلیل اور اہانت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ تاہم اپنے دلی جذبات کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا۔ تبسم بکھیرتی ہوئی بولی "میں امیرالمومنین کے اتالیق کی تعظیم اور احترام کی بہرحال پابند ہوں۔"

العاضد نے جیلیا کو شانے سے لگالیا اور اس کی زلفوں پر اپنے چہرے کو رکھ دیا۔ سازوں کی آواز تیز ہونے لگی۔ انہی آوازوں میں جیلیا کی سسکیوں کی آواز ابھری۔ وہ رو رہی تھی۔ العاضد نے بے چینی سے اپنا چہرہ اٹھا لیا اور ٹھوڑی کو انگلیوں سے اٹھا کر دیکھا تو دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

"تو کیوں رو رہی ہے؟" العاضد نے بے چینی سے دریافت کیا۔

جیلیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سسکیوں میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔

"تو بولتی کیوں نہیں؟" العاضد نے اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میری کس بات نے تجھ کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا ہے؟ کچھ بتلاؤ تو سہی!"

جیلیا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "امیرالمومنین کو غالباً اس بات کا علم ہوگا کہ میں اسکندریہ کے ایک غریب اور گمنام خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"ہاں مجھے تیری بابت بھی کچھ بتایا گیا ہے!" العاضد نے رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نصرانی ہے۔ تیرے آباؤ اجداد نصاریٰ تھے۔"

جیلیا نے بدستور رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "امیرالمومنین کی اطلاعات حرف بحرف درست ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ امیرالمومنین مجھے اسکندریہ واپس جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔"

العاضد نے اس کے رخساروں سے ہاتھ ہٹا لیا۔ "کیوں؟ کیا اس حسین دلکش اور وسیع قصر کی روح پرور فضائیں تجھے پسند نہیں آئیں؟"

جیلیا نے آزردگی سے جواب دیا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے امیرالمومنین! مجھ جیسی غریب اور آوارہ وطن لڑکی اس حسین اور جنت نشان قصر کا کبھی تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ لیکن مجھے اپنی قسمت پر کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا کہ اس نے مشرق کے ایک عظیم تاجدار کے دل کو مسخر تو کر لیا لیکن یہ میری بدنصیبی کہ یہ تاجدار اپنے نوجوان دل سے زیادہ اپنے بوڑھے اتالیق کی مرضی کا تابع ہے۔ ان حالات میں قصرِ خلافت کی ہر حسین شے میرے لئے اپنی دلکشی کھو چکی ہے۔ یہ جگہ میرے لئے جہنم بن گئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کا کوئی شخص بھی جہنم میں اپنی خوشی اور مرضی سے رہنا کبھی بھی پسند نہ کرے گا۔"

العاضد کے پائے استقامت میں لرزش پیدا ہو گئی۔ جیلیا کے مقابلے میں اتالیق تھی فضول گو ناصح درچرب زبان واعظ نظر آنے لگا۔ اس نے فرط محبت میں جیلیا کی زلفوں کا بوسہ لیا اور سرگوشی میں کہا۔ "تجھے اسکندریہ واپس جانے کی ضرورت نہیں، تو یہیں رہ اسی قصر خلافت میں، وقت کی منتظر رہ ممکن ہے یہ جہنم جنت میں تبدیل ہو جائے۔"

جیلیا کے چہرے پر شادابی آ گئی، العاضد مفتوح ہو رہا تھا۔

"اچھا!" العاضد کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "میں نے جو ارادہ کیا تھا اور تجھ سے جو کہنا چاہتا تھا وہ میں نہیں کہہ سکا۔ اور اگر تیری شیریں بیانی کا یہی عالم رہا تو شاید میں کبھی بھی تجھ سے وہ باتیں نہ کر سکوں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے لائق صد احترام اتالیق کو شکست دینے پر تل گئی ہے خیر مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے۔"

شادر کو جیلیا کی طرف سے چند سطری خفیہ پیغام پہنچ گیا "مزاج خلافت میں حسب خواہش تبدیلی آ چکی ہے۔ امید ہے کہ دوسرے وار میں رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔"

دو دن اور تین راتیں گزر گئیں لیکن العاضد نے جیلیا کو نہیں بلایا۔ اسے شبہ گزرا کہ کہیں متلون مزاج اور ناپختہ کار العاضد بوڑھے اتالیق کے وعظ و نصائح کا پھر شکار تو نہیں ہو گیا۔ لیکن رات کے پچھلے پہر کسی نے اس کے در پر دستک دی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے خواب کا شبہ گزرا لیکن اسی لمحے پھر دستک کی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ پنجوں کے بل دروازے کی طرف بڑھی اسے یقین تھا کہ یہ ضرور کوئی خواجہ سرا ہے جو رات کی تاریکی اور سناٹے میں شادر کا کوئی خفیہ پیغام لے کر آیا ہے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے پوچھا "کون؟"

دوسری طرف سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔ "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

یہ العاضد کی آواز تھی جس میں ارتعاش بھی تھا اور محبت کی بے تکلفی بھی۔ جیلیا کو ایک نئی بات سوجھی ایک نئی تجویز۔ ایک نئی ترکیب جس کے نتائج بڑے دور رس نکلے۔ وہ ایکدم مغموم اور اداس ہو گئی چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کر لیے جو کسی شدید بیماری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس نے چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ العاضد اندر داخل ہو گیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

العاضد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بوسہ دیتا ہوا بولا۔ "قبل اس کے کہ تو اس وقت میرے چوروں کی طرح آنے کا سبب معلوم کرے میں خود ہی سب کچھ بتا دوں گا۔"

جیلیا نے کسی اندرونی کرب کا تاثر کراہتے ہوئے لہجے سے ظاہر کیا۔ "امیر المومنین تشریف رکھیں۔"

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا، یہ خواب ہے یا حقیقت۔"

العاضد جلیلہ کے ساتھ اس کی مسہری پر بیٹھ گیا۔ اس نے جلیلا کو غائر نظروں سے دیکھا۔ "بڈھے تقی کی نصیحتیں تو اب نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مجھ سے غیر معمولی کدورت ہوگئی ہے۔ وہ دن سے برابر یہی سمجھا رہا ہے کہ امیر المومنین ابھی نوجوان ہیں۔ خلافت کا بوجھ اتنا بھاری ہے کہ اس میں تیری جیسی ہوش رُبا دوشیزاؤں کا دُور رہنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خلافت کی ذمہ داریوں کے علاوہ میری مستقل علالت بھی تیری متحمل نہیں ہوسکتی۔"

وہ اچانک چپ ہوگیا اور جلیلا کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ کر چہرہ اپنے منہ کی طرف کر لیا۔ "مجھے اس بوڑھے سے نفرت سی ہوچکی ہے لیکن پھر بھی وہ میرا اتالیق اور طبیب ہے۔ اس کے مشورے نہایت قیمتی ہوتے ہیں مگر تیری بابت اس کے مشورے ایک بوڑھے اور مایوس دل کے حسد کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتے۔"

جلیلا نے کراہتے ہوئے کہا۔ "لائق صد احترام اتالیق کی بابت میں کیا کہہ سکتی ہوں!"

العاضد نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تو کراہ کیوں رہی ہے؟"

جلیلا نے مجبوروں کی طرح عرض کیا۔ "میں دو دن سے بیمار ہوں!"

"لیکن تو نے مجھے مطلع کیوں نہیں کیا؟" العاضد نے بے قراری سے کہا۔

جلیلا نے جواب دیا۔ "اس دوران مجھے امیر المومنین کی خدمت میں باریابی کا موقع ہی کہاں ملا؟"

العاضد نے اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ "اس کے باوجود تو مجھے مطلع کرسکتی تھی؟"

جلیلا سمٹ گئی اور شرم و حیا کی تصویر بن کر عرض کیا۔ "لیکن کسی کے ذریعے اپنی علالت کی اطلاع دینے میں مجھے اپنی کمتر حیثیت کا احساس اور امیر المومنین کی عظمت اور برتری کا پاس مانع رہا۔ میں اپنا حال زبانی ہی عرض کرنا چاہتی تھی۔"

العاضد نے کہا۔ "اگر تو کہے تو میں اسی وقت تقی کو طلب کرسکتا ہوں!"

جلیلا نے جواب دیا۔ "نہیں میں ایسا نہیں چاہتی۔ لیکن اگر یہاں سے جانے کے بعد صبح تک امیر المومنین کو اس کنیز کی علالت اور تکلیف کا خیال رہے تو طبیب کو ضرور بھیج دیں لیکن میں اپنا علاج آپ کے بوڑھے طبیب ہی سے کرانا چاہتی ہوں۔"

العاضد نے کہا۔ "بوڑھا تقی صبح تیرے پاس آجائے گا تو مطمئن رہ۔"

جلیلا اپنے مقصد اور اداکاری میں کامیاب ہوچکی تھی۔ اب اس نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا۔

کہنے لگی۔

"امیرالمومنین اس ناخوشگوار موضوع سے گریز فرمائیں، میں وہی سب کچھ سننا چاہتی ہوں جس کا امیرالمومنین ابھی اظہار فرما رہے تھے۔"

العاضد نے محبت سے اس کے سر کو ہلا دیا "شریر لڑکی۔ میں تجھے آدابِ خلافت سے پہلے ہی مستثنیٰ قرار دے چکا ہوں۔ یہ تو بار بار امیرالمومنین امیرالمومنین کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہے۔"

جیلیا نے آنکھیں بند کرلیں قدرے بے تکلفی سے بولی "میں فوراً امیرالمومنین کے ارشاد پر عمل نہیں کرسکتی۔"

العاضد کے دل میں بہت ارمان تھے۔ خواہشیں تھیں کہ جملہ بندشیں توڑ کر آزادی کی طالب تھیں، دل تھا کہ جنون کا متقاضی تھا۔ نفس تھا کہ آزادی اور بے راہ روی چاہتا تھا لیکن ان سب کو ایک ہی احساس نے مغلوب کرلیا تھا۔ "وہ فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھتا تھا" اور نسب نامے کی عظمت نے ان وسوسات شیطانیہ کو شکست دے دی۔ العاضد جیلیا کو چھوڑ کر اچانک کھڑا ہوگیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

جیلیا اس اچانک تبدیلی پر حیران رہ گئی۔ وہ سمجھی شاید بوڑھے اتالیق کی نصیحتوں کے سانپ بچھو العاضد کی بے باکیوں اور جرأت مندیوں کو اب بھی ڈس رہے ہیں، وہ بے بس سوالیہ لیکن ترغیب آمیز نظروں سے العاضد کو دیکھنے لگی۔

العاضد نے شکست خوردہ آدمی کی طرح جیلیا کو دیکھا اور گھٹے گھٹے لہجے میں بولا "جیلیا! میں فاطمیؓ ہوں۔ میرے نسب نامے کی برتری میرے حساس دل کے لئے سوہان روح بن گئی ہے۔ میرے آباؤ اجداد مجھ سے زیادہ بااختیار تھے۔ انہیں اختیارات بھی ملے تھے اور قدرت کی طرف سے صحت و توانائی بھی، لیکن میں ان دونوں نعمتوں سے محروم ہوں ———————————— مجھے خلافت ملی ہے لیکن اس خلافت پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ اس پر میرے عیار اور شاطر وزیر شاور کا قبضہ ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ میں جو چاہتا ہوں نہیں کرسکتا اور جیلیا حد تو یہ ہے کہ اس کی سازشوں کا جال قصر خلافت کی پرپیچ راہوں تک میں بچھ چکا ہے۔ میرے گرد و پیش جو لوگ ہیں مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کتنے شاور کے جاسوس ہیں اور کتنے میرے مخلص ہیں، حد تو یہ ہے کہ شاور نے محلسرا کے بعض خواجہ سراؤں تک کو خرید لیا ہے۔"

جیلیا کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی اسے یقین ہوگیا کہ العاضد نے اسے پہچان لیا ہے اور یہ اشارے استعاروں میں مرکزی کردار اسی کی ذات ہے لیکن اس نے اپنی اندرونی دہشت اور سراسیمگی کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا بلکہ یہ سب کچھ اس طرح سنا جیسے کوئی عجیب و غریب انکشاف ہو رہا ہو۔

العاضد کہتا رہا۔ "میں بڑے فرق کی اسی لئے بے حد عزت کرتا ہوں کہ وہ مخلص اور میرا ہمدرد ہے میں آج کل بہت پریشان ہوں، کچھ ایسے ملکی مسائل درپیش ہیں کہ میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوں۔ تقی جو مشورے دیتا ہے وہ ہمدردانہ مخلصانہ اور صائب معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی مجھے کچھ اور مشورے درکار ہیں!

پھر اچانک سوال کیا۔ "کیا ملکی امور سے تجھے بھی کبھی دلچسپی رہی ہے؟"

جیلیا نے جواب دیا۔ "مجھے دلچسپی تو دنیا کے ہر معاملے میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں کسی معاملے میں کتنا درک اور شعور رکھتی ہوں اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔"

العاضد نے کہا۔ "اچھا تیرے درک اور شعور کا ابھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں درپیش مسئلہ تیرے سامنے رکھتا ہوں۔ بتا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

جیلیا اس کی صورت دیکھنے لگی۔ العاضد نے مسئلے کی تفصیلات اس کے سامنے رکھ دیں۔

"کچھ برس پہلے میں نے حملہ آور مسیحی افواج کے مقابلے میں بغداد کی عباسی خلافت سے مدد مانگی تھی عباسی خلافت شاور کے حیلہ و مکر سے بہت دل برداشتہ تھی۔ بہرحال اس نے اپنی امداد و اعانت کے لئے جو شرائط پیش کی تھیں ان میں دو شرطیں بہت سخت تھیں۔ ایک تو یہ کہ فاطمی خلافت کا ایک تہائی حصہ عباسی خلافت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ دوسری یہ کہ فاطمی افواج عباسی افواج کے سپہ سالار اسدالدین شیرکوہ کی ماتحتی میں دے دی جائیں گی۔ اور ہماری چھاؤنیوں پر عباسی جنرل کا قبضہ رہے گا۔ اسدالدین شیر کوہ اپنی افواج کے ساتھ یہاں آچکا ہے اور اس نے قاہرہ کو محاصرے میں لینے والی مسیحی افواج کو فرار ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب معاہدے کی جملہ شرائط پر عمل درآمد کا وقت آچکا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔"

جیلیا نے پوچھا۔ "امیرالمومنین کے اتالیق کی کیا رائے ہے؟"

العاضد نے جواب دیا۔ "معاہدے کی شرائط کو دیانت داری سے پورا کر دینا چاہیئے۔"

"اور امیرالمومنین کے وزیر شاور کی کیا رائے ہے؟" جیلیا نے پوچھا۔

العاضد نے بیزاری سے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ فی الحال ٹال مٹول سے کام لیا جائے اور اس معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ یا تو کسی سازش کے ذریعے اسدالدین شیرکوہ کو ہلاک کر دیا جائے یا پھر مسیحی حکومتوں سے ساز باز کر کے ان کی افواج کی مدد سے اسدالدین شیرکوہ کو جبراً قاہرہ سے نکال دیا جائے۔"

جیلیا خوش تھی کہ بڑے کام کی باتیں اس کے علم میں آرہی تھیں۔

اس نے دریافت کیا۔ "اور خود امیرالمومنین کی کیا رائے ہے؟"

العاضد نے کہا: "میں فاطمی ہوں مجھے معاہدہ شکنی نہیں کرنی چاہیے۔"

جیلیا نے جواب دیا: "امیر المومنین کا منصب یہی کہتا ہے کہ معاہدہ شکنی نہیں ہونی چاہیے۔"

العاضد خوش ہوگیا: "تو صحیح کہتی ہے۔ تیرے دل میں ایمان کی روشنی اور حق وراستی موجود ہے لیکن مکار شاور کی شرارتوں کا کیا کیا جائے؟"

جیلیا نے کہا: "اس کے لئے امیر المومنین بھی غور فرمائیں۔ میں بھی سوچوں گی اور اتالیق تقی کو بھی غور کرنا چاہیے۔"

العاضد واپس جاتا ہوا بولا۔ "میں تیرے پاس سے اطمینان لے کر جارہا ہوں۔ تو عقل صائب رکھتی ہے میرا بوجھ ہلکا ہو چکا ہے۔ صبح تیرے علاج کے لئے بوڑھا طبیب آجائے گا۔"

العاضد کے چلے جانے کے بعد وہ کسی اور فکر میں ڈوب گئی۔ اس کی دوررس نظریں صاف دیکھ رہی تھیں کہ شاور کی مکاریاں زیادہ دن نہیں چلیں گی۔ وہ وزیر ہے اور ایک ایسا وزیر جس کو نہ تو العاضد پسند کرتا ہے اور نہ عباسی خلافت کا جنرل اسدالدین شیرکوہ جیلیا کے اندازے کے مطابق شاور کو یا تو قتل ہو جانا چاہیے یا پھر اپنے عہدے سے معزول ہو جانا چاہیے۔ اس نے سوچا ایسے ناقابل اعتبار شخص کے لیے خطرناک خدمات انجام دینا عقلمندی نہیں ہے۔ دوسری طرف سادہ لوح اور صاحب کردار العاضد تھا جس کے اختیارات اور اقتدار خاندانی تھے۔ انہیں شاور چھین نہ سکتا تھا۔ اور آخر کار اس کی جاہ پسند فطرت اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ شاور سے کسی طرح خوبصورتی سے پیچھا چھڑا کر، العاضد کو اپنا لینا چاہیے۔ لیکن یہاں بوڑھا اتالیق سانپ بنا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے اس سانپ کو کچل دینا چاہیے اس کے بعد جب راستہ صاف ہو جائے گا تو وہ العاضد کی سب سے زیادہ بااختیار محبوبہ یا ملکہ بن کر فاطمی خلافت پر حاوی آجائے گی۔

اس نے شاور کو ایک مختصر سا پیغام بھیج دیا۔

"بوڑھا اتالیق سانپ بنا ہوا ہے۔ امید ہے کہ عنقریب اس کے زہر کو زائل کر دیا جائے گا۔"

صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد طبیب تقی جیلیا کے پاس پہنچ گیا جیلیا اس کی منتظر تھی۔ ایک خطرناک منصوبہ زیر عمل تھا۔ اس نے ایسے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے جن میں بھرپور شباب کی زہر شکن قوت کارفرما تھی اور وہ سج دھج کر اس آگ کی مانند ہوگئی جس میں کہنہ سالی کے بھرم اور احتیاط پسندی کو آسانی خاکستر کیا جاسکتا تھا گلے کے منقش اور خوبصورت گلو بند سے پھسلتی ہوئی بوڑھے کی نظر جس جگہ پہنچ کر خود بخود ٹھہر گئی۔ وہاں ہوش وحواس صبر و پندار اور حزم واحتیاط کو چشم زدن میں پگھلا دینے والا آتش فشاں گویا اس کا پہلے سے منتظر تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے بوڑھا طبیب یہ فراموش کر بیٹھا کہ وہ یہاں

کس لئے آیا ہے وہ جیلیا کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بوڑھے دل میں ہلچل مچ گئی جیلیا اپنے حسب دل خواہ نتائج سے بشاشش اور مطمئن تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

جیلیا نے عزت واحترام سے بوڑھے تقی کو بٹھایا۔ بوڑھے نے نہایت ملائمت اور محبت سے دریافت کیا "تجھے کیا تکلیف ہے اور کب سے لاحق ہے؟"

اور تھوڑی دیر تک بیماری سے لاپرواہی اور غفلت کے سنگین نتائج پر تقریر کرتا رہا اور آخر میں کہا "اگر تو امیر المومنین کے بجائے براہ راست بھی مجھے اپنی علالت سے مطلع کر دیتی تب بھی کوئی ہرج نہ تھا۔ میں فوراً حاضر ہو جاتا۔"

جیلیا نے بناوٹی لگاوٹ سے کہا۔ "میں براہ راست بھی آپ کو بلا سکتی تھی لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ امیرالمومنین کے دل میں کسی قسم کا شبہ پیدا ہو۔ ہمیں احتیاط بہر حال کرنی چاہیئے۔"

بوڑھے طبیب نے اپنے اشتیاق اور وارفتگی کو قوت ارادی سے کچل دیا۔ اور پوچھا "ہاں تو تجھے کیا تکلیف ہے؟ جلد بتا تاکہ اس کا فوراً علاج شروع کر دیا جائے۔"

جیلیا نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا۔ "بائیں طرف پسلیوں کے نیچے۔ میرا خیال ہے کہ صرف کہنے یا سننے سے کام نہیں چلے گا بہتر ہے کہ اس کا معائنہ بھی فرما لیا جائے۔"

"بائیں طرف پسلیوں کے نیچے!!" بوڑھے طبیب نے پریشان ہو کر جیلیا کے الفاظ دہرا لئے۔ "لیکن لیکن اس جگہ کا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تکلیف کیا ہے۔ کچھ کیفیت تو بیان کر۔"

جیلیا نے نخرے دکھائے اور شوخ وشریر لہجے میں کہا۔ "تمام تکلیفیں یکساں ہوتی ہیں۔ ان کی شدت میں کمی بیشی البتہ ہو سکتی ہے۔ میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ یا تو مجھے ضعف معدہ کی شکایت ہے یا جگر خراب ہے اور اس کا فیصلہ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد آپ خود فرمائیں گے۔"

تقی نے جب یہ دیکھا کہ جیلیا اس جگہ کا معائنہ کرانے ہی پر بضد ہے تو اپنے پیشے کی ذمہ داری سے وہ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے اس جگہ کا معائنہ کرنا بہت ضروری خیال کیا۔

بوڑھے کا رہا سہا حزم واحتیاط اس معائنے کے دوران رخصت ہو گیا۔ اور اس عالم میں جیلیا کی شرارت اور لگاوٹ کی باتوں نے رہے سہے احتیاط اور شبہات بھی دور کر دیئے۔

چلتے چلاتے جب جیلیا نے بوڑھے طبیب سے یہ کہا کہ "ایک بیمار اور ناقابل اعتبار نوجوان کے مقابلے میں صحت مند اور تجربہ کار بوڑھا زیادہ اچھا ہے۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ دوبارہ پھر یہاں تشریف لا کر گوارا

فرمائیں گے؟"

زخم خوردہ طبیب کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ بہر حال جب تک تو بیمار ہے میرا آنا لازمی ہے اور اب تو میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تیرا مرض متعدی ہے اور کچھ میں خود بھی اس سے متاثر ہو چلا ہوں۔"

بوڑھا تقی چلا گیا اور جیلیا اپنے اگلے حصے کا خاکہ تیار کرنے لگی۔

اب بوڑھے تقی نے العاضد کو جیلیا کے خلاف برگشتہ کرنے میں سرگرمی دکھلانی شروع کر دی اور اپنے پند و نصائح سے خوب اچھی طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر نوجوان مگر بیمار العاضد نے ذرا بھی بے احتیاطی اور لاپروائی سے کام لیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسری طرف جیلیا کے علاج میں جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ روئی کی طرح سفید داڑھی حنا اور وسمے کے لیپ سے سیاہ ہو گئی تھی اور سر کے چاندی جیسے بال حنا سے سرخ کر دیئے گئے تھے۔

العاضد بے چین تھا کہ جیلیا سے کس طرح ملا جائے۔ بوڑھے طبیب نے جیلیا کو سکھا رکھا تھا کہ جب العاضد اس کو دیکھنے آ جائے تو اس کو اس قریب المرگ نوجوان سے بچنے کے لئے بیماری کا بہانا بنانا چاہیئے۔ جیلیا نے ہامی بھر لی تھی۔ دوسری طرف جیلیا کے آس پاس کے لوگ العاضد کو کچھ عجیب و غریب خبریں فراہم کر رہے تھے۔ اسے پہلے تو ان پر یقین نہ آیا لیکن جب اس نے بوڑھے طبیب کی حنا اور وسمے کی آمیزش سے سیاہ ہو جانے والی داڑھی پر غور کیا اور پھر سر کے سرخ بالوں پر نظر گئی تو اس کے شبہات یقین میں بدلنے لگے، ملک کے نازک اور پیچیدہ معاملات الگ مانع تھے۔ لیکن اس کے باوجود جیلیا سے ملنے پہنچ گیا۔ العاضد کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے بیمار بننے کی کامیاب اداکاری کرنا چاہی لیکن ناکام رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ العاضد میں وہ پہلی جیسی سرگرمی نہیں ہے وہ اگلا سا التفات اور لگاؤ مفقود ہے۔ ان حالات میں اسے بھی اپنی بیماری کے مکر سے دستکش ہونا پڑا۔ اس نے جرأت سے کام لیا اور العاضد کے سینے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

العاضد نے اس کی کمر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور مسہری کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

"جیلیا! میں اس درمیان بہت زیادہ فکر مند رہا ہوں۔ اور افسوس کہ میں تیری عیادت کو بھی نہ آ سکا۔ اب پہلے یہ بتا کہ تیری طبیعت کیسی ہے؟"

جیلیا کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ بے ساختہ ہنس دی۔ بولی۔ "امیر المومنین کی تشریف آوری سے پہلے میں کسی حد تک بیمار بھی تھی لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

العاضد اور جیلیا مسہری پر پاس پاس بیٹھ گئے۔

پھر فکرمندی اور تامل کے بعد العاضد نے کہا "میرے خبر رسانوں نے تیرے اور طبیب کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں پھیلا رکھی ہیں۔ کیا تو خود بھی اس پر کوئی تبصرہ کر سکتی ہے؟"

جیلیا نے بلا جھجک عرض کیا "لوگ تو عجائب پسند ہوتے ہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ امیر المومنین کے طبیب نے میرے علاج معالجے میں غیر معمولی مستعدی اور محنت سے کام لیا ہے لیکن اس سے لوگوں میں شک شبہ تو نہیں پھیلنا چاہیئے۔"

العاضد نے بوڑھے تقی کی داڑھی اور سر کے بالوں کی طرف اشارہ کیا "بوڑھے تقی کے بالوں میں مضحکہ خیز تبدیلی بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ہے۔"

جیلیا نے شوخ و شریر لہجے میں سادگی سے جواب دیا "ہاں اس کے لئے میں امیر المومنین کی واقعی گناہگار ہوں جیسا کہ امیر المومنین نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ میں بڑھاپا بالکل پسند نہیں کرتی۔ حد تو یہ ہے کہ جب میں خود اپنے بڑھاپے کا تصور کرتی ہوں تو بڑھاپے سے قبل موت کی طالب ہو جاتی ہوں۔ اپنی اسی کراہ کے پیش نظر میں نے امیر المومنین کے بوڑھے طبیب سے یہ خواہش کی تھی کہ جب تک وہ میرے علاج پر مامور ہے اس کو اپنی داڑھی میں حنا اور وسمے کا آمیزہ اور سر کے بالوں میں صرف حنا استعمال کرنا چاہیئے۔"

اس جواب نے العاضد کے شکوک دور کر دیئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب العاضد واپس جانے لگا تو جیلیا کی ایک غیر متوقع خواہش نے پچھلے شکوک اور شبہات کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔

جیلیا نے العاضد سے اجازت طلب کی "اگر اس وقت امیر المومنین تشریف نہ لاتے تو میں خود کسی وقت اذن باریابی چاہتی۔ قاہرہ کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آ رہی ہے میں چاہتی ہوں کہ امیر المومنین کچھ دنوں کیلئے مجھے قاہرہ کے باہر بھیج دیں۔ میں دریائے نیل کے مشرقی ساحل شہر اخمیم جانا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس شہر کی کھلی آب و ہوا اور قدیم قبطیوں کی شاندار یادگاریں میری صحت کے حق میں مفید ثابت ہوں گی۔"

العاضد نے دریافت کیا "اور تو اس سفر میں اپنے ساتھ کسے لے جانا پسند کرے گی؟"

جیلیا نے جواب دیا "امیر المومنین کے قابل اعتبار مخلص اور بوڑھے طبیب تقی کو۔"

العاضد چونک پڑا اور کچھ سوچتا ہوا بولا "بہتر ہے لیکن تیرے ساتھ تیری خدمت کے لئے دو کنیزیں اور چار غلام بھی جائیں گے۔"

جیلیا سمجھ گئی کہ یہ دو کنیزیں اور چار غلام اس کی خدمت کے لئے نہیں، نگرانی اور جاسوسی

کے لئے ساتھ کئے جائیں گے۔ اسے اپنی عقل اور ذات پر اعتماد تھا اس نے العاضد کی اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ سر جھکا کر بولی "امیر المومنین کی عنایات اور نوازش کا پیشگی شکریہ ادا کرتی ہوں"۔ العاضد شکوک اور شبہات کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اسے جوانی اور حسن و شباب کے مجسمے جیلیا اور بڈھے تقی کے باہمی واسطہ ارتباط کی جستجو تھی اور عقل کے پاس اس کا کوئی معقول جواز یا جواب نہ تھا۔

بوڑھے طبیب کی سرپرستی میں جب یہ مختصر قافلہ اخمیم پہنچا تو جیلیا کی خوشی کی انتہا نہ رہی دونوں کنیزیں اور چار غلام خدمت کے بہانے ہر وقت آس پاس منڈلاتے رہتے۔ لیکن یہاں جیلیا کو کسی بات کا ڈر نہ تھا۔ وہ نہایت بے تکلفی سے بوڑھے تقی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اہرام کی سیڑھیوں پر چڑھ جاتی اور کافی بلندی پر پہنچ کر دونوں راز و نیاز میں کھو جاتے۔ یہاں سے اتر کر اخمیم کے سب سے قدیم چالیس ستونوں والے قبطی مندر میں گھس جاتی اور اس کی رنگا رنگ مینا کاری میں محو ہو جاتی۔ مندر کے مختلف دالانوں میں بنی ہوئی تصویریں دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتی۔ ہزاروں سال پہلے کی بنی ہوئی یہ تصویریں عجیب تھیں، پر پرواز تولتے ہوئے پرندوں کی تصویریں خوش رو حسین لیکن ایک دوسرے سے مختلف وضع قطع رکھنے والے آدمیوں کی تصویریں، کسی کے ہاتھ میں ہتھیار تھا کسی کے ہاتھ میں پیالہ اور کوئی خالی ہاتھ تھا۔ جیلیا انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ اور بوڑھے تقی کو ان سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتی رہی۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ یہاں برسوں رہ چکی ہو۔ یہ ساری خبریں مستعدی سے العاضد کو بھیجی جا رہی تھیں۔ جیلیا نے جب بہت زیادہ خوش ہو کر یہ کہا کہ "اب وہ یہاں سے قاہرہ واپس نہیں جائے گی اور بوڑھا طبیب بھی اس کے ساتھ رہے گا"۔ تو اس اہم خبر کو لے کر ایک ہرکارہ فوراً قاہرہ روانہ ہو گیا۔ لیکن جب یہ دونوں چالیس ستونوں والے عظیم قبطی مندر میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے تو انہیں ڈھونڈتا ہوا ایک خواجہ سرا وہیں پہنچ گیا۔ وہ ایک المناک خبر لے کر آیا تھا۔ خواجہ سرا نے جیلیا کے ہاتھ میں قرطاس کا ایک پرزہ تھما دیا۔ جیلیا نے لرزتے ہاتھوں سے اس کی تہیں دور کیں اور خط پڑھنے لگی۔ اس میں لکھنے والے کا نام نہ تھا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"آقائے ولی نعمت شاور کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل بہت المناک ہے جب وہ کسی اہم مسئلے پر بات کرنے عباسی جنرل شیر کوہ کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ شیر کوہ امام شافعی کے مزار پر گیا ہوا ہے۔ وہ یہاں سے امام شافعی کے مزار کی طرف چل دیا۔ لیکن عین روانگی کے بعد شیر کوہ کے بھتیجے صلاح الدین نے اسے قید کر کے العاضد کو اس سے مطلع کر دیا۔ العاضد نے صلاح الدین کو بار بار یہ تاکید کی کہ شاور کو قتل کر دیا جائے۔ شاور قتل کر دیا گیا۔ اب

اس کی جگہ وزارت عظمےٰ کا عہدہ شیر کوہ کے حوالے کر دیا گیا۔ فوراً قاہرہ واپس آؤ۔ یہاں کی تو دُنیا ہی بدل چکی ہے۔"

جبیلیا پر اس خبر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شاور کا انجام وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ اسے خوشی تھی کہ راستے کا سب سے خطرناک کانٹا دُور ہو چکا تھا اور منزلِ مراد اب کچھ زیادہ دُور نہ تھی۔ سیر و تفریح جاری رہی۔ بوڑھا تقی اس وقت مندر کی پیکانی عبارتوں میں کھویا ہوا تھا۔ ایک اجنبی شخص کو جبیلیا کے قریب دیکھ کر مڑا اور جبیلیا سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟"

جبیلیا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "کیا اسے نہیں پہچانتے؟ یہ قصرِ خلافت کا خواجہ سرا ہے۔ اور موتمن الدولہ کی طرف سے ایک خاص خبر لے کر آیا ہے۔"

اس کے بعد جبیلیا نے قرطاس کا پرزہ بوڑھے تقی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جیسے جیسے اسے پڑھتا چہرے کا رنگ بدلتا جاتا۔ آخر میں اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ فرطِ جوش میں چلایا۔

"اے میرے آقا العاضد! بالآخر تو نے اپنے بدترین دشمن سے نجات حاصل کر لی۔"

وہ لوگ مندر کے دالانوں سے گزر کر عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور پھر اس کے صدر دروازے سے نکل کر باہر میدان میں پہنچ گئے۔ ان کے گھوڑے زیتون کے سائے میں کھڑے ہنہنا رہے تھے۔ اور ان کی لگامیں العاضد کے عطا کردہ غلاموں نے پکڑ رکھی تھیں۔ ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ ان کی نظریں اس گرد و غبار پر جم گئیں جو جنوب سے بلند ہو رہا تھا۔ اور دم بدم قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یہ لوگ دوڑ کر اپنے گھوڑوں کے قریب پہنچ گئے اور خوفزدہ نظروں سے آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس گرد و غبار کے اندر سے کئی سو سپاہی نمودار ہوئے جو اپنے لباس سے مصری نہیں لگتے تھے، پہلے ان کا رخ قدیم قبطی مندر کی طرف تھا لیکن ایک سوار کی نظر ان پر پڑ گئی اور اس نے با آواز بلند کچھ کہتے ہوئے اپنے گھوڑے کی باگ ان لوگوں کی طرف موڑ دی۔ اس سوار کی اتباع میں دوسرے سواروں نے بھی اپنے اپنے گھوڑوں کا منہ اس طرف موڑ دیا۔ جو گھوڑے ذرا آگے نکل چکے تھے نصف دائرہ بناتے ہوئے زیتون کے درخت کی طرف مڑ گئے۔

زیتون کا درخت محاصرے میں لے لیا گیا اور ان میں کا ایک شخص گھوڑے کی پشت سے کود کر نیچے آ گیا۔ اس کا سر بڑا، چہرہ بارعب۔ داڑھی گھنی، پیٹ ذرا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ جبیلیا اور تقی کے قریب پہنچ کر مبہوت رہ گیا۔ "اتنی حسین اور نوعمر لڑکی کسی حفاظتی سپاہ کے بغیر ایک بوڑھے اور چند آدمیوں کے

ساتھ اس ویرانے میں !!"

بوڑھا تقی اب انہیں اس حد تک پہچان چکا تھا کہ یہ لوگ عباسی سپاہ سے تعلق رکھتے ہیں.

ادھیڑ عمر فوجی نے ان سے ایک عام سا سوال کیا۔ "کیا تمہیں لڑنا نہیں آتا؟"

بوڑھے طبیب نے دانائی سے بھرپور جواب دیا۔ "میں طبیب ہوں جو زخموں کا علاج تو کر سکتا ہے. لیکن زخمی نہیں کر سکتا۔"

ادھیڑ عمر فوجی مسکرا دیا۔ "تو بہت عقلمند معلوم ہوتا ہے۔" اس کے بعد ان کے غلاموں کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ؟ کیا یہ بھی تیری طرح طبیب ہیں؟ تیری طرف سے یہ تو لڑ سکتے ہیں!"

بوڑھے تقی نے دوسرا دانائی سے لبریز جواب دیا۔ "یہ میرے غلام ہیں اور یہ میری مرضی کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتے!"

"خوب خوب!" ادھیڑ عمر فوجی مسکراتا ہوا زور سے چلایا۔

بوڑھے طبیب نے نہایت اطمینان سے سوال کیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم لوگ عباسی سپاہ سے تعلق رکھتے ہو!"

"تو ٹھیک کہتا ہے!" ادھیڑ عمر فوجی ان سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ جیلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟ کیا تیری لڑکی ہے؟"

بوڑھا طبیب مخمصے میں پھنس گیا۔ بیٹی کہہ نہ سکتا تھا۔ محبوبہ کہتا تو مذاق اڑتا اور جیلیا کے چھن جانے کا بھی خوف تھا۔ بوڑھے نے جیلیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ کہ اس اجڈ فوجی کے سوال کا تو ہی کوئی اچھا سا جواب دے سکتی ہے.

اب جیلیا نے اپنے لب کھولے اور دلوں میں ہلچل مچا دینے والی آواز میں کہا۔ "میں قصر فاطمی سے تعلق رکھتی ہوں اور یہ بوڑھا طبیب العاضد کا طبیب خاص بھی ہے اور اتالیق بھی ہم لوگ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اخمیم آ رہے تھے۔"

مرتمن الدو ابھی موجود تھا۔ ادھیڑ عمر فوجی نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ کون ہے؟"

جیلیا نے جواب دیا۔ "یہ ہمارا خادم ہے!"

"غلط جھوٹ!" وہ چیخا۔ "یہ ضرور کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے۔ اس کا تیز رفتار گھوڑا اور اس کے بھاگنے کا اندھا دھند انداز ہی تو ہمیں یہاں تک کھینچ لایا ہے!"

اتنا کہہ کر اس فوجی نے نہایت بے باکی سے ان کی تلاشی لینا شروع کر دی اور جیلیا کے پاس سے موتمن الدولہ کا پیغام برآمد کر لیا اور ۔ سے پڑھتے ہی بے ساختہ ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ بھر چیخا۔

"احمق لڑکی! تو ہیں بے وقوف نہ بنا۔ سچ سچ بتا کہ تیرے ملعون شاور سے کس قسم کے تعلقات رہے ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھ کہ اس وقت تو اسد الدین شیر کوہ سے مخاطب ہے جو جھوٹ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

جیلیا خوفزدہ ہو کر گال سہلانے لگی۔ یہ تو ان مصریوں سے بالکل مختلف تھا جنہیں اب تک یہ بہلاتی پھسلاتی رہی ہے۔ بوڑھا طبیب خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن مجبور تھا۔

ان سب کو حراست میں لینے کے بعد انہی کی نشاندہی پر دونوں کنیزیں بھی گرفتار کر لی گئیں بھائی جنرل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور جرح اور بحث کے بغیر ان پر اطمینان نہ کر سکتا تھا۔ قاہرہ پہنچ کر جب یہ قیدی عباسی سپاہ کے درمیان سے گزر رہے تھے تو جیلیا پر ہزاروں للچائی نظریں نچھاور ہو رہی تھیں لیکن اسد الدین شیر کوہ اس طرح چل رہا تھا گویا جیلیا کے زہرشکن حسن کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ متاثر وہ بھی تھا لیکن اسے اپنی طبیعت پر قابو حاصل تھا۔ اور اندرونی طوفان کے آثار اس کے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہوتے تھے۔

جیلیا کی طبیعت بھی کچھ عجیب تھی۔ جب وہ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ قید تنہائی گزار رہی تھی تو اس کے تصورات پر شیر کوہ کا قبضہ تھا۔ وہ شیر کوہ۔ جو اب مصر کا وزیر اعظم تھا۔ خلافت عباسی کا تجربہ کار مشہور اور بااختیار جنرل، جو محض سپاہی تھا، شجاعت اور دلیری جس کی ہر ہر ادا اور ایک ایک بات میں پائی جاتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ شاور جیسا وزیر اعظم ہرگز نہ ہوگا۔ شیر کوہ کا مستقبل سب سے زیادہ روشن تھا۔ بیمار اور نادان العاضد کے بجائے اب وہ اس سنگلاخ قلعے کو سر کرے گی۔ اس نے شیر کوہ کی تسخیر کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کا پہلا سبق یہ تھا کہ جب شیر کوہ تخلیے میں اس سے اس کے ماضی اور اصل حیثیت کے بارے میں سوالات کرنے بیٹھا تو کسی سوال سے پہلے ہی اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس نے کہا۔

"میں شاور کی آلہ کار نہیں بن سکتی تھی اس لئے میں قاہرہ سے اخمیم چلی گئی تھی۔ میں العاضد کے محل میں بھی واپس نہیں جانا چاہتی!"

شیر کوہ اس کے بیان سے مطمئن ہو گیا۔ "اب تو کیا چاہتی ہے؟"

جیلیا کے گالوں پر شرم و حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ "اب میں قصر خلافت واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"پھر؟" شیر کوہ ٹہلنے لگا۔ "پھر تو کیا چاہتی ہے؟ اور کہاں جانا چاہتی ہے؟"

جیلیا نے گویا عالم سرخوشی سے جواب دیا۔ "اخمیم میں زیتون کے سائے تلے لگائے جانے والے ملیچے کی لذت میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گی۔ تو بہادر ہے اور میں اس بہادر سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔"

"احمق، پاگل!" شیرکوہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ "نادان لڑکی! میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میرے کئی بچے بھی ہیں!"

جیلیا نے جواب دیا۔ "مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، تاہم دونوں ایک معاہدہ کر لیں جب تک تو مصر میں رہے گا میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ جب تو یہاں سے جائے گا تو میں یہیں رہ کر تیرا انتظار کرونگی۔ اس طرح میں اور تیری بیوی دونوں ایک دوسرے کی رقابت اور حسد سے بھی محفوظ رہیں گے۔"

جیلیا کی تجویز بہت معقول تھی۔ اس لڑکی نے شیرکوہ کو اندر سے کچھ کمزور کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ "اچھا مجھے سوچنے کا موقع دے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد جیلیا کی قید تنہائی ختم ہو گئی۔ دونوں کنیزیں اس کی خدمت پر مامور کر دی گئیں۔ اور باہر سپاہی ان کی نگرانی پر متعین کر دیئے گئے۔ جیلیا کو شیرکوہ پر مشتبہ فتح حاصل ہو گئی تھی۔

شیرکوہ نے جیلیا کی درخواست منظور کر لی تھی۔ لیکن اس کے لئے اپنی طرف سے جو کڑی شرط عائد کر دی تھی وہ بڑی جان جوکھم کا کام تھا۔ اس نے کہا۔ "جیلیا! تو قصر خلافت میں واپس جا۔ میں محبت کی قدر کرتا ہوں لیکن کسی ایسی محبت پر یقین نہیں رکھتا جو تیری طرح اچانک ہو گئی ہو۔ میں تیری محبت کو پرکھنا چاہتا ہوں!"

جیلیا نے قصر خلافت کی واپسی کے حکم کو سنا اور کرب سے بے چین ہو گئی۔ تاہم اس نے صبر و سکون سے دریافت کیا۔ "بہادر جنرل! تو بھی صحیح کہتا ہے۔ میری طرف سے جس سادگی اور سادہ لوحی سے محبت کا اظہار ہوا ہے تیرے جیسے غیر مصری کو اس پر شبہ ہی کرنا چاہیئے۔"

شیرکوہ نے ناگواری سے اجڈ لہجے میں کہا۔ "میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا اور اس وقت تک جب تک کہ تو اپنی بے لوث محبت کا یقین نہ دلا دے میں تجھ سے باتیں بھی کس قسم کی کر سکتا ہوں۔"

جیلیا نے بھی کمزور لہجے میں سوال کیا۔ "اپنی شرط بیان کر۔ گفتگو بند۔"

شیرکوہ نے کسی قدر تامل سے کہا۔ "تو العاضد کے آس پاس رہ اور وہاں کے حالات سے کسی بھی طرح مجھے باخبر رکھ۔"

پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "اپنی خدمات کے صلے میں تو جو کچھ پائے گی اس کا تو قبل از وقت تصور بھی نہیں

کر سکتی۔ اشارۃً بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ حجاز سے طاغیر تک اور بغداد سے ماوراء النہر تک ایک خلافت رہے گی اور وہ ہوگی خلافتِ بغداد۔ مصر کی چار خلافت کو اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

شیرکوہ نے جیلیا کے چہرے کا جائزہ لیا اور اس کی اندرونی کیفیات کو جاننے کی کوشش کی۔ اور پھر آخری وار کیا۔ "مصری خلافت کا زوال تیرا عروج ہوگا۔ کیونکہ یہاں کی حکومت شیرکوہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں مل سکتی۔"

جیلیا کی جاہ پسند طبیعت شکست کھا گئی اور سنہری مستقبل کا خوش آئند تصور فاطمی خلافت کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ جیلیا نے دریافت کیا۔ "لیکن محلسرا کی خبریں تجھ تک کس طرح پہنچیں گی؟"

شیرکوہ نے اس طرح جواب دیا گویا سارا انتظام پہلے ہی سے کیا جا چکا ہے۔ "محلسرا کے ملوک نگراں اور پہرے دار تجھ سے خود ہی رابطہ قائم کرلیں گے۔"

جیلیا نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں اور تو جس طرح کہے گا کروں گی لیکن میری خواہش ہے کہ تو مجھے اپنی ہدایات پر چلا۔ مجھے اپنی خود اعتمادی پر اتنا بڑا بھروسہ نہیں ہے کہ مصری خلافت کو ڈھا سکوں۔"

شیرکوہ نے کہا۔ "بہتر ہے کل صبح تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ فاطمی محلسرا واپس چلی جا اور العاضد کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر۔"

جیلیا کو سکون حاصل ہوچکا تھا۔ اور شیرکوہ زیرِ دام آچکا تھا۔ اس کے خیال میں بوسیدہ اور دیمک خوردہ مصری خلافت کو ڈھا دینا اتنا بڑا کام بھی نہ تھا۔

دوسرے دن صبح شیرکوہ نے جیلیا، بوڑھے تتی اور ان کے آدمیوں کو مختصر سے معذرت نامے کے ساتھ العاضد کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

العاضد کو اب تک اخمیم سے جیلیا کے بارے میں جیسی شرمناک اور حیا سوز اطلاعات پہنچی تھیں انہوں نے اسے آتشِ زیرِ پا کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پھر جب اسے یہ اطلاع ملی کہ انہیں شیرکوہ نے گرفتار کرلیا ہے تو اس کا غصہ شیرکوہ کی طرف منتقل ہوگیا۔ لیکن اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ شیرکوہ کی حیثیت فاتح جیسی تھی اور مصری خلافت کی مفتوح جیسی۔ لیکن جب العاضد کو یہ خبر پہنچی کہ شیرکوہ نے ان قیدیوں کو عزت و احترام کے ساتھ محلسرائے خلافت واپس بھیج دیا ہے تو اس کے دل میں شیرکوہ کی قدر و منزلت پہلے سے زیادہ ہوگئی۔

اسے اطلاع ملی کہ جیلیا اور بوڑھا طبیب، دونوں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہیں تو ان دونوں کے خلاف اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ دلنواز مطربائیں العاضد کی افسردگی اور تکدر کو

دور کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں کہ جیلیا اور اتالیق حاضر کر دیئے گئے۔ بوڑھے تتی نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر رکھ لئے اور نادم و شرمسار گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ العاضد اپنے بزرگ اتالیق کو دوسروں کے سامنے پھر بھی ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے کنیزوں کو رخصت کر دیا۔

العاضد کے ہاتھ میں دُرّہ تھا اور مارے غصّے کے بار بار اسے حرکت دے رہا تھا۔

العاضد کا چہرہ تمتایا ہوا تھا۔ اس نے حقارت سے بوڑھے اتالیق کو گھورا اور سوال کیا "اور بڈھے ناصح کیا تو اب بھی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تو جیلیا سے محبت نہیں کرتا اور یہ محبت کیا اس نوع کی نہیں ہے جس کے محرک سفلہ جذبات ہوا کرتے ہیں؟"

بوڑھے نے آہستہ سے اقرار کیا۔ "مجھے اقرار ہے!"

العاضد نے دُرّے کو فضا میں لہرایا اور زمین پر دے مارا "کیا تو اس سے بھی انکار کر سکتا ہے کہ جیلیا میری امانت تھی اور تو نے خیانت کی!"

بوڑھے نے انکار کیا۔ "میں نے خیانت نہیں کی!"

"تو جھوٹ بولتا ہے!" العاضد کپکپانے لگا "کیا تو جیلیا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قدیم مصری شاہوں کے مقبروں کی سیڑھیوں پر چڑھا اترا نہیں کرتا تھا؟"

■ مجھے اس کا اقرار ہے!" بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور یہ کہ" العاضد کہنے لگا۔ "اخمیم کے قدیم چالیس ستونوں والے مندر کے دالانوں میں کیا تو نے جیلیا کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا؟"

■ میں انکار نہیں کروں گا درست ہے!" بوڑھا اطمینان سے بولا۔

"اور یہ کہ تو نے جیلیا کو اپنی آغوش میں لے کر بوسہ دیا۔ کیا یہ غلط ہے؟" العاضد تھرتھرا رہا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے اقرار ہے!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی بتا تو نے اپنی روئی جیسی سفید داڑھی کو حنا اور وسمے کے آمیزے سے کیا اس لیے سیاہ نہیں کیا تھا کہ نوجوان جیلیا کے دل میں نوجوان جیسی شکل بنا کر رسائی حاصل کرے؟"

بوڑھے نے مختصر جواب دیا "یہ بھی درست ہے!"

العاضد نے دُرّے کو ایک بار پھر ہوا میں لہرا کر زمین پر دے مارا۔ "جب سب کچھ درست ہے سب کچھ صحیح ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ایسا کرتے وقت تیرے حافظے سے وہ نصیحتیں اور ہدایتیں محو ہو گئی تھیں جو تو جیلیا کے بارے میں مجھے دیا کرتا تھا!"

"نہیں! مجھے وہ سب کچھ آج تک یاد ہے۔"

"تو بوڑھا بھی ہے اور میرا اتالیق بھی، میں تجھے کوئی سزا نہیں دینا چاہتا لیکن تجھے اپنی فردِ جرم کی صفائی میں یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ ایسا کیوں ہوا؟" العاضد کو ضد ہو گئی تھی۔

بڑھے نے گردن اوپر اٹھائی اور ہاتھ سے جیلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "امیر المومنین! پہلے اس سے اسی نوع کے سوالات کریں۔ میں اس کے جوابات سننے کے بعد کوئی جواب دوں گا۔"

العاضد طیش میں جیلیا کی طرف گھوم گیا اور اس کی نرم و نازک پشت پر ایک درہ رسید کر دیا۔ وہ بلبلا گئی۔ العاضد نے غصے میں پوچھا: "ابھی میں نے جو سوالات اپنے اتالیق سے کئے تھے کیا تو انہیں سن رہی تھی؟"

جیلیا نے روتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

العاضد نے تڑپ کر پوچھا: "تیرے پاس اپنی برات کے لئے کیا جواب ہے؟"

جیلیا کے حلق سے یوں آواز نکلی جیسے وہ اندر سے دھکیلی جا رہی ہو: "امیر المومنین! میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے اس احمق بوڑھے سے آج تک محبت نہیں کی، اس طرح میں دراصل اپنی اس اہانت اور سبکی کا بدلہ لے رہی تھی جو پہلی بار امیر المومنین کے رُوبرو اس سے سرزد ہوئی تھی۔ اب امیر المومنین چاہیں تو مجھے قتل کرا دیں، میں نہ تو اس احمق سے محبت کرتی تھی اور نہ اب اس کے لئے میرے دل میں کوئی گنجائش ہے۔"

العاضد کو جیلیا کی یہ صاف گوئی بہت بھلی لگی۔ اسے ہنسی آ گئی۔ مسکرا کر بولا: "ارری احمق کیا یہ بہتر نہ تھا کہ تو اسے معاف کر دیتی؟"

جیلیا نے کراہتے ہوئے کہا: "میں نے اس کو سزا ہی کون سی دی ہے؟"

العاضد ہنستا ہوا بولا: "کیا تو اسے سزا نہیں سمجھتی کہ یہ جدھر جاتا ہے لوگ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں؟"

اس کے بعد وہ بوڑھے اتالیق کی طرف مخاطب ہوا: "جیلیا کے خوبصورت جواب نے مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے اب میں تیری زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

بوڑھے نے اپنا پرانا لہجہ اختیار کیا: "جیلیا تو احمق تھی جس نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بوڑھا اس کا عاشق ہو گیا ہے اور امیر المومنین نے بھی رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ میں عاشقوں کی طرح اس شریر اور چالاک لڑکی کے پیچھے پھرتا رہا۔ میں نے اکثر و بیشتر اس سے اظہارِ عشق بھی کیا ہے، اس کے ہاتھوں اور رخساروں کے بوسے بھی لئے اس کو آغوش میں بھینچا لیکن ایک ایسی لغزش، جسے خیانت کہا جا سکتا ہے میں اس کا مرتکب نہیں ہوا۔"

پھر وہ اپنے کردار کی اصل بلندی پر پہنچ گیا اور کہنے لگا۔ "امیرالمومنین کو میں نے جب بھی اس لہو و لعب سے دور رہنے کی تلقین کی، اس کا ہمیشہ مقصد یہی ہوتا تھا کہ شہزادے میں ابھی ناتجربہ کاری ہے۔ خلافت کا بہت بڑا بوجھ کاندھے پر ہے۔ اگر امیرالمومنین اس طرف راغب ہو گئے تو پھر اپنے حصے کے بڑے بڑے کام کس طرح انجام دیں گے۔ امیرالمومنین نے مجھ کو لاعلم رکھ کر یہ طے کیا کہ جیلیا سے چوری چھپے ملتے بھی رہیں اور اس ملاقات میں اعتدال بھی قائم رکھیں۔ یہاں پہنچ کر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جس زور آور شباب نے ایک بوڑھے کو اس حد تک دیوانہ و وارفتہ کر دیا ہو وہ کسی جوان کو کہاں تک نکما نہ بنا دے گا میری حماقت امیرالمومنین کے حق میں تازیانہ عبرت ہے۔"

العاضد کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ ساری کدورتیں دھل گئیں۔ اس نے بوڑھے تقی کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔ جب بوڑھا اتالیق چلا گیا تو العاضد نے جیلیا کے دونوں گال پیار سے تھپتھپائے اور کہنے لگا۔ "شریر لڑکی! تو نے اس بوڑھے کو بہت ہلکان کر دیا لیکن دیکھا کہ یہ بوڑھا تجھ سے بھی زیادہ چالاک نکلا۔" جیلیا نے جواب دیا۔ "بوڑھا اپنی چالاکی سے جان بچا لے گیا ورنہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کی چاہت حقیقی تھی یا وہ اداکاری کر رہا تھا۔"

العاضد نے کہا۔ "اچھا اب جا اور آرام کر۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ اتالیق ہم دونوں کی راہ میں اتنی شدت سے مزاحم نہ ہوگا۔ وہ اپنا سارا زور ختم کر چکا ہے۔"

جیلیا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آناً فاناً پورا محلسرا مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اندر ایک نفسیاتی تحریک چل رہی تھی۔ ہر شخص مصری خلافت کے زوال کا منتظر تھا۔ ہر آدمی اس پر یقین رکھتا تھا کہ قصر فاطمی کا اقتدار اب چند روزہ ہے اس مایوسی اور غیر یقینی کیفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ ذات، جس کی وفاداریاں اور خدمات محلسرا اور العاضد سے تعلق رکھتی تھیں اس میں سرد مہری اور سرتابی پائی جانے لگی۔ العاضد حیران تھا کہ اس کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے لیکن کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ خلافت کے بڑے بڑے عہدے دار خود بخود شیرکوہ کے سامنے جوابدہ ہوتے، العاضد ان سب سے کٹ گیا تھا۔ اس نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ مصر کا اقتدار عملاً شیرکوہ کو منتقل ہو چکا ہے اور اس کی موجودہ حیثیت شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہیں ہے اور افسوس تو یہی تھا کہ اس بے بسی کا کوئی علاج بھی نہ تھا۔

اس دوران جیلیا کو شیرکوہ کا ایک خاص پیغام ملا۔ اس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی بھی طرح شیرکوہ سے ملنے کی کوشش کرے۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں لکھا نہیں جا سکتا۔ جیلیا تو شیرکوہ کی عاشق تھی۔

اور محلسرا سے نکلنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ کسی مملوک نے اس کو یہ بری خبر سنائی کہ العاضد اس کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کی بہت سی باتیں پکڑی جا چکی ہیں۔ ان حالات میں جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے فرار ہو جاؤ۔

جیلیا نے جلدی جلدی ضروری سامان سمیٹا اور العاضد سے ملے بغیر چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں محلسرا سے باہر نکلی۔ پہرے دار مملوک اس کے رہبر اور محافظ تھے۔ صبا رفتار گھوڑے تیار کھڑے تھے جیلیا اُچھل کر مردوں کی طرح اس کی پشت پر سوار ہو گئی۔ جیلیا نے ٹکی چلا کر ایک دم اڑ لگائی۔ محلسرا کے چند سواروں نے ان کا تعاقب بھی کیا لیکن اس کے مملوک سپاہیوں نے انہیں خاک و خون میں لوٹنے کے لئے زخمی کر کے گرا دیا۔ اور یہ لوگ بہت جلد خطرناک علاقے سے گزر کر شیرکوہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔

جب یہ لوگ شیرکوہ کی قیام گاہ میں پہنچے اس وقت وہ بسیار خوری میں مصروف تھا۔ شیرکوہ کے پسندیدہ دو ہی کام تھے۔ ایک نت نئے علاقے فتح کرنا اور دوسرا دس پانچ آدمیوں کی خوراک تنہا کھا جانا۔ وہ بہت دیر سے کھانے میں مصروف تھا اور بہت سے برتن خالی کر چکا تھا۔ اس نے اک نگاہ غلط انداز سے جیلیا کو دیکھا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔ شیرکوہ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے انہی میں اس کا تیس سالہ نوجوان بھتیجا صلاح الدین ایوبی بھی بیٹھا تھا۔ شیرکوہ نے جیلیا کا صلاح الدین سے تعارف کرایا۔

" بھتیجے یہی وہ قتالۂ عالم ہے جس نے نفسیاتی جنگ لڑ کر ہمارے لئے جگہ ہموار کر دی ہے۔"

صلاح الدین نے ایک اچٹتی نظر جیلیا پر ڈالی اور گردن جھکالی۔ اب جیلیا بالکل اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شیرکوہ نے جیلیا کو مخاطب کیا۔" اور دیکھ! یہ میرے بھائی شادی بن ایوب کا بیٹا اور میرا بھتیجا ہے اس نے تیرے وطن اسکندریہ کے محاصرے اور حملے کو جس ہمت اور استقلال سے روکا تھا اس پر مجھے فخر ہے۔"

صلاح الدین نے بے ساختہ کہا" اب بس بھی کرو بہت کھا چکے!"

ابھی صلاح الدین کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شیرکوہ گر گیا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک ہلچل مچ گئی۔ ایک کہرام برپا ہو گیا۔ صلاح الدین نے جیلیا کو دوسرے حصے میں پہنچا دیا۔ اور خود شیرکوہ کو سنبھالنے لگا۔ کئی دوسرے لوگ بھی بھاگے ہوئے آئے اور شیرکوہ پر جھک گئے۔ شیرکوہ پیٹ کے درد سے شیر کی طرح بکار رہا تھا ہر شخص پریشان تھا۔ طبیب بلائے گئے لیکن صبح ہوتے ہوتے شیرکوہ رخصت ہو چکا تھا۔ وہ مر گیا۔

طبیبوں نے اس کی موت کا سبب اس کی بسیار خوری کو قرار دیا۔

شیرکوہ کی موت کو لوگوں سے مخفی رکھا گیا لیکن العاضد کو مطلع کر دیا گیا کیونکہ شیرکوہ کی موت سے مصری

وزارت عظمیٰ کی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ العاضد شیرکوہ جیسے کھگڑ سے ذرا خوفزدہ بھی رہا تھا۔ لیکن جب اس کے مرنے کی خبر سُنی تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

جیلیا بھی بہت خوفزدہ تھی۔ تقدیر اس کے خلاف تھی۔ شیرکوہ کی بے وقت اور اچانک موت نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ اب وہ محلسرا میں واپس بھی نہ جا سکتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب شیرکوہ کے بعد وزیراعظم کسے بنایا جائے گا۔ وہ یہ بھی خوب سمجھ رہی تھی کہ فاطمی ہرکارے قاہرہ کے گلی کوچوں میں اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اسے اس بات کا بھی ملال تھا کہ شیرکوہ نے اس کو جس غرض سے بلایا تھا اسے بتائے بغیر ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنا مایوس کن وقت کبھی بھی نہ آیا تھا۔

شیرکوہ کی تجہیز و تکفین کے بعد صلاح الدین ایوبی جیلیا کے پاس پہنچا اور سوگوار لہجے میں دریافت کیا۔ "اب تُو کہاں جانا پسند کرے گی؟"

جیلیا نے رقت سے جواب دیا۔ "تیرے چچا شیرکوہ نے مجھ سے کچھ وعدے کئے تھے ان وعدوں کی رُو سے تیرے چچا کا گھر میرا گھر تھا لیکن اب ان کا ذکر ہی فضول ہے!"

صلاح الدین ایوبی نے کہا "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟ کیا تجھے محلسرا واپس بھیج دیا جائے؟"

جیلیا روہانسی ہو گئی۔ "نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں محلسرا سے چوروں کی طرح فرار ہو کر آئی ہوں۔ اب وہاں واپس نہیں جا سکتی۔"

"پھر؟" صلاح الدین نے مختصر سا سوال کیا۔

"کچھ دنوں کے لئے مجھے اپنی پناہ میں رکھ، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ تو نہیں جانتا کہ قصرِ فاطمی کے شکاری میری تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہوں گے!"

صلاح الدین اس پر رضامند ہو گیا۔ جیلیا اس کے مرحوم چچا کی امانت تھی اور اس امانت کی حفاظت اس کا فرض اور اس کی ذمہ داری تھی۔

دوسری طرف العاضد کے آدمی واقعی نہایت خاموشی اور سرعت کے ساتھ جیلیا کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

وزارت عظمیٰ کا عہدہ زیادہ دنوں تک خالی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ خلافت بغداد کے جو جنرل اس وقت قاہرہ میں موجود تھے۔ ان کی فہرست العاضد کے سامنے پیش کر دی گئی۔ العاضد نے بوڑھے تقی کو اس کام پر مامور کیا کہ ان جنرلوں کے آگے ان کی عمریں بھی لکھ دی جائیں۔ اس فہرست کا آخری نام صلاح الدین ایوبی تھا اور دوسرے جنرلوں کے مقابلے میں سب سے کم عمر بھی۔ یعنی صرف تیس سال۔

العاضد نے بوڑھے اتالیق سے دریافت کیا: "اس فہرست کے کس جرنل کو مصر کی وزارت عظمیٰ سونپی جائے گیا تو بتا سکتے ہے؟"

بوڑھے اتالیق نے فہرست کو بغور پڑھا پھر عرض کیا: "شیرکوہ کے بھتیجے صلاح الدین کو۔"

العاضد نے دریافت کیا: "کیوں؟ کیا یہ نوعمر جوان وزارت عظمیٰ جیسے بھاری بوجھ کو اٹھا لے گا؟"

بوڑھے اتالیق نے جواب دیا: "یہ وزارت عظمیٰ کا بوجھ اٹھا سکے یا نہ اٹھا سکے لیکن یہ ضرور ہے کیونکہ یہ نوجوان ہے اس لئے کچھ نہ کچھ نا سمجھ بھی ہوگا۔ اس کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے امیر المومنین با آسانی قابو برقرار رکھ سکیں گے لیکن کسی تجربہ کار اور عمر رسیدہ جرنل پر آپ بالکل حکومت نہ کر سکیں گے۔"

بوڑھے اتالیق کی باتیں درست تھیں۔ العاضد نے خلعت فاخرہ اور اعلان خلافت کے ذریعے صلاح الدین کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کر دیا۔ عمر رسیدہ جرنلوں نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا لیکن صلاح الدین ایوبی نے حسن تدبیر سے اپنے خلاف احتجاج کو بے اثر کر دیا۔

جلیلیا پھر خوش ہو گئی۔ اس کی شوخی ایک بار پھر عود کر آئی جیسے جوان ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ ادھیڑ عمر شیرکوہ کی موت بہت ضروری تھی۔ جب لوگ شیرکوہ کی آغوش میں اسے دیکھتے تو کیا کہتے؟ اور صلاح الدین؟ یہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ وہ گھنٹوں صلاح الدین کے تصور اور انتظار میں بیٹھی رہتی لیکن اب اس کی شکل تک نہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ وزارت کی ذمہ داریوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ جلیلیا کو یہاں کوئی تکلیف بھی نہ تھی۔ لیکن تنہائی اور صلاح الدین کی بے التفاتی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نوجوان کی تسخیر سب سے مشکل نظر آ رہی تھی۔

العاضد کے آدمی جلیلیا کی تلاش سے اکتا گئے۔ خود العاضد جلیلیا کی جدائی سے مغموم رہنے لگا اور بوڑھا تقی جلیلیا کے بارے میں لب تک کھولنا گناہ سمجھتا تھا وہ اس لڑکی سے ڈرنے لگا تھا۔

اس طرح کچھ عرصہ گزر گیا اور جلیلیا بے کیفی کا شکار ہو گئی۔

لیکن حالات نے یک بیک پلٹا کھایا اور جلیلیا اور صلاح الدین ایوبی کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ صلاح الدین گھبرا گیا۔ بغداد سے اس کے باپ کا ایک خط آیا جس میں اس سے جواب طلب کیا گیا تھا کہ "بیٹے! جوانی اور رسوائی لازم و ملزوم ہیں لیکن کیا سچ مچ تو نے رسوائی کا سامان اپنے گھر میں رکھ چھوڑا ہے؟"

صلاح الدین ایوبی کو شرم آ گئی وہ اپنے باپ کا خط لے کر جلیلیا کے پاس پہنچ گیا اور دریافت کیا۔

"اب حالات پرسکون ہیں تو نے اپنی بابت کیا فیصلہ کیا؟"

جیلیا کو غصہ آگیا عجیب بدمذاق اور جذبات سے عاری نوجوان ہے تاہم مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"تیرے چچا نے میری جو قیمت متعین کی تھی کیا تیری نظر میں وہ غلط تھی ؟"
صلاح الدین ایوبی اس ذہین لڑکی کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے اپنے باپ کے خط کا مضمون پڑھ کر جیلیا کو سنایا اور کہا۔ "صرف یہی نہیں میرے آس پاس بھی اسی قسم کی سرگوشیاں ہونے لگی ہیں!"
جیلیا نے شریر مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "تیرے باپ نے ٹھیک ہی تو لکھا ہے کہ جوانی اور رسوائی لازم و ملزوم ہیں۔ جوشِ جوانی کا مقدر ہو اس سے گھبرانا کیا؟"
صلاح الدین نے دل برداشتہ ہو کر کہا "میں چچا مرحوم کی وجہ سے تیری عزت کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تو خود بھی اسے برقرار رکھ!"
ابھی بات چیت جاری تھی کہ صلاح الدین ایوبی کو اطلاع ملی، العاضد اپنے وزیر اعظم سے محل کے اندر ملاقات کرنا چاہتا ہے جو وفد یہ پیغام لے کر آیا تھا بوڑھا قتی اس کا سربراہ تھا۔ صلاح الدین نے وفد کو باہر ہی ٹھہرایا اور جیلیا سے مشورہ کرنے اندر آگیا۔ اپنے مختصر دورِ وزارت میں پہلی بار صلاح الدین کو جیلیا کی اہمیت اور ضرورت محسوس ہوئی تھی۔
اس نے جیلیا سے دریافت کیا "تو محلسرا کی سیاست سے اچھی طرح واقف ہے۔ العاضد مجھ سے اپنے قصر میں ملاقات کا متمنی ہے مجھے مشورہ دے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"
جیلیا کے دل میں اُمیدیں پھر جاگ اُٹھیں، صلاح الدین اس سے مشورہ کر رہا تھا اس نے جواب دیا۔
"انکار کر دے یہ ضرور کسی سازش کا حصہ ہے۔ وہاں سے تیری واپسی مشکل ہو جائے گی۔"
صلاح الدین نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور حیلے حوالے کر کے وفد کو واپس کر دیا۔
جیلیا نے بڑی کوشش کی اور غمزہ و ادا کے جتنے تیر تھے صلاح الدین پر سارے ہی آزما ڈالے لیکن ناکام رہی۔ صلاح الدین جیلیا کے حُسن، دلکشی، صحت، توانائی، ذہانت و فطانت کا دل سے قائل تھا۔ لیکن اسے مستقلاً اپنانے پر آمادہ نہ تھا جیلیا صلاح الدین سے وابستہ ہو کر مصر پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ خواب منتشر ہو گیا۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئی اور صلاح الدین کے دل میں جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ایک بار پھر قصرِ فاطمی پہنچنا چاہیئے۔ اور اگر وہ العاضد کو ایک بار پھر بہلا پھسلا سکی تو وہ ہر ممکن کوشش سے صلاح الدین کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹوا دیگی!
اس نے صلاح الدین سے کہا۔ "میں محلسرا واپس جانا چاہتی ہوں!"
صلاح الدین نے حیرت سے پوچھا۔ "محلسرا؟ کیا تجھے اس کا یقین ہے کہ وہاں تجھے کوئی گزند

نہ پہنچے گا؟"

جیلیا نے جلے کٹے لیکن قدرے سوگوار لہجے میں جواب دیا "میں زندگی سے بیزار ہوں۔ اگر وہاں پہنچ کر قتل کر دی گئی تو میرا یہ انجام میری توقع کے خلاف نہ ہوگا۔ اگر زندہ رہ گئی تو بے کیف زندگی پر قناعت کر لوں گی۔"

صلاح الدین نے کہا۔ "تیری مرضی۔"

جیلیا نے دھمکی دی۔ "لیکن اگر میں محلسرا میں زندہ بچ گئی تو پتا نہیں کس کس کے لئے وبال جان بن جاؤں، میں ناکامی کا زخم برداشت نہیں کر سکتی۔"

لیکن صلاح الدین پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جیلیا محلسرائے خلافت میں داخل ہو گئی۔ لیکن جب وہ العاضد کو مستقل اپنا لینے کے ارادے سے اس کے پاس پہنچی تو وہ زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ بیسواں اور آخری سال تھا۔ اس نے حسرت آمیز نظریں جیلیا پر ڈالیں۔ اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد العاضد کی دونوں آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ بوڑھے اتالیق نے اس کے چہرے پر چادر ڈال دی اور محلسرا کے درودیوار سے گریہ و بکا اور آہ و زاری کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

بوڑھے تقی کی آنکھیں بھی نمناک تھیں، اس نے جیلیا کو جن نظروں سے دیکھا ان میں ایک پیام تھا، ایک سوال تھا ایک پرسش تھی۔ "بول، اب تیرا کیا خیال ہے؟"

جیلیا کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا جو اسے ہلائے دے رہا تھا۔ اس کا اپنی بدنصیبی اور محرومی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا تھا لیکن اسے اس پر بھی قدرت حاصل نہ تھی۔

بوڑھا تقی اسے وہاں سے ہٹا لے گیا اور ایک محراب کی آڑ میں کھڑے ہو کر کہنے لگا۔ "اے سرزمین مصر کی حسین لیکن بدقسمت ترین لڑکی! خدا نے تجھے بے مثال حسن اور بلا کا ادراک بخشا تھا لیکن تو ان دونوں کو جاہ طلبی کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بے دریغ خرچ کرتی رہی۔ اور یہ بھول گئی کہ ماورائے حسن اور ماورائے عقل جو کچھ ہے اس پر تیرا کوئی اختیار نہیں تو ان خواہشات کے پیچھے بھاگتی رہی جن سے تیری تقدیر محروم ہے۔ تو نے اپنی ہر کوشش اور ہر جدوجہد میں طمع اور بے صبری کو پیش پیش رکھا اور نتیجۃً ان کی حصولیابی میں ناکام رہی۔ ایک ایسی کوشش جس میں قناعت نہ ہو ابھی طرح ناکام اور اذیت ناک رہتی ہے۔"

جیلیا روہانسی ہو گئی۔ بھرائی آواز میں بولی "میں ناکام رہ کر زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ میں خودکشی

کر لوں گی۔"

بوڑھے تقی نے جرأت سے کام لے کر اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "خودکشی کے مقابلے میں یہ بوڑھا کچھ زیادہ بُرا نہیں ہے۔ محبت اور جذبۂ پرستش سے لبریز محبت صرف ایک بوڑھے کے دل میں ملے گی۔ نوجوانوں کے دل ارمانوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں جبکہ ایک بوڑھے دل میں حسرت و یاس کے سوا کچھ بھی نہ ملے گا۔ بس وہ خواہش ترک کر دے اور اس بوڑھے پر قناعت کر۔ بہتر ہے کہ تیری شکست تیرے ساتھ رہے۔"

جمیلہ نے تقدیر اور مشیت الٰہی کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

بوڑھا محلسرا کی پُرپیچ راہوں سے گزرتا ہوا جب جمیلہ کو لے کر اپنے گھر جا رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حُسن، دلکشی، دانائی اور بزرگی سبھی کچھ اس محلسرا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور پھر واقعی قصر فاطمی نے اپنی مجلہ رونقیں کھو دیں اور خلافت فاطمی خلافت عباسی میں ضم ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

خانِ اعظم کا تحفہ

خانِ اعظم چنگیز خان صحرائے گوبی کے اُس پار قراقرم میں بیٹھا اقوامِ عالم کو زیر و زبر کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ اسے حسین تحفہ پیش کیا گیا۔ لیکن اس تحفے کی نحوست نے خانِ اعظم کو خوفزدہ کر دیا اور اس نے یہ حسین تحفہ کسی اور کے حوالے کر دیا اور یہ تحفہ جس کسی کو بھی ملا وہ عجیب و غریب حالات اور واقعات کا شکار ہوتا رہا۔ ایک تاجر، خانِ اعظم اور منگولوں کی حقیقی، ناقابلِ یقین اور دلچسپ داستان

مجھے قراقرم کی صحرائی بستی میں میری طمع کھینچ کے لے گئی تھی۔ وہ سنسان، بنجر اور بے آب و گیاہ ویرانے میں جانے کی کس میں ہمت تھی۔ یہاں دن رات ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہتے اور ریت کے تودے اپنی جگہ بدلتے رہتے۔ کالی کالی ریت ہواؤں کے دوش پر ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر اُڑتی پھرتی۔ قراقرم جس کے معنی ہیں سیاہ ریت، دُنیا کے سب سے بڑے خونخوار فاتح چنگیز خان کا عجیب و غریب مستقر تھا۔ یہاں اس کا لشکر اپنے خیموں اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

میں کئی سال سے تاجروں کی زبانی یہ سنتا چلا آ رہا تھا کہ خانِ اعظم مال کا معاوضہ بہت اچھا دیتا ہے۔ میں نے بھی سفید کپڑا، زنجیر دار زرہیں، عمدہ مینگ تلواریں اور کچھ شیشے کا سامان لیا اور قراقرم چل دیا۔ میرے قافلے میں دو سو سے زیادہ آدمی تھے۔ ان میں کچھ تاجر تھے کچھ ان کے غلام اور باقی وہ لوگ تھے جن کے گھر قراقرم کی راہ میں پڑتے تھے۔

قراقرم پہنچتے پہنچتے قافلے میں تقریباً سو سوا سو آدمی رہ گئے تھے۔ دُور ہی سے گارے اور پھونس کے جھونپڑے نما مکانوں کے روشن دانوں سے دھواں نکلتا دکھائی دیا۔ خانِ اعظم کے آدمیوں نے بستی میں داخلے سے پہلے ہی ہمیں روک دیا۔ مختلف نوعیت کے سوالات کیے اور جب انہیں ان کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات مل گئے تو انہوں نے ہمیں سرائے تک پہنچا دیا اور ہمارے ساتھ ان کا رویّہ اس قسم کا ہو گیا گویا اب ہم قانون اور ذمّہ دار حکومت کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔

سرائے کے قریب ہی پتھروں کی بنی ہوئی مسجد تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک گرجا تھا۔ مغرب کا وقت قریب قریب تھا۔ میں نے سرائے میں اپنا سامان اُتارا اور مغرب کی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ نماز کے دوران طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ خانِ اعظم کے بارے میں متضاد باتیں سننے میں آ رہی تھیں کچھ یہ کہتے تھے کہ خانِ اعظم کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا اور کچھ کا یہ کہنا تھا کہ خانِ اعظم کے نزدیک انصاف اور ناانصافی کوئی چیز نہیں بلکہ اس کی ہر بات قانون اور انصاف ہوتی ہے۔

کئی دن بعد ہمیں خانِ اعظم کی خدمت میں باریابی کی اجازت ملی۔ میرے ساتھ کچھ اور تاجر بھی تھے ہمیں باریابی سے پہلے خانِ اعظم کی خدمت میں تحائف پیش کرنا پڑے۔

ہمارے راہنما جب ہمیں چنگیز خان کے ریشمی اور سمور کے عظیم الشان یورت (خیمہ) کی طرف لیے جا رہے تھے تو ہمارے آس پاس دُور تک آگ کے الاؤ جلا دیے گئے تھے ہم ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی چھوٹی سی پگڈنڈی پر احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے۔ خانِ اعظم اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر آنے والے پر کسی قسم کے جادو کا اثر ہے تو وہ اس طرح جل کر ضائع ہو جائے گا۔ ہم سب بخیر و خوبی آگ کے اس پل صراط

سے گزر گئے۔ اس کے بعد ہمیں خانِ اعظم کا وہ خیمہ دکھائی دیا جس کا دروازہ جنوب میں کھلتا تھا۔

دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک منگول سردار نے ہماری تلاشی لینی شروع کر دی وہ دراصل اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ ہمارے پاس ہتھیار قسم کی کوئی چیز تو نہیں ہے۔ ہم بالکل نہتے تھے اطمینان کر لینے کے بعد اس سردار نے یورت کے دروازے پر پڑی ہوئی چاندی کی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ گدھی کا دودھ، پھل اور گوشت حاضر ہیں اگر تمہیں بھوک لگ رہی ہو تو بلا تکلف کھا سکتے ہو۔"

لیکن ہمیں کچھ کھانا نہیں تھا اس لیے انکار سے نفی میں گردن ہلا دی۔

خانِ اعظم کو ہماری آمد کی اطلاع دی گئی اس نے ہمیں باریابی کی اجازت دے دی جب ہمیں خانِ اعظم کے یورت میں داخلے کی اجازت ملی تو اس منگول سردار نے ہمیں ایک نیا حکم سنا دیا اس نے رعب دار آواز میں کہا۔

"خبردار یورت میں داخل ہوتے وقت اس کی دہلیز کو مس نہ کرنا۔ خبردار! اندر پہنچنے کے بعد یورت کی رسیوں کو ہاتھ مت لگانا۔ اور خبردار! خانِ اعظم سے گفتگو کے دوران دو زانو ضرور ہو جانا اور جب تک خانِ اعظم تمہیں واپسی کی اجازت نہ دے اپنے آپ سے ہرگز نہ چل کھڑے ہونا۔"

خانِ اعظم کا یورت ریشمی استر اور سفید سمور سے تیار ہوا تھا۔ ہم جب اندر داخل ہوتے تو ہمیں اپنے سامنے دور سامنے کنارے کی ایک اونچی چوکی پر خانِ اعظم براجمان نظر آیا۔ اس کے بائیں جانب ذرا نیچے اس کی چہیتی بیوی بورتہ بیٹھی ہوئی تھی۔

سامنے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بچھی ہوئی چوکیوں پر خانِ اعظم کے امرا اور سردار بیٹھے ہوئے تھے انہی میں ملک ختا کا شہزادہ اور فلسفی یلیو چیت سائی بھی تھا جو اپنے لمبے قد اور لمبی داڑھی کی وجہ سے دور سے پہچانا جاتا تھا پہلے یہ ختا والوں کی طرف سے چنگیز خان سے جنگ لڑا تھا اور شکست کھانے کے بعد جب یہ گرفتار ہوا تو چنگیز خان نے اس سے دریافت کیا تھا "جب تجھے یہ معلوم تھا کہ تیری قوم کو شکست ہو جائے گی تو تو نے میرے خلاف جنگ کیوں کی تھی؟"

یلیو چیت سائی نے جواب دیا تھا۔ "ختا کے ہم پر کچھ حقوق واجب تھے اور ان کی ادائیگی بہرحال ہم پر فرض تھی"

چنگیز خان اس کے اس جواب سے بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے یلیو چیت سائی سے کہا تھا۔ "اگر تم چاہو تو اپنی وفاداریاں ہماری طرف منتقل کر دو۔"

یلیو چیت سائی اس پر آمادہ ہو گیا اور مرتے وقت تک اس عہد پر قائم رہا اور یہی یلیو چیت سائی تھا جس نے جہاں گرد چنگیز خان کو ایک بار یہ مشورہ دیا تھا کہ

"خانِ اعظم سلطنت کو تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر فتح کر رہا ہے اس پر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر حکومت

نہیں کر سکتا۔"

اور خانِ اعظم طویل القامت اور دراز ریش قسطی کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔
چنگیز خان سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ اس نے ہمارے مال کے نمونے دیکھے اور انہیں بہت پسند کیا۔ اس نے ان کی قیمتیں پوچھیں ہمارے ساتھیوں نے طمع میں آ کر بڑھا چڑھا کر ان کی قیمتیں بتا دیں۔ چنگیز اس پر اتنا برافروختہ ہوا کہ اسی وقت دربار میں موجود ترخانوں کو حکم دیا کہ ان تاجروں کے ساتھ سختی سے نپٹا جائے اور ان کے سارے مال اسباب پر قبضہ کر لیں۔ اور اس پر پورا پورا عمل کیا گیا۔

اس کے بعد خان نے ہماری چیزیں دیکھیں اور ان کی قیمتیں دریافت کیں۔ میں اپنے ساتھی تاجروں کا حشر دیکھ چکا تھا اس لیے عافیت اسی میں جانی اور میں نے اپنی ہر چیز خانِ اعظم کو تحفتہً بخش دی۔ خانِ اعظم ہماری اس بات سے بہت خوش ہوا اور اس نے خوشی سے ہمیں اتنا انعام و اکرام عطا کیا جو ہمارے مال کی مجموعی قیمت سے کئی گنا زیادہ تھا۔

خانِ اعظم نے اپنے سامنے پڑی ہوئی ایک خالی چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔
"تم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو؟"
میں نے جواب دیا "میں مسلمان ہوں۔" اور چوکی پر بیٹھ گیا۔
چنگیز خان نے جستجو آمیز لہجے میں کہا "تم اپنے مذہب کے بارے میں ہمیں کچھ بتاؤ۔ ہم کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"
میں نے اپنے مذہب اسلام کے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں خانِ اعظم کے گوش گزار کر دیں اور آخر میں خانہ کعبہ کے بارے میں خاص طور پر بتایا کہ یہ اللہ کا گھر ہے جہاں ہر سال دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان حج کرنے کی نیت سے پہنچتے ہیں۔
چنگیز خان مسکرایا اور شراب کا ایک جام چڑھاتے ہوئے بولا۔ "تو اس دنیا کا خدا میرے سوا اور کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔"
لمحے چند منگول ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کو کھینچتے ہوئے دربار میں داخل ہو گئے۔ خانِ اعظم کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑ گئے۔ اس نے دریافت کیا۔
"یہ کون ہے۔؟"
ایک پستہ قامت اور گول مٹول منگول نے جواب دیا "یہ آپ کے دشمن اوراذنگ خان کی پوتی ہے۔ یہ وقت ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے۔"
چنگیز خان نے حقارت سے منہ پھیر لیا اور نفرت سے کہا اوراذنگ خان کا انتقام اس کی پوتی سے؟

ارے کوئی ہے جو اس لڑکی کو مجھ سے مانگ لے۔"

لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی جو اس لڑکی کو چنگیز خان کی مرضی اور اجازت کے باوجود مانگ لیتا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی کسی چیز کو دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ میں داب کر چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنگیز خان نے بھی لڑکی کی اس بات کو محسوس کر لیا اور منگول کو حکم دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلوا کر معلوم کرو کہ ان میں کیا ہے؟ یہ کیا چیز چھپا رہی ہے؟"

جب منگول سپاہیوں نے اس لڑکی کے دونوں ہاتھ زبردستی قابو میں کر لیے تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ ایک شیشے کا کنٹھا ہے۔ جو بہت خوبصورت ہے۔ اس پر قدیم مصری زبان کا ایک مقولہ کندہ تھا۔

"ذلتیں تمہارے عقب میں ہیں۔"

چنگیز خان نے اس عبارت کا ترجمہ دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ قدیم مصری زبان ہیرا غلافی کا ایک مشہور مقولہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "محض عزتوں کے خمار میں در رہو۔ ذلتیں بھی تمہارے عقب میں ہیں۔"

چنگیز خان اس عبارت سے بہت خوش ہوا اور اس نے وہ کنٹھا اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنا شروع کیا اسی دوران اس کی نظریں اس لڑکی پر جم گئیں۔ یہ ایک مجسمہ حسن و رعنائی تھا۔ خانِ اعظم کی نیت بدل گئی۔ اس نے منگول سپاہی کو حکم دیا۔

"اسے ہمارے خیمے میں پہنچا دو۔ اسے ہم رکھیں گے۔"

وہ حسین لڑکی چنگیز خان کے خیمے میں پہنچا دی گئی۔

جب میں خانِ اعظم کے یورت سے نکل کر سراتے واپس آرہا تھا تو دو منگول میرے ساتھ اس غرض سے کر دیے گئے تھے کہ میں خان کی پسندیدہ چیزیں ان کے حوالے کر دوں۔ راستے میں ان دونوں منگول سپاہیوں نے اس لڑکی کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ ان کی باتیں بہت عجیب اور چونکا دینے والی تھیں۔

ایک منگول نے دوسرے سے کہا "تم دیکھنا یہ لڑکی خانِ اعظم کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔"

دوسرے نے دریافت کیا "کیوں؟"

پہلے منگول نے جواب دیا "میں نے لوگوں سے سن رکھا ہے کہ یہ لڑکی جس دہلیز پر جائے گی۔ وہ دہلیز کبھی سرسبز نہ ہوگی۔ اس لڑکی نے اب تک پانچ مردوں اور دو خاندانوں کا بیڑا غرق کیا ہے۔"

دوسرے منگول نے فکرمندانہ انداز میں کہا "تب تو میں خانِ اعظم کو اس کی نحوست سے آگاہ ضرور کر دوں گا۔"

لیکن اس کے آگاہ کرنے سے پہلے ہی خانِ اعظم اس کی نحوست کا شکار ہو چکا تھا۔

اس رات چنگیز خان دیر تک جاگتا رہا۔ اس کی طبیعت بلاوجہ افسردہ ہوگئی تھی۔ مزاج میں چڑچڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ تھی۔ اس کی سب سے چہیتی بیوی یورتہ بھی اس کی بدمزاجی سے ڈری ہوئی تھی۔ دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ خانِ اعظم چپ چاپ اپنے یورت سے باہر نکلا گھوڑا سنبھالا اور اس کی پشت پر سوار ہوکر آبادی سے باہر چلا گیا اور وہاں جو سب سے اونچا ٹیلا تھا اس کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے کود پڑا اور پیدل ٹیلے کے اوپر چڑھنے لگا۔ ٹیلے کے اوپر چڑھ چکنے کے بعد اس نے سنسان اور ویران آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اس طرح پھیلا دیئے کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان کافی فصل پیدا ہوگیا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"اور نیلے آسمان کے جاودانی خدا! میں نے دنیا کو اپنے قدموں میں گرا لیا ہے لیکن میرا اپنا دل میرے لئے اب تک ناقابلِ تسخیر ہے۔ اگر یہ ملول ہوتا ہے تو میں اپنی مرضی سے اسے خوش نہیں رکھ سکتا اور اگر یہ خوش ہوتا ہے تو اسے جبر کے ساتھ افسردہ کر دینے پہ قدرت نہیں رکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟"

اسی لمحے اس نے دو سایوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کی مناجات یک لخت ختم ہوگئی اور وہ آنے والوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ رات کی تاریکی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں آنے والے سایوں سے زیادہ نہیں نظر آتے تھے انہوں نے چنگیز خان کو نہیں دیکھا تھا لیکن جیسے ہی ان کی نظریں چنگیز خان کے سائے پر پڑیں وہ تیزی سے واپس ہوئے اور دوڑ کر ٹیلے سے نیچے اترنے لگے۔ خانِ اعظم نے انہیں للکارا

"ٹھہرو۔ بھاگو مت!"

خانِ اعظم کی آواز نے ان میں اور زیادہ سراسیمگی اور دہشت پیدا کر دی اور ان کے بھاگنے کی رفتار اور زیادہ تیز ہوگئی۔

چنگیز خان نے ان کا پیچھا کیا۔ بھاگنے والے تیزی سے نشیب میں اترتے چلے جارہے تھے چنگیز خان کی معاملہ فہم حس نے محسوس کر لیا کہ ٹیلے کے نیچے ان دونوں کے گھوڑے موجود ہیں اور یہ دونوں ان پر بیٹھ کر فرار ہو جائیں گے۔

اس نے پہلو سے خنجر نکالا اور تاک کر ایک کو نشانہ بنا لیا اور ساتھ ہی پُرہیبت آواز میں چیخا۔ "ٹھہرو!"

چنگیز کی آواز کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ ویرانے میں گونج گئی۔ "آہ۔ مار دیا۔"

دوسرا سایہ چنگیز خان کی طرف منہ کر کے زمین بوس ہوگیا اور التجا کی "خانِ اعظم رحم!" چنگیز خان ششدر اور پریشان خاطری سے آگے بڑھا یہ آواز تو اس کی بیوی یوچیہ کی تھی۔ یوچیہ ختائی کی ایک امیرزادی تھی۔ معلان

دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ زخمی نے بھی رحم کی درخواست کی "خانِ اعظم رحم!"
یہی معاملہ خانِ اعظم کے زیرِ غور تھا کہ چند گھڑ سوار اور پہنچ گئے۔ یہ خانِ اعظم کے جاں نثار ذاتی محافظ منگول تھے ان میں لیوچیت ساتی بھی تھا۔ سبھی لپک کر اپنے گھوڑوں سے کود پڑے اور خانِ اعظم کو اپنے سائے میں لے لیا۔
چنگیز خان نے انہیں حکم دیا۔ "ان دونوں کو میرے خیمے میں لے چلو۔" خانِ اعظم کی آواز میں ارتعاش بھی تھا اور افسردگی بھی، برہمی بھی اور خفگی بھی، ذرا سی دیر میں پوری بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کی حسین اور خوبرو یوچیہ کسی منگول سے عشق لڑا رہی تھی وہ مشتعل تھا اتنا مشتعل کہ ان دونوں کو اسی وقت قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن دراز ریش لیوچیت ساتی نے اسے سمجھایا۔
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اونگ خان کی پوتی، جسے خانِ اعظم نے اپنے حرم میں ڈال لیا۔ بڑی منحوس ہے اس سے پہلے بھی یہ پانچ مردوں اور دو خاندانوں کو تباہ و برباد کر چکی ہے۔"
خانِ اعظم نے کرخت لہجے میں کہا "چپ رہو اور دراز ریش مسخرے یوچیہ کے سفلے عشق کا اونگ خان کی پوتی کی نحوست سے کیا تعلق ہوا؟"
لیوچیت ساتی ہمت کر کے بولا "بجا ارشاد لیکن یہ اس کی نحوست ہی تو ہے کہ اس نے یورت میں داخل ہوتے ہی خانِ اعظم کو لکر مند اور ملول کر دیا۔"
"ٹھیک!" خانِ اعظم نے فوراً بات تسلیم کر لی۔
"پھر ان دونوں کو کیا سزا ملنی چاہیئے؟"
لیوچیت ساتی نے جواب دیا۔
"خانِ اعظم کو سفلہ جذبات والی عورت سے نجات حاصل کر لینی چاہیئے۔"
اور جب یہ لوگ خانِ اعظم کے یورت میں داخل ہوئے اور اس نے زخمی منگول کو دیکھا تو اسے بہت افسوس ہوا یہ تو ایک بالکل غیر معروف فوجی تھا اس مقدمے کے فیصلہ میں دیر نہ لگی۔ بالکل غیر متوقع طور پر چنگیز خان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
"تم دونوں میرے پاس سے دفعان ہو جاؤ۔ یہ میری غلطی تھی کہ ایسے ذلیل جذبات والی لڑکی میں نے اپنے لئے چنی تھی۔"
صبح سے کچھ پہلے خانِ اعظم کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب دیکھا۔
وہ اپنے لشکر کے ساتھ نو دُموں والا ایک کا پرچم لیے ایک ایسی سرزمین میں داخل ہو گیا ہے جہاں قراقرم یا گوبی کی ریت کا دُور دُور تک پتا نہیں، جہاں برف نہیں گرتی، جہاں دریا ہمیشہ بہتے رہتے ہیں اور جہاں کے باغات ثمردار درختوں سے بھرے ہوئے ہیں جہاں اونچی اونچی عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور جہاں کی آبادی بہت کاریگر ہے اور لوگ کتابیں لکھتے ہیں ہر طرف عیش و عشرت کا سامان موجود ہے خانِ اعظم نے دیکھا کہ وہ اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے

سے داخل ہو گیا ہے۔ لوگوں نے شہر کے دروازے کھول دیے تھے اور آگے بڑھ کر اسے قیمتی تحفے تحائف پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اسی دوران ایک طرف سے بے ہنگم شور و غل بلند ہونے لگتا ہے اور پھر منگولوں کی تلواریں نیام سے باہر ہو جاتی ہیں اور جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اس حملے میں منگولوں نے پہل نہیں کی تھی بلکہ دھوکے سے ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ عین اس وقت جب کہ چنگیز خان معززین شہر سے تحفے تحائف وصول کر رہا تھا۔ شہر کی حفاظت پر مامور ایک فوجی دستے نے اس کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا۔ خانِ اعظم کو غصہ آ گیا اور ان مٹھی بھر حملہ آوروں کو ذرا سی دیر میں ٹھکانے لگا دیا گیا۔

خانِ اعظم کا عتاب اس وقت نمودار ہوا جب پوری آبادی تہہ تیغ کی جا چکی اور عمارتیں جل جلا کر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ اس کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان حملہ آوروں کے پیچھے معززین شہر کی سازش کارفرما تھی پھر یہاں سروں کے منارے کھڑے کیے گئے اور سبزے پر جشن طرب برپا ہوا خانِ اعظم جام پر جام چڑھا رہا تھا کہ دراز ریش یہ جیت سائی چوروں کی طرح حاضر ہوا اور اس کے ہاتھ کے اشارے سے اس کو خیمے یورت کی طرف بلایا گیا۔ یہ جیت سائی نے یورت کے ایک چھوٹے سے سوراخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خانِ اعظم سے کہا۔

"خانِ اعظم! ہوشیار خبردار! خانِ اعظم ہوشیار!"

خانِ اعظم نے یورت کے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں اس کی دوسری چہیتی بیوی سالگی اس کے مفتوح دشمن فوجی افسر کے ساتھ بیٹھی ہوئی خانِ اعظم کے قتل کی سازش کر رہی تھی چنگیز خان برداشت نہ کر سکا اور تلوار کھینچ کر یورت میں داخل ہو گیا لیکن سالگی نے نہایت پھرتی سے چنگیز کے سر پر قالین ڈال دی جس سے وہ بے بس ہو گیا۔ اور اس کے دشمن نے قالین کے اوپر تلوار کا بھرپور وار کیا۔

خانِ اعظم غدار سالگی کو برا بھلا کہتا ہوا بیدار ہو گیا۔ اس نے آواز دی۔ "اس وقت یورت پر کس کا پہرا ہے اندر آؤ۔"

ایک بد وضع، بھیانک اور داغدار چہرے والا منگول تو دیلا اس کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا اور جھک کر خانِ اعظم کے درباری آداب ادا کیے۔ خانِ اعظم نے پوچھا۔ "تمہارا افسر کون ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "بغورچی!"

خانِ اعظم نے حافظے پر زور دیتے بغیر سوال کیا۔ "یہ بغورچی وہی ہے نا جو میرے ساتھ چرائے ہوئے گھوڑوں کی واپسی کے سلسلے میں تین دن اور تین راتیں سفر کر چکا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

خانِ اعظم نے اسے حکم دیا۔ "بغورچی کو اسی وقت اور اسی لمحے میرے پاس حاضر کرو۔"

ذرا سی دیر میں بغورچی خانِ اعظم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت خانِ اعظم بہت پریشان تھا اس نے

اسی وقت اپنی بیوی ساگی کو گرا ہیجان خلافِ معمول علی پر بہت پریشان ہوتی جب وہ آگئی تو چنگیز نے اسے غصے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے حکم سنایا۔

"ساگی! تو آج سے بغورچی کی بیوی ہے۔ میں تجھے اسی وقت الگ کرتا ہوں۔"

اور بغورچی کو حکم دیا "بغورچی! ساگی آج سے تیری بیوی ہے میں غدار اور مشتبہ بیوی ہرگز نہیں رکھ سکتا اور دیکھو تم بھی اس سے ہوشیار رہنا یہ بہت خطرناک ہے۔"

ساگی حیران تھی کہ اس نے کون سی غداری کی ہے جس کی اسے یہ سزا دی جا رہی ہے اور بغورچی مذبذب لیکن خوش تھا کہ خانِ اعظم کی حسین بیوی ساگی اسے انعام میں مل رہی ہے۔

خانِ اعظم نے ساگی کے ساتھ ہی بغورچی کو اپنے یورت کی پہریداری سے بھی الگ کر دیا اب اسے ان دونوں میں سے کسی پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔

ریشمی اور سفید سمور کے یورت میں جب خانِ اعظم نے پھر دربار لگایا تو اس وقت اپنی نوعیت کا عجیب مقدمہ پیش تھا اونگ خان کی حسین و جمیل پوتی اپنے شیشے کے خوبصورت کنٹر کے ساتھ مجرموں کی طرح حاضر تھی ایک طرف خان کی بیوی لبورتہ بیٹھی تھی دوسری طرف جرأت مند لبوچیت ساقی اور اس سے چار ہاتھ کے فاصلے پر ہنسنے ہنسانے والا بوڑھا قربان تھا۔ قربان کی عمر ۷۰ سال سے کم نہ تھی داڑھی میں چند بال تھے آگے کے کئی دانت ٹوٹ چکے تھے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، پیشانی تنگ، سر کے بال غائب، ناک پچکی ہوئی۔ ٹھوڑی مثلث کی طرح نوکدار۔

خانِ اعظم نے اونگ خان کی پوتی سے دریافت کیا "کیا تو واقعی بہت منحوس ہے؟"

لڑکی نے بھولے پن سے جواب دیا "لوگ کہتے ہیں۔"

چنگیز اس کی بات کاٹتا ہوا بولا "لوگ نہیں میں خود بھی یہی کہتا ہوں تو نے صرف ایک رات میں میری دو بیویاں مجھ سے جدا کر دیں اگر میں تجھے چند دنوں اور رکھ لوں تو میرے سارے یورت عورتوں سے خالی ہو جائیں گے۔"

"قربان نے کھڑے ہو کر مؤدبانہ درخواست کی "خان! اس منحوس لڑکی کو میں قبول کرنے پر تیار ہوں۔"

خانِ اعظم نے مسخرے قربان کی درخواست فوراً قبول کر لی اور اسے حکم دیا "جا لے جا اسے اور چکھ مزا۔"

لیکن لڑکی نے قربان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"خان! میں اس بدصورت بوڑھے کے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی اس سے تو یہ بہتر ہے کہ تو اپنے ہاتھ سے مجھے قتل کر دے۔"

چنگیز نے قربان کو حکم دیا "میرا حکم ہے کہ تو اسی وقت اس کو لے جا۔"

نویان نے حکم کی تعمیل کرنی چاہی اور اسے خان کے دربار سے زبردستی لے جانا چاہا لیکن لڑکی کی طاقت بوڑھے نویان پر غالب آگئی اور اس نے نفرت اور حقارت کے عالم میں ایک زوردار دھکا جو دیا تو بوڑھا نویان لڑکھڑا کر چنگیز خان کی چوکی کے سامنے جا گرا۔

نویان خفت اور شرمندگی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خان سے درخواست کی "خان! کسی جوان منگول کی مدد سے اس شریر لڑکی کو میرے یورت تک پہنچوا دیجیے۔"

چنگیز خان کو غصہ آگیا اس نے نویان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ "جب تو اس لڑکی پر قابو نہیں پا سکتا تو تو کیا کر سکتا ہے؟ لشکر کے لیے اور خانِ اعظم کے لیے تیرا وجود بیکار اور فضول ہے یہ میرا فرض ہے کہ میں تجھ جیسے نااہل اور ناکارہ سے اس زمین کو نجات دلا دوں۔"

اس کے بعد اس نے پہرے کے تیغ بردار منگول کو حکم دیا اور اس نے ایک وار میں بوڑھے نویان کا سر جسم سے الگ کر دیا۔

لیوچیت ساکی نے دبے دبے لہجے میں کہا "آہ! خانِ اعظم نے تو اسے ایک رات برداشت بھی کر لیا لیکن بوڑھا نویان تو چند لمحے بھی اس منحوس لڑکی کی نحوست سے محفوظ نہ رہ سکا۔"

چنگیز خان نے اپنے صحرائی دارالخلافے قراقرم میں ایک ایسی بستی بھی بسا دی تھی جس میں دنیا بھر کے ہنرمند کاریگر جمع کر دیے گئے تھے۔ اسی بستی میں مجھے بھی ٹھہرا دیا گیا تھا۔ میں شیشے کے کام سے اچھی طرح واقف تھا اور چنگیز خان چاہتا تھا کہ میں یہیں مستقل رہ جاؤں اور اپنا کام دھندا شروع کر دوں چنگیز خان جتنا خونخوار اور سفاک مشہور تھا کاریگروں اور ہنرمندوں کے حق میں اتنا ہی رحم دل اور فیاض تھا چنانچہ اس نے مجھے ہر قسم کی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائیں اس کا گمان یہ تھا کہ میں ان خونخواروں کے درمیان رہنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کو میرے مذہب اس کے رسم و رواج اور طریقۂ عبادت سے کوئی سروکار نہ تھا ہاں وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ میں اس کے رائج کردہ اور نافذ شدہ قوانین یاسا کی پابندی کروں۔ یاسا چنگیز خان کا اپنا وضع کردہ قوانین کا مجموعہ تھا۔ ۱۲۰۶ء میں چنگیز خان نے خانوں کی مجلسِ مشاورت قرلیتائی طلب کی تھی۔ اس مجلس نے متفقہ طور پر اسے بوگدو تسلیم کر لیا تھا، بوگدو دیوتاؤں کا بھیجا ہوا مانا جاتا تھا اور اعلیٰ آسمان کی ساری قوت بوگدو کو حاصل ہوتی تھی۔ یاسا کی رو سے چوری اور زناکاری کی سزا موت تھی نشہ چونکہ منگولوں کی علت تھی اس لیے اس عادت کو بڑی خوبصورتی اور حکمت سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یاسا میں نشے کی بابت چنگیز خان نے کہا تھا کہ جو آدمی نشے میں ہوتا ہے اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی نے سر پر چوٹ کھائی ہو، عقل اور تمیز اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اس لیے مہینے میں صرف تین بار نشہ کیا جا سکتا ہے۔ یاسا میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ خانِ اعظم کو اس پر بھی غصہ آتا ہے کہ بیٹا اپنے والدین کی، چھوٹا بھائی اپنے بڑے

بھائی کی نافرمانی کرے شوہر اپنی بیوی پر اعتبار نہ کرے یا بیوی اپنے شوہر کی نافرمانی کرے امیر غریبوں کی مدد نہ کرے یا کمتر درجے کے لوگ سرداروں کی عزت نہ کریں۔

ابھی سورج کچھ زیادہ بلند نہ ہوا تھا کہ خانِ اعظم کے دو سپاہی اونگ خان کی پوتی کو لے کر حاضر ہوئے خانِ اعظم کے معمولی سپاہی کی اتنی عزت ہوتی تھی کہ ختا اور چلپیت کے شہزادگان بھی اس سے مرعوب رہتے تھے میں اپنی بھٹی کے پاس کام شروع ہی کرنے والا تھا کہ ان دونوں سپاہیوں کے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے اس لڑکی کو دھکیل کر میرے قریب کر دیا اور ان میں سے ایک چنگیز خان کا فرمان پڑھ کر سنانے لگا،

عزیز فرزند! تو میری رعایا میں شامل ہو گیا ہے ضروریاتِ زندگی کی اہم ضرورت عورت تجھے خانِ اعظم کی طرف سے بطورِ تحفہ پیش کی جا رہی ہے یہ اونگ خان کی پوتی ہے تو اس سے واقف ہے کہ یہ میرے پاس کس طرح آئی تھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت منحوس ہے لیکن ہم اس پر یقین نہیں رکھتے اور میں نے سنا ہے کہ تم مسلمان بھی، ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تو اسے اپنی بیوی بنا کر رکھو کیونکہ یاسا میں بدکاری کی سزا موت ہے۔

فرمان کے نیچے چنگیز خان کی مہر لگی ہوئی تھی جس کا مفہوم تھا "آسمان پر خدا اور زمین پر خدا کی قوت۔ نوعِ انسان کے بادشاہ کی مہر"۔

اس لڑکی کی نحوست کے بارے میں جو باتیں مشہور ہو چکی تھیں ان کے پیشِ نظر اس کو قبول کرنے میں مجھے پس و پیش تھا لیکن چنگیز خان کے فرمان کے آگے میرا پس و پیش نہ چل سکتا تھا۔ میں نے انتہائی خندہ پیشانی سے اس لڑکی کو قبول کر لیا اور شکرانے میں کچھ قیمتی تحفے دونوں سپاہیوں کے حوالے کر دیئے۔

میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کچھ اداس ہے اس کے ہاتھ میں شیشے کا کنٹھا اب بھی تھا وہی کنٹھا جس پر مصری تعولیہ "ذلتیں تمہارے تعاقب میں ہیں" کندہ تھا۔

میں نے اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے رہنے اٹھنے بیٹھنے کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ لڑکی تھی بڑی خوبصورت لیکن عجیب عالم تھا کبھی تو اس کی مشہور نحوست کے پیشِ نظر خوف زدہ ہو جاتا اور لڑکی سے ڈرنے لگتا اور کبھی سب کچھ بھول بھال کر اس سے محبت کرنے کو جی چاہتا۔

میرے پڑوس میں یعقوب نامی ایک بوڑھا عیسائی رہتا تھا یہ عکہ کا رہنے والا تھا اور کپڑے کی بنائی کا بے بدل استاد تھا جس وقت خانِ اعظم کے سپاہی اس شجرِ ممنوعہ کو تحفے کے طور پر میرے پاس لائے تھے وہ باہر موجود تھا سپاہیوں کے واپس جاتے ہی وہ اجازت لے کر گھر کے اندر آ گیا اور حریصانہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا پرسش حال پر جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ خانِ اعظم نے اس لڑکی کو تحفتاً مجھے بخش دیا ہے تو اس کے دل میں آتشِ حسد سلگ اٹھی لیکن یاسا کی حدود میں وہ بالکل بے بس تھا۔

کئی دن تک ہم دونوں اجنبی سے بنے رہے۔ لڑکی کا کام اگرچہ گھر کی کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے میری ذات سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یہاں بوڑھے یعقوب سے معاملہ ختم نہیں کر پایا۔ لڑکی رہتی تھی میرے ہی پڑاؤ میں پر خفا بھی آتا جاتا رہتا۔ میں دراصل دمشق کے منحوس ساعت کا منتظر تھا۔

ایک رات جب کہ ہم تینوں آگ کے الاؤ کے آس پاس بیٹھے اپنے جسموں کو سینک رہے تھے بوڑھے یعقوب نے کہا۔

"دوست! اگر یہ لڑکی تمہیں خانِ اعظم کی طرف سے تحفے میں دی گئی تو میں اسے تم سے مانگ لیتا۔"

میں نے جواب دیا۔ "اور اگر یہ میرے پاس خانِ اعظم کا تحفہ نہ ہوتا تو میں تمہیں بغیر مانگے ہی بخش دیتا۔"

الاؤ کی روشنی میں، میں نے لڑکی کے چہرے پر جو غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس کو میرے جواب سے تکلیف پہنچی ہے۔

اس نے کرب ناک لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو میں تمہارے قدم میں نظر بھی نہ آتی۔ اس ریت میں رہتے بستے لوگ بھی سنگریزے ہو گئے ہیں۔"

یعقوب نے مجھ پر باتوں کی کمند پھینکی۔ "دوست! تم مسلمان ہو، اخلاق تو تم پر ختم ہے کیا تم یہ لڑکی مجھے بخش سکتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "لیکن یہ خانِ اعظم کا تحفہ ہے میں خانِ اعظم کو کیا جواب دوں گا؟"

یعقوب نے کہا۔ "ہم تینوں اس سیاہ ریت کے صحرا سے بھاگ چلیں یا ساحلی حد سے نکلتے ہی اس کی گرفت سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔"

میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے جواب دیا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو میں غور کروں گا۔"

یعقوب نے سوچنے کا وقت مقرر کر دیا۔ بولا "تین دن تک غور کر لو۔ اگر تم کہو گے تو میں اس لڑکی کو تم سے قیمتاً بھی لینے کو تیار رہوں۔"

میں نے مختصر جواب دیا۔ "میں غور کروں گا۔"

لڑکی نے اچانک زبان کھولی۔ کہنے لگی "تم میرا سودا نہیں کر سکتے کل میں خانِ اعظم کے پاس چلی جاؤں گی اور تم دونوں کی گفتگو سے اس کو آگاہ کر دوں گی۔"

ہم دونوں کے ہوش جاتے رہے یعقوب گڑگڑایا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

لڑکی نے سنگدلی سے جواب دیا۔ "الفاظ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح واپس نہیں ہوا کرتے۔"

یعقوب نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ کھل کھلا کر ہنسا، ہنستا ہوا بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ خانِ اعظم کے عطیے کا

کوئی سودا کر بھی سکتا ہے کیا بھلا؟"

لڑکی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "خانِ اعظم کے عطیے کے ساتھ مذاق کر رہے تھے یہ دوسرا جرم ہے۔ تمہارا یہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

میں حیران تھا کہ کہاں تو یہ لڑکی یعقوب سے مل گئی تھی اور کہاں اب ایسا معاندانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ عجب پُراسرار تھی اس کی شخصیت، عجب پُرپیچ تھی اس کی ذات۔ اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ لڑکی منحوس ہے کہ شاید اس کے منحوس اثرات کا نزول اور ظہور شروع ہو چکا ہے اور اس سے بچنا یا محفوظ رہنا بہت دشوار ہے۔

یعقوب کا بہت بُرا حال تھا وہ لڑکی کی خوشامد پر اُتر آیا تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ "میں اپنی ساری عمر کی کمائی تیری نذر کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تو خانِ اعظم کے پاس میری شکایت لے کر نہ جا۔"

لڑکی بیبی، ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس وقت واقعی کاروبار کے موڈ میں ہے اس نے دریافت کیا۔

"اس صلے میں تم کیا دے سکتے ہو؟"

یعقوب نے بلاتامل جواب دیا۔ "اپنا سب کچھ۔ میرے پاس جو کچھ ہے تم بلا چون و چرا مجھ سے لے سکتی ہو۔"

آگ کی روشنی میں یعقوب کے چہرے پر فکرمندی تردد اور خوف کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔

لڑکی نے بات صبح تک رکھ دی اور کہا۔ "صبح تم اپنی کمائی کی تفصیل تیار کرو۔ اس کے بعد میں غور کروں گی کہ تم سے کیا کیا لوں اور کیا کچھ تمہارے پاس رہنے دوں۔"

یعقوب نے آہستہ سے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ "بہتر ہے صبح تیار کر دوں گا فہرست۔"

اس کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے لڑکی سے دریافت کیا۔ "کیا تم واقعی ہم دونوں کی شکایتیں لے کر خانِ اعظم کے پاس پہنچ جاؤ گی؟"

لڑکی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں مذاق اور جھوٹ سے نفرت کرتی ہوں۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا یعقوب سے راز داری اور زبان بندی کا صلہ پا جانے کے بعد یہ لڑکی مجھ سے بھی اسی قسم کا کوئی معاملہ کرے گی؟ میرا سر چکرا گیا لڑکی پر غصہ بھی آیا اور پیار بھی۔ لیکن عجب بے بسی تھی کہ غصہ بے کار تھا اور اس کا اظہار ناممکن، پیار فضول اور خطرناک خطرہ نہ تھا۔ میں ہر مصیبت ہر زحمت اور نحوست برداشت کرنے پر تیار تھا۔ میں نے اپنے دل سے خوف و خطر اور اندیشۂ زیاں بالکل نکال دیا۔

صبح بہت دیر تک یعقوب ہمارے پاس نہیں آیا حالانکہ روزانہ نمودِ سحر کے ساتھ ہی آ جاتا تھا لڑکی کو بھی اس کا انتظار تھا وہ خود ہی یعقوب کے گھر چلی گئی لیکن فوراً ہی واپس آ گئی۔ وہ بہت پریشان اور حواس باختہ تھی آتے ہی کہنے لگی۔

"یعقوب نے خودکشی کر لی۔ وہ فرش پر مُردہ پڑا ہے اور اس کے آس پاس خون ہی خون پھیلا ہوا ہے"
میں فوراً بھاگا ہوا یعقوب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ یعقوب نے خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر لیا تھا۔ تھوڑی دور کاغذ کا ایک ٹکڑا تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ یہ پرچہ خانِ اعظم کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"اے مقدس اور طاقتور بوگردو! میں یاسا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خودکشی کر رہا ہوں اور خودکشی کا سبب [redacted] لڑکی ہے جسے خانِ اعظم نے بطورِ تحفہ میرے مسلمان پڑوسی کو بخش دیا ہے۔ میں دولت سے محبت کرتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ یہ مجھ سے چھین لی جاتے۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا ہے کہ میرا اپنی دولت سے دستبردار ہو جانا ضروری اور لازمی ہو گیا تھا۔ تفصیلات لڑکی سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔"

یہ خبر آناً فاناً پوری آبادی میں پھیل گئی۔ خانِ اعظم کو جب اس خودکشی کی تفصیل معلوم ہوئی اور اس نے یعقوب کا خط پڑھوا کر سُنا تو اس کے غصّے کی انتہا نہ رہ گئی۔ اس نے اسی وقت مجھے اور لڑکی کو اپنے دربار میں بلایا۔ لڑکی نے ساری روداد سچ سچ بیان کر دی۔ خانِ اعظم کے نزدیک جان کوئی قیمتی چیز نہ تھی، اس نے غصّہ میں حکم دیا۔

"تو نے میرے تحفے کی بے عزّتی کی ہے، میں تجھ سے ناراض ہوں۔ میں تجھے بہت سخت سزا دینا چاہتا ہوں" بول تو خود ہی اپنی سزا تجویز کر لے۔"

لڑکی نے کہا۔ "خانِ اعظم جرأت کی گستاخی معاف، یہ کاریگر میرے حوالے کر دیا جاتے۔ میں اس کو خود ہی ٹھیک کر لوں گی۔"

بوڑھا ییوچینت ساتی زیرِ لب مسکرایا۔ اور کہا۔ "لڑکی ٹھیک ہی کہتی ہے خانِ اعظم کو یہ سوچنا چاہیے کہ لڑکی تو بذاتِ خود ایک قسم کی سزا ہے کہ جس کے متھے ماری گئی وہ روتا ہی رہے گا اس لیے اس سلسلے میں خانِ اعظم کے لیے کسی کو سزا دینا نامناسب ہے۔"

چنگیز کو یاد آیا کہ یہ لڑکی تو شروع سے آخر تک منحوس رہی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی نحوست ہے کہ گھڑی گھڑی اس کے خلاف معاملات کھڑے ہوتے ہیں اور نوبت لوگوں کی ہلاکت اور پریشانی تک پہنچ رہی ہے۔

چنگیز خان نے جابرانہ فیصلہ سُنا دیا۔

"میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اس لڑکی کو اچھی طرح رکھ اور اس بات کی کوشش کر کہ معاملات حسبِ معمول رہیں اور ان میں کسی قسم کی خرابی نہ پیدا ہو۔ اگر تم دونوں میں سے کوئی ناکام ہے تو اپنے انجام پر اچھی طرح غور کر لو۔ میں نا پاک

اور منحوس وجود وں سے خلق خدا کا پیچھا چھڑا دوں گا۔"

ہم دونوں خان اعظم کے دربار سے واپس آ گئے۔ میری طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ یہ لڑکی جتنی حسین تھی اسی قدر منحوس تھی۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا کہ مجھے میری موت قراقرام لے آئی ہے۔ یہ لڑکی میرے لئے ملک الموت سے کم نہ تھی۔ سوچتے سوچتے آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دس پانچ دن خوشی گزار کر ایک بار خان اعظم کے پاس پھر پہنچوں اور اس سے گھر واپس جانے کی اجازت طلب کر دوں۔ جب واپسی کی اجازت مل جائے تو میں اس لڑکی اور سرائے کو لے کر خان اعظم کی مملکت کی حد سے باہر نکل جاؤں اور وہاں اس لڑکی سے کسی بھی طرح نجات حاصل کر لوں۔

اس کے بعد میں نے اپنا کام تیزی سے انجام دینا شروع کر دیا۔ ان دنوں میں شیشے کے جار تیار کیا کرتا تھا۔ سلیکا سوڈے اور چونے کے اجزا اپنے مناسب وزن میں لے کر ان کی لپسائی ہوتی تھی تو اس کام کے لئے میں نے دو شاگرد رکھ چھوڑے تھے۔ یہ دونوں بڑی محنت سے انہیں ملاتے اور انہیں پیس کر ایک بڑے سے ٹب میں ڈال کر اسے تیز آگ میں پگھلاتے۔ یہاں تک کہ جب یہ بالکل پانی کی طرح پگھل جاتا تو ایک نلکی کے ذریعے پھونک مار کر اس سیال میں بلبلا پیدا کرتے اور ہوا کی کمی بیشی سے ان بلبلوں کو جار کی شکل میں بدل دیتے۔ یہ سارا کام میرے دونوں شاگرد انجام دیتے تھے۔ میں ان دونوں کی نگرانی کرتا رہتا۔ یہ کام مہینے میں تقریباً دس دن کیا جاتا کیونکہ اس سے پھیپھڑوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ لڑکی اس کام کو بڑے انہماک سے دیکھتی رہتی۔

میں نے اس لڑکی سے کہا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا: "میں اپنا کام دس بارہ دن میں ختم کر دوں گا۔ میں گھر جانا چاہتا ہوں کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

لڑکی نے تردد کے انداز میں دریافت کیا: "پھر واپس بھی آؤ گے یا نہیں؟"

میری نیت واپسی کی ہرگز نہ تھی لیکن دروغ مصلحت آمیز کا سہارا لینا پڑا۔ میں نے جواب دیا۔ "واپس کیوں نہ آؤں گا لیکن جلدی واپس نہ آؤں گا۔"

اس نے دریافت کیا: "واپسی میں کتنا عرصہ لگ جائے گا؟"

میں نے جواب دیا: "تقریباً دو سال۔"

لڑکی ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ بولی: "میں ساتھ چلوں گی لیکن واپس ضرور آ جانا۔"

ہم دونوں کی گفتگو میرے دونوں شاگرد بھی سن رہے تھے مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ ان کے دلوں میں کس قسم کے طوفان اُٹھ رہے ہیں، وہ دونوں ہی بیک وقت اس لڑکی کے عشق کی آگ میں سُلگ

رہے تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی اس کیفیت سے صرف آگاہ تھے بلکہ رقیب بھی۔ اور ان میں جب تب چھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ کہ خبردار جو اس سے تو نے عشق کیا۔ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

میں اپنا کام ختم کر کے روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ چنگیز خان نے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس شرط پر کہ میں دوبارہ پھر آجاؤں۔ جب میں چنگیز خان کے یورت میں بیٹھا ہوا اس سے اجازت طلب کر رہا تھا اس دوران میرے دونوں شاگرد لڑکی سے اظہارِ عشق کر رہے تھے اور اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ دونوں میں سے کس پر مائل ہے جب اس نے صاف انکار کر دیا کہ اسے ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں تو انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے دھمکی دی کہ وہ یہاں سے جا نہیں سکتی وہ بزورِ طاقت اسے روک لیں گے۔

لڑکی چالاک بھی تھی اور ذرا پُرمزاح بھی۔ اس نے کہا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں میں سے کون مجھے زیادہ چاہتا ہے؟" جواب میں دونوں ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

لڑکی نے کہا "پہلے تم دونوں یہ تصفیہ تو کر لو کہ کس کے دل میں میری محبت زیادہ ہے اس کے بعد کوئی اور بات ہو" یہ بڑا پریشان کن اور اُلجھن کا مسئلہ ہے دونوں نے ایک ساتھ اپنے اپنے دلوں میں یہ طے کر لیا۔ کہ اپنے ساتھی کو ہر طور درمیان سے ہٹا دینا ہے۔

دونوں غصے اور جوش میں بھر کر گھر سے باہر نکل گئے اور تلواریں کھینچ کر ایک دوسرے کے مدِمقابل ہو گئے دونوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس لڑکی کے عاشق کی حیثیت سے کسی ایک ہی کو زندہ رہنا چاہیئے لڑکی بھی دونوں کے مقابلے بازی دیکھنے کے لئے باہر نکل گئی اس کی موجودگی اور دونوں کے دلوں کے اس احساس سے کہ ان کا مقابلہ لڑکی دیکھ رہی ہے اُمنگ اور ولولے لاوے کی طرح ان کی رگ و پے میں دوڑنے لگے۔

مقابلے کے دوران دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو تنبیہ کرتا اور حکم دیتا کہ "اب بھی وقت ہے کہ اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو۔ معاف کر دیے جاؤ گے۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔"

مگر لڑکی کا خیال دونوں میں سے ایک بھی اپنے دل سے نکالنے پر تیار نہ تھا۔

جب میں گھر واپس پہنچا تو ان دونوں میں زور شور کا مقابلہ جاری تھا اور دونوں ہی تلوار کے چرکوں اور زخموں سے لہولہان ہو چکے تھے۔ میں چونکہ اصل واقعات سے لاعلم تھا اس لئے ان دونوں کو اس خون خرابے سے باز رکھنا چاہا لیکن مقابلے میں اور شدت پیدا ہو گئی اور دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے حریف کو جلد از جلد قتل کر دینا چاہا۔

لڑکی نے اشارے سے مجھے گھر کے اندر چلے جانے کا مشورہ دیا اور میرے ساتھ ہی وہ بھی گھر میں داخل ہو گئی باہر اور بھی لوگ جمع ہو گئے۔ لڑکی مجھے جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی۔ ابھی اس کی بات جاری ہی تھی کہ باہر سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ لڑکی نے فوراً کہا "ایک مارا گیا۔"

پھر دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔ میرا ایک شاگرد خاک و خون میں لت پت تھا اور دوسرا مار کر فرار ہو چکا تھا لوگ اس کا تعاقب کر رہے تھے اس دن بڑا ہنگامہ مچا رہا۔ سارا بخارا حرکت میں آ گیا۔ قانون کے محافظ قاتل کی جستجو میں لگ گئے خان اعظم کا حکم تھا کہ اس نیلے آسمان کے نیچے جہاں کہیں بھی قاتل موجود ہو پکڑ کے اس کے سامنے لایا جائے۔

میں نے خچروں پر اپنا مال و اسباب لادا اور ایک قافلے کے ساتھ وطن کے لئے چل پڑا۔

میں دشوار گزار اور تکلیف دہ راستوں سے گزرتا ہوا تبریز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منگولوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ راستے میں کسی نے ہمیں چھیڑنے تک کی ہمت نہ کی کیونکہ ہمارا قافلہ جن راہوں سے گزرتا تھا وہاں کے بسنے والوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ قافلہ چنگیز خان کے صحرائی دارالخلافے قراقرم سے آ رہا ہے۔

جب ہمارا قافلہ ایران کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا تو کچھ اور لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے ان میں کچھ تاجر تھے اور کچھ غیر تاجر۔ رات کو قافلے نے ایک کھلے اور وسیع میدان میں پڑاؤ کیا۔ آناً فاناً خیمے لگ گئے اور دور تک خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا۔ میں اپنے خیمے میں بیٹھا ماضی پر غور کر رہا تھا۔ چنگیز خان، صحرائے گوبی کا فرزند، دنیا کے لئے پیغام موت، ہلاکت و بربادی۔ اس کی بربریت، سفاکی اور بے رحمی، اس کی جنگی شاطرانہ مہارت، اس کا خونخوار لشکر، قراقرم، یاسا، تیموچن، ساقی۔ اس کے بیٹے توی، جوجی، چغتائی، ہو غدائی، اس کے جنرل سوبدائی مقولی غرضیکہ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک چیز یاد آ رہی تھی اور پھر اس لڑکی کا خیال آ گیا لڑکی کے ساتھ ہی اس کی مشہور نحوست اور شیشے کا کنٹھا یاد آیا۔ میں نے ایک اچٹتی نظر اس لڑکی پر ڈالی جو میرے قریب ہی پڑی سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور بھولپن اس بات کی تردید کر رہے تھے کہ وہ منحوس بھی ہو سکتی ہے اسی دوران میرا گھوڑا بے اختیار اور بے تحاشا ہنہنانے لگا اور زور زور سے پیر ٹپکنے لگا جو اس بات کی علامت تھی کہ کوئی خطرے کی بات ہے۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تلوار اپنے قابو میں کر کے خطرے کا انتظار کرنے لگا۔ میری قوت سماعت اور حس خطرے کو بھانپنے کی کوشش کر رہے تھے پھر اچانک میں خیمے سے باہر نکل گیا اور دوسرے کی آڑ سے اس کے پچھلے حصہ کا جائزہ لینے لگا۔ اسی دوران خیمے کا پچھلا پردہ اٹھا اور کوئی شخص چوہوں کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ اندر شمع کی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں یہ بدمعاش سوتی ہوئی لڑکی کو نقصان نہ پہنچائے۔

میں اس کو بار بار غور سے دیکھ رہا تھا اور پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا آنے والا لڑکی کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے جھکا اور لڑکی کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر ہاتھ کھینچ لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا وہ اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو جہاں تک میرا خیال ہے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ خیمے کے دروازے کی طرف چل پڑا اب میں وہاں سے ہٹ کر خیمے کی پشت پر پہنچ گیا ٹھیک اس جگہ جہاں سے یہ شخص خیمے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے پچھلے حصے کے ایک چھوٹے سے روزن سے جھانک کر خیمے کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت خیمہ اس اجنبی کے وجود سے خالی تھا صرف لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ اجنبی کدھر چلا گیا پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ وہ میری تلاش میں چوروں کی طرح ضرور خیمے کے باہر چلا گیا ہو گا۔ میں خیمے کے اندر داخل ہو گیا اور نہایت پھرتی سے خیمے کے دروازے سے لگ کر چوروں کی طرح کھڑا ہو گیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ آنے والا پھر خیمے کے دروازے ہی سے اندر داخل ہو گا میرا خیال صد فی صد درست نکلا اور آنے والا پھر اسی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ میں نے اس بار اسے پہچان لیا یہ میرا وہی شاگرد تھا جو اپنے ساتھی کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی میں حیرت سے چیخ اٹھا "ارے تم! تم یہاں کہاں؟"

اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور گھبرا کر بولا "ہاں یہ میں ہوں آپ کا شاگرد۔ میں آپ کے پاس چھپنا چاہتا ہوں۔ چنگیز خان کے ہرکارے میری تلاش میں ہیں۔"

"لیکن تم اس قافلے میں شامل کب ہوئے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے جواب دیا۔ "آج جو نئے لوگ قافلے میں شامل ہوئے تھے، ان میں، میں بھی شامل تھا۔"

ہماری باتوں کی آواز سے لڑکی بھی جاگ گئی پہلے تو وہ اس اجنبی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن جیسے ہی پہچانا گھبرا گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے اپنے شاگرد سے کہا "تم بھاگ جاؤ۔ چنگیز خان کے آدمی اس قافلے میں بھی موجود ہیں تم ضرور پکڑے جاؤ گے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں چلا جاؤں گا لیکن تبریز تک مجھے پناہ دیجئے۔"

اس کے لہجے کی لجاجت نے میرے دل کو نرم کر دیا اور میں کسی حد تک پناہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ لڑکی نے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی اس نے مجھے اشارہ کیا اور اس ارادے سے باز رہنے کی تلقین کی۔

کہنے لگی۔ "کسی بھی فیصلے سے پہلے یہ ضرور ذہن میں رکھو کہ چنگیز خان کے آدمی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

میں نے بھی اس خدشے کا سہارا لیا اور مہذب لہجے میں اپنے شاگرد کو جواب دیا۔ "خانِ اعظم کے معتوب کو

پناہ دینا ایسا ہی ہے جیسے خودکشی کر لی جائے بہتر یہی ہے کہ تم قافلے میں اسی طرح شامل رہ کر سفر کرتے رہو۔ جس طرح اب تک کرتے رہے ہو۔"

لیکن وہ بڑا ڈھیٹ نکلا۔ فوراً تیوری بدل کر بولا "میں زبردستی آپ کے ساتھ رہوں گا اور اگر پکڑا گیا تو یہ کہہ دوں گا کہ مجھے آپ ہی نے پناہ دے رکھی ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی جس کا مطلب یہ تھا کہ سرِدست اس موضوع کو ختم کر دیا جائے اور خوب غور و فکر اور مشورے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جاتے۔ میں نے اپنے شاگرد سے کہا "سرِدست تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو، پوری احتیاط اور رازداری کے ساتھ، لیکن اس کا مستقل حل ضرور نکلنا چاہیئے۔"

اس نے جواب دیا "تبریز پہنچ کر میں خود ہی آپ سے جدا ہو جاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایران اور اس کے نواح کی سرزمین مجھے خانِ اعظم کی گرفت سے محفوظ رکھ سکے گی۔ تبریز سے میں بغداد چلا جاؤں گا اور بغداد سے مصر نکل جاؤں گا۔"

اس نے میری تلوار کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگا "آپ نے یہ تلوار کیوں سنبھال لی تھی کیا آپ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے؟"

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا "میں تمہیں پہچان نہ سکا تھا میں اس غلط فہمی میں تھا کہ رات کی تاریکی میں خدا جانے کون چور اچکا میرے خیمے میں داخل ہو رہا ہے اس لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے تلوار سنبھال لی تھی۔"

اس نے شرارت آمیز انداز میں "ہوں" کہا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے خیمے کے ایک گوشے میں اس کے سونے کا انتظام کر دیا لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا، میں اس کو اپنے خیمے میں جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ بستر پر جاتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا، بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں لڑکی کے ساتھ دیر تک جاگتا رہا، میں اس سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن لڑکی اس پر تیار نہ تھی وہ ضرورت سے زیادہ محتاط تھی اور اس کو کسی قسم کے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی، اس نے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے منع کیا کہ میں اس وقت کوئی بات نہ کروں۔

ہم دونوں نے ساری رات جاگ کر گزار دی۔

صبح میرا شاگرد حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے چلا گیا تو لڑکی نے مجھ سے کہا "اس پر اعتبار بالکل نہ کرنا اس کی نیت اچھی نہیں نظر آتی۔"

میں نے اس سے دریافت کیا۔ "لیکن مجھے تو تم یہ مشورہ دو کہ اب مجھے کرنا کیا چاہیئے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "قافلے کے ساتھ خانِ اعظم کے جو آدمی چل رہے ہیں انہیں اس کی آمد اور موجودگی سے مطلع کر دو۔"

لیکن میرے دل نے اسے گوارا نہ کیا کیونکہ ایک استاد کی حیثیت سے مجھ کو اپنے شاگرد کے ساتھ دغا بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا ایسا کرنا میرے ضمیر کے خلاف ہے وہ میرا شاگرد ہے اور میں اس کا استاد، ہم دونوں کے درمیان کچھ اخلاقی اقدار اور قیود حائل ہیں میں انہیں نہیں توڑ سکتا۔"

لڑکی نے غصے میں جواب دیا۔ "تب پھر جو ہونا ہے ہو جانے دو۔ مجھ سے مشورہ کیوں طلب کرتے ہو۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گی یہ شخص تم سے دغا بازی ضرور کرے گا۔ اس پر کم از کم میں اعتبار نہیں کر سکتی۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ "اور ہاں میں اسے اپنے خیمے میں نہیں سونے دوں گی اس کے لئے ایک علیحدہ خیمے کا انتظام کر دو۔ اور یہ بھی سن لو کہ جو کام تم خود نہیں کر سکتے اسے میں انجام دوں گی۔ میں کسی بھی وقت پوچھتی پچھتی خانِ اعظم کے آدمیوں کے پاس پہنچ جاؤں گی اور اس شخص کو گرفتار کرا دوں گی۔"

اس جگہ قافلے نے تین دن کے لئے پڑاؤ کیا تھا ان تین دنوں میں میرے شاگرد نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا تھا وہ صبح غائب ہو جاتا اور نصف رات گزر جانے کے بعد واپس آتا وہ بہت سنجیدہ اور فکر مند سا رہتا جس دن قافلہ کوچ کرنے والا تھا اس سے پہلی رات کو وہ خوش خوش خیمے میں داخل ہوا اور فخریہ لہجے میں کہنے لگا۔ "اب مجھے خانِ اعظم کی کوئی پروا نہیں کیونکہ تم سب میرے رحم و کرم پر ہو بولو کیا چاہتے ہو عزت کی زندگی یا ذلت کی موت؟"

ہم دونوں اس کے عجیب اور غیر متوقع لہجے پر حیران تھے اور ایسا محسوس کیا جیسے اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا۔

وہ پھر اسی طرح اکڑ کر بولا۔ "میں شروع سے یہ طے کر کے نکلا تھا کہ یا تو اس لڑکی کو حاصل کر لوں گا یا پھر جان دے دوں گا اور آج بھی اسی عہد پر قائم ہوں۔"

لڑکی نے غصے اور حقارت سے جواب دیا۔ "تیرا دماغ تو درست ہے! میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔ سخت نفرت۔ تو میری مرضی کے خلاف اپنے عہد کو کس طرح پورا کر سکتا ہے۔ میں جان دے دوں گی لیکن تیرے ساتھ ایک لمحہ گزارنا بھی پسند نہ کروں گی۔"

اس نے پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا۔ "بولا صبح دور نہیں ہے دیکھنا ہے کون اپنا عہد پورا کرتا ہے۔"

میرا خون بھی جوش مار رہا تھا۔ میں نے تشدد آمیز لہجے میں کہا "یہ اخلاقی قیود تو نے توڑی ہیں۔ پہل تیری طرف سے ہوئی ہے اس لیے اب میں بالکل آزاد ہوں کہ تیرے ساتھ جیسا سلوک چاہوں کروں۔"

اس نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کو من مانا سلوک کرنے کی اجازت ہی کون دے گا آپ سب میرے سامنے بے بس ہو چکے ہیں۔ قافلے کے ایک ایک آدمی کی زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے لیکن میں کسی کو بھی معاف نہ کروں گا" اس کے بعد وحشیانہ قہقہہ لگایا اور میری طرف انگلی سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "تم میرے استاد ہو" اور اپنے سینے پر انگلی رکھ کر بولا "اور میں تمہارا شاگرد لیکن جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے" پھر لڑکی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "اسے میں حاصل کر کے رہوں گا۔ وہ صحرائی بھیڑیا چنگیز اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے جذباتی اور قلبی معاملات میں دخل دے۔"

میں نے پوری قوت سے چیخ کر اسے حکم دیا "نکل جاؤ میرے خیمے سے غائب ہو جاؤ۔ اسی وقت چلے جاؤ" اور اپنی تلوار نیام سے کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی اس صورتِ حال سے گھبرا کر خیمے سے باہر نکل گئی اس کے پیچھے ہی میرا شاگرد دوڑا لیکن میں نے پیچھے سے اس پر حملہ کر دیا۔ میرے حملہ کو اس نے پینترا بدل کر بے اثر کر دیا اور اپنی تلوار کھینچ کر میرے مقابلے میں آ گیا اور چیخا "بھاگ جاؤ، میں تجھے قتل کر دوں گا"

اور ہم دونوں میں مقابلہ ہونے لگا۔

ہماری چیخیں سن کر یا لڑکی کی کوششوں سے قافلے والے اپنی اپنی تلواریں سونت کر میرے خیمے کی طرف دوڑ پڑے۔ میرے شاگرد نے جب یہ محسوس کیا کہ اب جان بچانی مشکل ہے تو ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا اور کھلے میدان میں پہنچ کر عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا کبھی سیٹی بجاتا، کبھی چیختا کبھی دھاڑتا۔ ابھی اس کی یہ احمقانہ حرکتیں جاری تھیں کہ دور سے بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں اور یہ ٹاپیں ہم سے قریب سے قریب تر ہونے لگیں۔

قافلے میں خطرے کا ڈھول پیٹ دیا گیا۔ ہم سب کا خیال یہ تھا کہ آنے والے گھڑ سوار ڈاکو ہوں گے لیکن جیسے جیسے یہ ہم سے قریب ہو رہے تھے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں ہم سب ان کے مقابلے کے لئے بالکل تیار تھے۔

آنے والے ہم پر ایک دم حملہ آور ہو گئے، یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے تلواریں اور نیزے بے دردی سے چلنے لگے لوگوں کی چیخ و پکار سے فضا گونجنے لگی۔ آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے اور قافلے والے پیدل تھے انہیں گھوڑوں پر سوار ہونے یا ہتھیار لگانے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں میں نے لڑکی کو تلاش کرنا چاہا لیکن بے سود تھا۔ میں نے اپنے خیمے کو چھوڑ دیا اور اس میں میرا اچھا مال و متاع تھا اس کے لیے

صبر کر لیا کیونکہ اس کی حفاظت ناممکن تھی۔
دو گھنٹے کی جنگ کے بعد قافلے والوں کو شکست ہو گئی۔ حملہ آوروں کے انداز بتاتے تھے کہ وہ زندہ کسی کو بھی نہ جانے دیں گے۔ انہوں نے ہمیں اس طرح محاصرے میں لے لیا تھا کہ ہم پر فرار کی ساری راہیں بند ہو گئی تھیں جس وقت مشرق میں پو پھٹ رہی تھی۔ اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا ہم میں سے بیشتر قتل کیے جا چکے تھے اور جو زندہ بچے تھے ان میں سارے ہی زخمی تھے انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا ان اسیروں میں میں بھی شامل تھا میری آنکھوں کے سامنے ہمارا مال و اسباب لٹتا رہا اور ہم باحسرت و یاس دیکھتے رہے لڑکی کا کچھ پتہ نہ تھا کہ زندہ بھی تھی یا مر چکی۔

ہم لوگ دو دن اور دو راتیں سفر کرتے رہے اور جب منزل پر پہنچے تو پتا چلا کہ ہم پر حملہ آور ہونے والے شہر نا تحج سلطان محمد خوارزم کے کسی قلعدار کے سپاہی تھے اور خوارزم شاہ کے چنگیز خان سے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ چنگیز خان نے تجارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے جو وفد خوارزم شاہ کے پاس روانہ کیا تھا۔ خوارزم شاہ نے وفد کے سارے ارکان کو قتل کرا دیا تھا اور ان کا سامان ضبط کر لیا تھا۔ قصور صرف اتنا تھا کہ چنگیز خان نے اپنے خط میں خوارزم شاہ کو "میرے فرزند" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور ہماری مشرقی تہذیب میں کسی حکمران کا دوسرے حکمران کو "میرے فرزند" کہہ کر اس کو مخاطب کرنا اس کو ذلیل اور حقیر کرنے کے مترادف تھا میرا شاگرد ان باتوں سے آگاہ ہو گیا تھا چنانچہ اس نے خوارزم شاہ کے ایک قلعدار کو اس لوٹ مار اور قتل و غارتگری پر یہ کہہ کر آمادہ کیا کہ یہ قافلہ تمہارے بادشاہ کے دشمن کے ملک سے آ رہا ہے اس کے ساتھ بڑی دولت ہے اگر تم اس کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دو گے تو خوارزم شاہ تمہیں لطف و اکرام سے نوازے گا۔ میرے قافلے پر حملہ میرے شاگرد کی سازش پر ہوا تھا اس کا یہ بھی خیال تھا کہ لوٹ مار اور قتل و غارتگری ہو رہی ہو گی تو وہ مجھے قتل کر کے لڑکی کو لے کر فرار ہو جائے گا۔ لیکن حالات اور واقعات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔
اس قلعدار نے لوٹے ہوئے مال کا بیشتر حصہ خود رکھ لیا بقیہ کو ہم قیدیوں کے ساتھ خوارزم شاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا جب ہم خوارزم شاہ کے دربار میں پیش کیے گئے تو اس نے ہم سے چنگیز خان کی بابت طرح طرح کے سوالات کیے۔ اس نے دریافت کیا۔ "کیا چنگیز خان نے سچ مچ چین کو فتح کر لیا ہے؟"
ہم نے تائید میں جواب دیا۔ اس نے دوسرا سوال کیا کہ "کیا چنگیز خان کی فوجیں میری فوجوں سے زیادہ ہیں؟"
اس کا ہم نے گول مول جواب دیا۔ ہم نے کہا۔ "خان کے لشکر کا آپ کے لشکر سے کوئی مقابلہ نہیں۔"
خوارزم شاہ مطمئن ہو گیا۔

یہیں اس بات کا انکشاف ہوا کہ لڑکی کو قلعدار نے تحفے کے طور پر خوارزم شاہ کی خدمت میں بھیج دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شیشے کا وہ کٹورا بھی جو ہمیشہ اس لڑکی کے ساتھ رہتا تھا میرا شاگرد خوارزم شاہ کی خدمت میں اس تعارف کے ساتھ بھیجا گیا کہ یہ سارا کام اس شخص کی ہدایات، معلومات اور مشوروں پر انجام پایا ہے خوارزم شاہ بڑا شکی تھا، معلوم نہیں کس نے اس کو میرے شاگرد کے بارے میں یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ شخص چنگیز خان کا جاسوس ہے اور کسی خاص مہم پر یہاں آیا ہے خوارزم شاہ کے لئے اتنی سی بات کافی تھی اس نے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا یہ درست ہے؟"

موقع اچھا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا "لگتا تو ایسا ہی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ خانِ اعظم کا جاسوس ہو۔"

خوارزم شاہ نے بھرے دربار میں سب کے سامنے اس کی داڑھی منڈوا دی، سر کے بال کٹوا دیئے یہاں تک کہ پلک اور بھنویں تک منڈوا ڈالیں سب کے آخر میں اس کے قتل کا حکم صادر فرما دیا جب وہ قتل کیا جانے والا تھا تو میں خوارزم شاہ کی اجازت سے اس سے آخری ملاقات کرنے گیا اور اسے اس کا قول یاد دلایا کہ کہو اب کیا کہتے ہو "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے نا؟"

اس احمق نے سرکشی کے لہجے میں جواب دیا "ہاں میری اب بھی یہی رائے ہے میں اس وقت بھی جب کہ تھوڑی دیر بعد اس دنیا میں موجود نہ ہوں گا، اس بات سے خوش ہوں کہ وہ لڑکی تم سے چھینی جا چکی ہے۔"

میں نے نفرت اور حقارت سے کہا: "مجھے اس پر خوشی ہے کہ تمہارا حشر اتنی جلدی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

اس کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔

محمد خوارزم شاہ نے رات کو مجھے اپنی محفل طرب میں مدعو کیا وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس کے داہنی جانب بغل میں لڑکی بیٹھی تھی خوارزم شاہ بڑی ترنگ میں تھا۔ اس نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا "کیا یہ لڑکی واقعی منحوس ہے؟"

میں نے جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے۔"

محمد خوارزم شاہ نے ذرا کرخت اور درشت لہجے میں پھر دریافت کیا "میں تم سے پوچھتا ہوں خدا سے نہیں جواب دو کیا یہ لڑکی واقعی منحوس ہے؟"

میں نے ڈر کر اب تک جو کچھ پیش آتا رہا تھا محمد خوارزم شاہ کے سامنے بیان کر دیا وہ بہت متاثر ہوا لیکن مسکرا کر بولا "اور شاید تم یہ بھی کہو گے کہ اس لڑکی کی آخری نحوست یہ تھی کہ جس قافلے کے ساتھ یہ سفر کر رہی تھی اس کو بھی تباہ و برباد کرا دیا۔"

میں نے تائید کی بولا۔ "بالکل بالکل۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔"
لڑکی غصے کے عالم میں مجھ پر دانت پیس رہی تھی۔
محمد خوارزم شاہ نے مجھے رہائی کا حکم دے دیا۔ اس نے کہا۔ "تم مسلمان ہو اس لئے میں تمہیں رہا کر رہا ہوں۔ یہ لڑکی تمہیں عطا کی گئی تھی اب یہ ہمارے پاس ہے اور میں دیکھوں گا کہ اس کی نحوست میرا کیا بگاڑے گی۔"
میں کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گیا اور یہاں ایک رات گزار کر دوسرے دن ایک قافلے کے ساتھ قراقرم کے لئے روانہ ہو گیا مجھے خانِ اعظم کو ایک ایک بات بتانی تھی۔
جب میں خانِ اعظم کے پاس پہنچا اور محمد خوارزم شاہ کے ظلم و ستم کی داستان سنائی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔
اور اس نے فوراً ہی ایک وفد احتجاج کی غرض سے روانہ کر دیا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ وفد بھی واپس آ گیا وفد کے امیر کو خوارزم شاہ نے قتل کر دیا تھا اور وفد کے ارکان کی داڑھیاں جلا دی تھیں اب بات اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی چنگیز خان اپنے یورت سے باہر چلا گیا۔ ایک پہاڑ پر معاملے پر غور کرنے کے لئے چڑھ گیا وہاں غور و فکر کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مغل تاجروں کے قتل کی سزا ضرور دی جانی چاہیئے زیادتی کرنے والے کو زیادتی اور ظلم کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔
خانِ اعظم نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ "نہ آسمان پر دو سورج چمک سکتے ہیں نہ زمین پر دو خاقان ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔"
اس اعلان کے فوراً بعد وہ پہاڑ سے اُتر آیا چابک سوار اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور یاک کا نو دموں والا پرچم حرکت میں آ گیا لشکر کے جھنڈوں تلے سپاہی جمع ہونے لگے انتقامی جنگ کے طور پر خانِ اعظم نے محمد خوارزم شاہ کو ایک مختصر لیکن ڈراؤنا پیغام بھیج دیا۔
"تو نے جنگ کا انتخاب کیا ہے اب جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ اور کیا ہو گا ہمیں نہیں معلوم، صرف خدا کو معلوم ہے۔"
وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور فکر مند ہو گیا تھا جب اس کا لشکر تیار ہو چکا تو وہ اس کی طرف جاتے جاتے شاید یہ سوچنے لگا کہ ممکن ہے۔ اس جنگ سے وہ زندہ نہ لوٹے گا درختوں کے ایک حسین جھنڈ میں صنوبر کے سائے میں پہنچ کر اس نے کہا۔
"ہرنوں کے شکار کے لئے یہ بہترین جگہ ہے اور بڑھاپے کے آرام کرنے کے لئے بھی بہت مناسب ہے۔"
اس کے بعد اس نے اعلان کیا۔ "میری موت پر میرا مجموعہ قوانین یاسا با آواز بلند پڑھا جاتے اور سب اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔"
پھر اس نے اپنے لشکر اور لشکر کے افسروں کو مخاطب کر کے حکم دیا۔
"میرے ساتھ چلو اور روئے زمین میں اس مغرور کو نیچا دکھا دو جس نے ہمیں ذلیل کیا ہے تم سب جنگ میں میرے

برابر کے شریک ہوں گے۔ سر دار دس آدمیوں کا ہو یا دس ہزار کا سب پر اطاعت برابر فرض ہے جو اپنے اس فرض سے غفلت برتے گا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی اور بچوں کا بھی یہی حشر ہو گا۔"

اپنے بیٹوں اور مختلف سرداروں سے مشورے کے بعد چنگیز خان نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کے مختلف دستوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وہ اپنے تیز رفتار گھوڑے کی چوبی دار زین پر چھوٹی چھوٹی رکابوں میں پیر جمائے گھٹنے اٹھائے بیٹھا ہوا تقریباً دو رات چیت کے بغیر وہ آراستہ اور ایستادہ دستوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتا چلا گیا۔

چنگیز خان کا یہ سیلاب صحرائے گوبی سے نکل کر بخارا، سمرقند اور خوارزم کو روندتا کچلتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ ایک ایسا خونی سیلاب تھا کہ جدھر اس نے رخ کیا آبادی اور زندگی کو ملیا میٹ کرتا چلا گیا۔

سلطان محمد خوارزم کو اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ان وحشیوں کو انتہائی حقیر اور غیر تربیت یافتہ سمجھتا رہا تھا لیکن تجربات اور ناکامیوں نے اس خیال کو بالکل باطل قرار دے دیا تھا سلطان خوارزم شاہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا لیکن اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ خونخوار مغل اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے آخر تنگ آ کر اس نے اپنے حرم اور خزانے کو کسی نامعلوم مقام پر روانہ کر دیا اور خود بغداد بھاگ جانے کا منصوبہ بنانے لگا۔

ابھی وہ ہمدان کے قریب ہی تھا کہ مغلوں نے عقب سے نمودار ہو کر اس کے بغداد جانے کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔ اس بدحواسی اور مایوسی کے عالم میں سلطان نے اپنے ایک افسر سے دریافت کیا۔

"کیا اس دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں میں مغلوں کی برق و رعد سے محفوظ رہ سکوں؟" اس کے افسر نے مشورہ دیا کہ وہ کشتی پر سوار ہو کر بحیرۂ خزر میں دور کسی جزیرے میں روپوش ہو جائے اور وہاں اس وقت تک چھپا رہے جب تک کہ اس کے بیٹے اس کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور فوج نہ جمع کر لیں۔

محمد خوارزم شاہ نے یہی کیا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بھیس بدل کر پہاڑوں کے دروں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہوا بحیرۂ خزر کے مغربی ساحل پر ایک چھوٹے سے گمنام قصبہ میں پہنچا جہاں زیادہ تر ماہی گیروں اور تاجروں کی آبادی تھی۔ مغل یہاں بھی پہنچ گئے لیکن خوارزم شاہ اس سے پہلے ہی ایک ماہی گیر کی کشتی میں سوار ہو کر فرار ہو چکا تھا۔ جزیرے میں پہنچتے پہنچتے شاہ کا کام تمام ہو چکا تھا۔ مصائب نے اسے بیماریوں میں مبتلا کر دیا اور تکلیفوں اور دکھوں سے چور چور یہ عظیم سلطان فاتح اس جزیرے میں جاں بحق ہو گیا۔ جس وقت اس کا دم نکلا تو اس قدر مفلس ہو چکا تھا کہ اس کے رفیق نے اپنی قمیض کا کفن دیا۔

جس وقت مجھے اس کی موت کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا جس میں لڑکی سلطان

خوارزم شاہ کے داہنی جانب بغل میں بیٹھی ہوئی تھی اور سلطان ترنگ میں مجھ سے دریافت کر رہا تھا کیا یہ لڑکی واقعی منحوس ہے؟"

میں نے اسے جواب دیا تھا "خدا بہتر جانتا ہے۔"

میرے اس جواب پر سلطان نے کرخت اور درشت لہجے میں کہا تھا "میں تم سے پوچھتا ہوں خدا سے نہیں۔ جواب دو کیا یہ لڑکی واقعی منحوس ہے؟"

اور جب میں نے ڈرڈر کر اس وقت تک جو کچھ پیش آ رہا تھا صاف صاف سلطان کے گوش گزار کر دیا تھا تو سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا "اور شاید تم یہ بھی کہو گے کہ اس لڑکی کی آخری نحوست یہ تھی کہ جس قافلے کے ساتھ یہ سفر کر رہی تھی وہ بھی تباہ و برباد ہو گیا۔"

اور جب میں نے اس کی تائید میں یہ کہا تھا کہ "ہاں بالکل اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔"

تو اس نے مجھے رہائی کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا کہ "جاؤ تم مسلمان ہو اس لئے تمہیں رہا کر رہا ہوں۔ اب یہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور میں دیکھوں گا کہ اس کی نحوست میرا کیا بگاڑ لے گی۔"

یہ سارے مناظر میرے تصور کی دنیا میں گھومتے رہے اور جملہ مکالمات کانوں میں گونجتے رہے سلطان کا حشر میرے سامنے تھا۔ آہ بد بخت اور بد نصیب سلطان۔

کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ مغلوں کے ایک دستے نے سلطان کے حرم اور خزانے پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی۔ خانِ اعظم نے مجھے طلب کیا۔ جب میں اس کے ایرت میں داخل ہوا تو وہ لڑکی مجھے سامنے ہی دکھائی دی میں اسے دیکھ کر لرز گیا۔

چنگیز خان نے مجھ سے دریافت کیا "یہ لڑکی پھر مل گئی ہے کیا تو اسے رکھنا پسند کرے گا؟"

"میں نے کپکپاتے ہوئے جواب دیا" خانِ اعظم اگر مجھے زہر کا پیالہ بھی عطا کرے گا تو میں بخوشی اسے پی لوں گا۔"

وہ میرے جواب سے بہت خوش ہوا اور اپنے سیاف کو حکم دیا "بہتر ہے کہ زہر کے اس پیالہ کو توڑ دیا جائے۔"

لیکن لڑکی زور زور سے رونے لگی کہنے لگی "خانِ اعظم رحم۔ میں منحوس نہیں ہوں بلکہ شیشے کا وہ کنٹر منحوس تھا جس پر مصری منقوش کندہ تھا۔ اب وہ کنٹر میرے پاس نہیں ہے اسے سلطان خوارزم شاہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے بہت پسند تھا۔ میں منحوس نہیں ہوں۔ خانِ اعظم، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

خانِ اعظم نے ہاتھ کے اشارے سے جلاد کو توقف کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میری طرف دیکھا اور دریافت کیا "تو کیا کہتا ہے؟ کیا تو اسے قبول کرے گا؟"

مجھے لڑکی کی بات میں حقیقت کا شائبہ محسوس ہوا لیکن میں نے عرض کیا۔
"اگر خانِ اعظم رحم اور بندہ پروری سے کام لیں تو میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لئے رکھ کر امتحان کر لوں۔"

خانِ اعظم نے کرخت ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "دفعان ہو شیطان۔ یہ لڑکی تجھے کھا جائے گی۔ پھر مجھ سے کچھ نہ کہنا۔"

خانِ اعظم نے مجھے اتنی دولت سے سرفراز کیا کہ میں نے لوٹ میں جتنا نقصان اٹھایا تھا اس سے کئی گنا زیادہ پھر حاصل کر لیا۔

جب میں اپنے وطن تبریز پہنچا تو میرے خاندان والوں نے میرے مال و دولت کی افراط کے پیشِ نظر شاندار پذیرائی کی اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں نے اس لڑکی سے ڈرتے ڈرتے شادی کر لی۔ شادی کو سالہا سال گزر گئے لیکن کوئی خاص منحوس واقعہ پیش نہ آیا ہم دونوں شاندار خوش اور خرم زندگی گزارتے رہے۔
بعد میں اس نے مجھے یہ بتایا کہ شیشے کا گلدان بہت منحوس تھا جب تک وہ میری ملکیت رہا اپنی نحوست کے اثرات ظاہر کرتا رہا اور اس کو لے کر چنگیز خان کے پاس پہنچنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ اس کے زیرِ اثر خانِ اعظم کو تباہ و برباد کر دیا جائے لیکن وہی اور شکل خان اپنے آپ کو صاف بچا لے گیا۔
میں نے اس سے دریافت کیا "تم خانِ اعظم کو تباہ و برباد کیوں کرنا چاہتی تھیں؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "اس نے میرے دادا اونگ خان اور اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔"
میں نے پھر دریافت کیا۔ "اور اب تمہارا کیا ارادہ ہے کیا تم اب بھی خانِ اعظم کی بربادی اور تباہی کی خواہشمند ہو؟"
اس نے مسکراتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا "اب میں تبریز ہی میں رہوں گی۔ میں اس خوبصورت شہر کو کبھی نہ چھوڑوں گی۔"
میں نے دریافت کیا "اور مجھے؟"
وہ شرما کر ایک طرف بھاگ گئی "اور تمہیں بھی نہیں۔"

▼

برک کا غلام زادہ

وہ غلام نہیں تھا لیکن غلام بنا دیا گیا۔ اِس غلامی میں اس کا سب کچھ چھن گیا' عزتِ نفس' اَنا' وقار اور معلوم نہیں کیا کیا
عہدِ مملوکیہ مصر کی ایک ایسی داستان، جس میں انسانی نفسیات کی کرشمہ سازیاں اور زمانے کے نشیب و فراز کی نیرنگیاں ساتھ چلتی ہیں

اُس رات آسمان پر چاند بھی نہ تھا۔ برک تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ بستی کی گلیاں اور بازار سنسان تھے۔ اس سناٹے کو موذن کی آواز نے ختم کر دیا۔ وہ عشاء کی نماز کے لئے لوگوں کو بلا رہا تھا۔ اذان کے فوراً بعد ہی گلی کوچے روشن ہو گئے۔ لوگ ہاتھوں میں قندیلیں روشن کئے مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد کے باہر صدر دروازے سے متصل جو میدان تھا اس میں گھوڑوں اور خچروں پر آنے والوں نے اپنے جانوروں کو چھوڑ دیا تھا۔ چند غیر مسلم ان کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ برک کا بربری نسل کا رئیس بھی اپنے گھوڑے پر شاہانہ انداز سے نمودار ہوا۔ اس کے آس پاس اس کے خدمتگاروں اور مصاحبوں کا ہجوم تھا۔ یہ لوگ بھی گھوڑوں اور خچروں پر سوار تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس چپٹی ناک، چوڑے چہرے، گول ٹھوڑی اور سانولی رنگت سے کچھ کھلتے ہوئے رنگ کے شیخ کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ شیخ کا نام یعقوب تھا۔ یہ شخص بعض بڑی عجیب و غریب صلاحیتوں اور طرفہ مزاج کا مالک تھا۔ تجارت یہ کرتا تھا، سپاہی یہ تھا۔ برک کی پوری آبادی اس کی احسان مند تھی۔ وہ خود فخر یہ کہا کرتا تھا کہ اس کا سلسلہ نسب حضرت یوسف کے ان بھائیوں میں سے کسی ایک سے ملتا ہے جنہوں نے حضرت یوسف کو اپنے حسد سے قدم قدم پر تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ اس کا دادا مسلمان ہو گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے عادات و اطوار اب بھی یہودیوں جیسے تھے۔ طبیعت میں حرص بہت تھی۔ بات بات میں کاروبار کرتا تھا۔ اس کے مزاج میں سب سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس میں لذت آزاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی اس خصلت کا اس نے جس جس طرح اور جن جن موقعوں پر اظہار کیا تھا آج اس کے ذکر سے بھی کراہت ہوتی ہے۔

آج انہیں دہراتے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ جس رات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے میرے لئے قیامت کی رات تھی، میرا بوڑھا باپ موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ ساری ساری رات کھانس کر گزار دیتا۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ کے سوا کسی رشتہ دار کو بھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے اپنے خاندان کی بابت بس اتنا معلوم تھا کہ وہ بلخ کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ والد صاحب پر معلوم نہیں کیسی اُفتاد آ پڑی کہ وہ اچانک گھر چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت تھی، چنانچہ مجھے اپنے ساتھ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ اسکندریہ کے مضافات میں ان کی ملاقات یعقوب سے ہو گئی۔ یہاں یہ قاعدہ رائج تھا کہ جو لوگ کسی وجہ سے اپنے خاندان سے بچھڑ جاتے تھے انہیں بے یار و مددگاری کے عالم میں جو خاندان یا لوگ بھی پناہ دیتے وہ انہیں اپنا مملوک (غلام) سمجھنے لگتے تھے لیکن ان کی حیثیت زر خرید غلاموں سے ذرا مختلف ہوتی تھی۔ یہ لوگ محنت مشقت کر کے کچھ خاص شرائط کی تکمیل کے بعد آزاد

خاندان میں رشتہ بھی کر سکتے تھے۔ میرے والد نے اسی خیال کے پیش نظر یعقوب کی اعانت قبول کر لی تھی۔ یعقوب ان سے کھیتی باڑی کا کام لیتا اور معاوضہ میں کھانے، کپڑے کے علاوہ کبھی کبھار کچھ نقدی بھی دے دیا کرتا تھا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے اور والد صاحب بجھتے چلے گئے۔ وہ اکثر نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے ہی اپنا منہ شمال مشرق میں کر لیتے اور زیر لب معلوم نہیں کیا گڑگڑاتے رہتے۔ میرا خیال ہے انہیں اپنا وطن اور خاندان بہت یاد آتا تھا۔ اور خدا سے اسی سلسلہ میں گریہ وزاری کرتے تھے۔

مذکورہ رات سے کئی دن پہلے دو گھوڑ سوار گرد و غبار کے بادل اڑاتے ہوئے برک میں داخل ہو گئے۔ ان کا حلیہ مصریوں یا بربریوں جیسا نہ تھا۔ ان کے چہرے سرخ و سفید قد و قامت میں وجاہت اور گھوڑوں پر بیٹھنے کا ڈھنگ بڑا مغرورانہ تھا۔ انہیں یعقوب کے مکان کی تلاش تھی۔ لوگوں نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے یعقوب سے ملتے ہی دریافت کیا۔ "کیوں جناب کیا گاوردی یہیں رہتا ہے؟"

"گاوردی میرے باپ کا نام ہے۔" یعقوب نے تاجروں جیسی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ "ہاں یہیں رہتا ہے میں ابھی بلاتا ہوں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں میں سے ایک تو میرا چچا تھا دوسرا ماموں۔ یہ دونوں میرے والد کو واپس لے جانے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے والد کو بتایا کہ وطن میں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میری وجہ سے میری ماں کی حالت بہت غیر ہو چکی ہے لیکن والد پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ تو واپس جانے سے رہے اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں اگر چاہو تو اسے لے جا سکتے ہو۔

یعقوب کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ دونوں صاحبان کیوں آئے ہیں۔ وہ تو یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ چلئے دو مملوک اور ملے۔ ان کی محنت سے اس کی دولت میں اور اضافہ ہو جائے گا لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ والد کو واپس لے جانا چاہتے ہیں تو بہت جز بز ہوا اور بڑا ہنگامہ کھڑا کیا۔ اس نے حساب کتاب کی ایک فرد تیار کی جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ والد کی محنت کے ثمر سے زیادہ ان پر خرچ کیا جا چکا ہے۔ اس لئے گاوردی اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک اپنے ذمہ واجب الادا بیس ہزار درہم ادا نہ کر دے۔ دن رات کی محنت اور بیماری نے والد کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ یعقوب بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ والد صاحب اس کے لئے مفید نہیں رہے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اگر ان حالات میں بیس ہزار درہم لے کر پیچھا چھڑا لیا جائے تو سودا برا نہیں ہے۔ میرے چچا اور ماموں کے پاس بیس ہزار درہم موجود نہ تھے فیصلہ یہ ہوا کہ وہ دونوں وطن واپس جائیں اور وہاں سے مطلوبہ رقم فراہم کر کے والد صاحب کو چھڑا لے جائیں۔

اور یہ سارا کام کم از کم تین ماہ میں انجام پاسکتا تھا لیکن اس تصفیہ میں یعقوب کے لئے ایک بات قابل تھی۔ وہ یہ کہ تین ماہ کی مدت میں رقم میں اور اضافہ ہو جائے گا اس لئے بیس ہزار درہم کی بجائے پچیس ہزار کا انتظام کیا جائے۔ ان دونوں نے یعقوب کی اس کم ظرفی کو بھی گوارہ کر لیا لیکن یعقوب کی اصل بدنیتی تو اس وقت ظاہر ہوئی جب میرے چچا اور ماموں واپسی کے لئے تیار ہوئے اور یعقوب نے ان کے سامنے ان کے قیام اور خوراک اور دیگر مدارات کا حساب کتاب پیش کر دیا۔ ان دونوں کو اس حساب پر تعجب پریشانی اور ادائیگی میں تامل ہوا تو یعقوب نے بے مروتی سے کہا۔ "اگر تم کسی سرائے میں ٹھہرتے تو اس کا حساب کتاب چکاتے یا نہیں۔ میں تو سرائے کے حساب سے کچھ کم ہی طلب کر رہا ہوں۔"

دونوں نے خاموشی سے اس کا حساب چکا دیا اور وطن روانہ ہو گئے۔

والد صاحب عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی ہڈیوں میں بخار رہنے لگا تھا اور کھانسی نے الگ تنگ کر رکھا تھا۔ کمرے میں دو موٹی شمعیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں والد کا زرد اور سُتا ہوا چہرہ بڑا ہی سا ایک لگ رہا تھا۔ رخساروں کا گوشت گھل چکا تھا۔ جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں میں گھس گئی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں ان کے منہ کے سامنے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ہتھیلی کی پشت پر نسیں اس طرح اُبھری ہوئی تھیں جیسے خزاں رسیدہ پتے پر اس کے ریشے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تمہارے چچا اور ماموں واپس چلے گئے؟"

میں نے گردن ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ اس وقت میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل اندر سے رو رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو سہلانے لگے۔ بولے۔ "انہوں نے یعقوب سے غلط وعدہ کر لیا ہے۔ انہوں نے بیس پچیس ہزار درہم کے عوض میری آزادی کا سودا کیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب جب وہ واپس آئیں گے تو مجھے زندہ نہ پائیں گے۔"

میں رونے لگا۔ انہوں نے میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں رونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں میری زندگی سے سبق لینا چاہیئے۔ برسوں ہوا میں نے جعلی سکّے بنانے کی ایک غلطی کی تھی۔ اس جرم کا جب انکشاف ہو گیا اور حکومت کے کارندے مجھے پکڑنے آئے تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو وہاں کے مرّوجہ قانون کی رو سے مجھ کو ایک غلام کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔ میں نے فرار ہوتے وقت تجھ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اس وقت تو ڈھائی سال کا تھا۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور گلا رندھ گیا۔ کچھ دم لے کر بولے۔ "میں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ سپاہ گری کو چھوڑ کر کاشتکاری کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ بھی اس لئے کہ میں گمنامی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ یعقوب بدبخت نے مجھے پناہ دی اور یہ طے پایا تھا کہ میں اس کی زمین پر کاشت کروں گا، وہ میری کفالت بھی کرے گا اور محنت کا کچھ حصہ بھی دے گا لیکن بعد کے تجربات نے یہ ثابت کیا کہ یعقوب بہت حریص اور خودغرض ہے اس میں لذت آزاری کا مرض بھی موجود ہے۔ دوسروں کو دکھ پہنچا کے لطف حاصل کرتا ہے۔ بہرحال جو گزر گیا اس پر لعنت بھیجو۔ میری زندگی کے دن پورے ہوا چاہتے ہیں۔ تمہاری بابت یعقوب نے مجھ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب تم پوری طرح کام دھندے میں لگ جاؤ گے اور اپنے لئے علیحدہ ایک مکان بنا لو گے تو وہ تم سے اپنی لڑکی کلثوم کی شادی کر دے گا۔" پھر چھت کی طرف بے خیالی سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "لیکن مجھ کو اس کے کسی بھی وعدے کا اعتبار نہیں ہے۔"

اس وقت کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بے سدھ ہو کر چپ چاپ پڑ رہے۔ میں نے اٹھ کر انہیں پانی دیا۔ جب حلق تر ہوئی تو کھانسی کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ چند جملوں میں وصیت کی۔ "شادی، تم کاشتکاری کا پیشہ ہرگز نہ اختیار کرنا، تم سپاہی بننا، ایک سپاہی کے لئے دنیا میں بہت کچھ ہے۔ عزت، شہرت دولت، سیاحت لیکن ایک کاشتکار کے لئے کچھ بھی نہیں۔ جیتے جی قبر ہے اس کے لئے۔ اور کلثوم کا خیال بھی نہ کرنا۔ یعقوب کلثوم کا لالچ دے کر تمہیں کہیں کا بھی نہیں رکھے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم اپنے چچا اور ماموں کے ساتھ وطن واپس چلے جانا۔"

کمرے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں نے یہ بتایا کہ یعقوب عشاء کی نماز ادا کر کے واپس آ چکا ہے۔ یہ آہٹ کمرے کے دروازے پر آ کر ختم ہو گئی اور چپٹی ناک والا یعقوب اپنے مصاحبین کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ والد نے اٹھ کر بیٹھ جانا چاہا لیکن بیٹھا نہ گیا اس لئے لیٹے رہے۔ یعقوب نے دل آزاری کا تیر چلایا۔ "تم کو حفظ مراتب کا خیال تو رکھنا ہی چاہیئے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب سے تمہارا اور تمہاری بیوی کا بھائی یہ دونوں تم سے ملے ہیں تمہاری خودسری میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ اب تمہیں آرام نہیں کرنا چاہیئے۔ جلدی جلدی اور زیادہ سے زیادہ کام کر کے تم جتنی رقم بھی اتار سکو تمہارے اور تمہارے بیٹے کے لئے انتہائی مفید ہے۔"

والد نے غصے میں کہا۔ "اب میں کام نہیں کر سکتا شیخ! تم حد درجہ حریص اور خودغرض ہو۔ میں نے اپنی محنت سے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے کہ اگر تم میں ذرا سا بھی ضمیر ہوتا تو تم میرے قرض پچیس ہزار درہم طلب کرنے کے بجائے یہ رقم الٹے مجھ کو دیتے۔"

یعقوب غصے میں آگے بڑھا اور پے در پے کئی ہاتھ رسید کر دیئے۔ اس کے مصاحب کھڑے ہنس رہے تھے۔ میں تلملا گیا۔ دوڑ کر ان کے اوپر لیٹ گیا۔ والد صاحب کے منہ سے خون آ گیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور نقاہت کی وجہ سے آگے کچھ بھی نہ بول سکے۔ یعقوب واپس جاتا ہوا بولا "میں تین ماہ تک ان دونوں کا انتظار کروں گا۔ اگر وہ اس مدت میں رقم لے کر نہ آئے تو میں تمہیں اس کی وہی سزا دوں گا جو ہم قبائلیوں میں رائج ہے۔ میں برک کے بزرگوں اور عقلمندوں کو یکجا کر کے ان کے سامنے تمہارا معاملہ رکھ دوں گا پھر وہ جو فیصلہ دیں گے اس پر پوری بے دردی اور بے مروتی سے عمل کیا جائے گا"

والد صاحب کے کرب زدہ سکڑے ہوئے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یعقوب اپنے مصاحبین کے ساتھ واپس جا چکا تھا۔ والد نے آہستہ سے کہا "ہاں اگر اس وقت تک زندہ رہا تو جو جی میں آئے سزا دے لینا، احمق پاگل کہیں کا۔ میں چند دنوں کا تو مہمان ہوں۔"

اس وقت میری عمر اٹھارہ سال کی ہو گی۔ میں نے فن سپاہ گری بس اسی حد تک حاصل کیا تھا جتنا عام طور پر ہر انسان حاصل کرتا تھا لیکن والد صاحب کے بعد میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں کلثوم کو چاہتا تو ضرور تھا لیکن اس سے شادی کا سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ مجھے غلام سمجھتی تھی میں اس کے باپ کا پروردہ تھا چنانچہ میرے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ احتیاط اور تکلف کے ساتھ قائم رہے۔ وہ تقریباً میری ہم عمر تھی۔

تین ماہ پورے ہونے میں چار دن باقی تھے۔ یعقوب مجھے اندر لے گیا اور نہایت شفقت آمیز لہجے میں حکم دیا کہ "اب تم یہیں رہو۔"

میں اس کے اس نئے اور عجیب و غریب حکم کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ریشمی جالی کے کرتے پر کلابتو کے کام کی صدری پہنے ہوئے کلثوم نہایت رعونت سے ادھر ادھر پھرتی رہتی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ یعقوب نے چار کنیزیں خرید کر گھر میں ڈال لی تھیں۔ کلثوم ان سب کی چہیتی تھی۔ میں نے اکثر یہ محسوس کیا کہ جب میں کلثوم کو نہ دیکھتا تو وہ مجھے ضرور دیکھتی رہتی پھر جیسے ہی میری نظر اس کی طرف اٹھتی تو اس کی نظر ادھر ادھر بھٹک جاتی۔ یعقوب اور اس کی کنیزوں کا میرے ساتھ جس قسم کا شفقت آمیز سلوک تھا اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ کلثوم واقعی مجھ سے وابستہ کر دی جائے گی۔ جب سے میں اندر گیا تھا مجھے والد صاحب سے نہیں ملنے دیا جاتا تھا۔ یہ بات بھی ایک معمہ تھی مجھے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ سرکاری شفاخانے میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔

دوپہر کا وقت تھا یعقوب کی کنیزیں کھانے کے بعد قیلولے میں تھیں۔ یعقوب ظہر کی نماز باجماعت

پڑھنے مسجد جا چکا تھا میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا سنن ابن ماجہ پڑھ رہا تھا کہ دبے پاؤں کلثوم داخل ہوئی۔ اس نے شوخی آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ "شیخ! کیا پڑھ رہے ہو؟"

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے جواب دیا: "سنن ابن ماجہ۔"

کلثوم نے اضطراری لہجے میں کہا: "کچھ خبر بھی ہے تم کو قیامت کی گھڑیاں آنے والی ہیں؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا: "کیسی قیامت کی گھڑیاں؟"

کلثوم نے افسوس کرتے ہوئے کہا: "توبہ توبہ پرستار زادگی بھی کتنی بری شے ہے!!" لہجہ سے لمحہ بھر کے لئے احساس کمتری پیدا ہو گیا۔

اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا: "تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو تمہارے باپ کی زندگی سخت خطرے میں رہے گی۔"

میں نے مایوسی کا اظہار کیا: "ہم تمہارے والد کے مقروض ہیں۔ قرض کی ادائیگی کے بغیر ہم کس طرح جا سکتے ہیں؟"

کلثوم نے حقارت سے کہا: "احمق! زندگی کو بچانے کے لئے کسی بھی فعل سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا: "پھر آپ ہی بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"کرنا یہ کہ" وہ کہنے لگی۔ "میں پرسوں تک دو گھوڑوں کا انتظام کر دوں گی۔ پرسوں عشاء کی اذان کے فوراً بعد تم دونوں اس پر بیٹھ کر یہاں سے کہیں دور نکل جانا۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔"

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کہیں یہ لڑکی مجھ سے فریب تو نہیں کر رہی ہے لیکن اس نے میرا شک رفع کر دیا۔ "ایسا میں کسی لالچ میں نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم دونوں یہاں سے دفعان ہو جاؤ تاکہ وہ نہ ہو جس کا ابا نے ہم دونوں کی بابت فیصلہ کیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ شرما گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح وہ مجھے رد کر رہی ہے۔ مجھے دکھ پہنچا۔

میں نے کہا: "لیکن میرے والد تو سرکاری شفاخانے میں ہیں وہ کس طرح فرار ہو سکتے ہیں؟"

کلثوم نے جواب دیا: "یہ سب غلط ہے تمہارے والد تو یہیں موجود ہیں۔ اس حویلی میں۔ کمرہ البتہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔"

ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے باہر کوئی ہم دونوں کی بات چیت سن رہا ہے۔ کلثوم تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے ہی میں بھی نکلا۔ مریم نامی کنیز تیز تیز قدم اٹھاتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔

کلثوم بچھائے بغیر واپس آ گئی اس کے ساتھ ہی میں بھی کمرے میں داخل ہوا۔
کلثوم کچھ کھسیانی ہوئی سی، کہنے لگی "بڑا ہوا۔ یہ ساری باتیں ابا کو بتلا دے گی۔ اب تمہارا فرار ہونا بہت مشکل ہے۔"
اس کے بعد وہ فکر مند ہو کر چلی گئی۔ وہ کسی گن میں لگی تھی۔
رات کو عشاء کے بعد یعقوب میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "کل ہم لوگ شکار پر جا رہے ہیں۔ کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟"
میں نے جواب دیا "میں ابا کی تیمارداری کرنا چاہتا ہوں۔"
یعقوب نے اپنی ناک کے نتھنے چڑھائے اور تیز تیز سانس لیتا ہوا بولا "یہ بھی درست ہے۔ میں تم سے خوش ہوں۔ شادی تم میرے بیٹے کے مثل ہو۔"
اسی لمحے کلثوم آ گئی۔ یعقوب نے اسے دیکھتے ہی میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور بولا "کلثوم بیٹا! دیکھا تو نے یہ شادی کتنا بدمذاق ہے۔ میں اس کو شکار پر لے جانا چاہتا ہوں لیکن یہ جانے سے انکار کر رہا ہے۔" یعقوب کے رویے اور لہجے میں میرے لئے خلوص ضرور تھا۔ میں ذرا سی دیر کے لئے یعقوب کے پُرفریب سلوک سے متاثر ہو گیا۔ اس نے مجھے شکار پر ساتھ چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا اور میری درخواست بھی مان لی گئی کہ میں آخری وقت میں اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کروں۔
ساری رات شکار کی تیاریوں میں گزر گئی۔ فجر کی نماز پڑھ کر ساٹھ آدمیوں پر مشتمل یہ جماعت شکار کی مہم پر روانہ ہو گئی۔ مجھے یعقوب نے والد صاحب کے کمرے میں چھوڑ دیا۔ کلثوم نے سچ ہی کہا تھا کہ انہیں سرکاری شفاخانے نہیں حویلی کے ایک دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔
یعقوب کے شکار پر چلے جانے سے کلثوم بھی بے حد خوش تھی۔ اس نے اس دوران مریسیہ کنیز سے بھی معلوم کر لیا تھا کہ اس نے دونوں کی گفتگو کا ذکر یعقوب سے تو نہیں کر دیا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ کلثوم کو اطمینان ہو گیا اور اب پروگرام یہ بنا کہ آج رات کو عشاء کی نماز کے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد ہم دونوں کو فرار ہو جانا چاہیئے۔ دونوں گھوڑوں کی بابت یہ فیصلہ ہوا کہ وہ گھوڑے دروازے تک تو لانے سے رہی، ہاں اصطبل کو کھلا چھوڑ دے گی۔ ہم دونوں رات کی تاریکی میں اصطبل میں داخل ہو جائیں گے اور پھر ان میں جو دو گھوڑے پسند ہوں انہیں لے کر فرار ہو جائیں۔
میں کلثوم کا بے حد احسان مند تھا۔ جب والد صاحب کو اس تجویز کا علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اشک آلود آنکھوں سے دعا دیتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکی بہت آرام اور سکون سے

زندگی گزارے گی۔ اس نے دو مجبوروں کا ساتھ جوڑ دیا تھا۔

ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ آخر فرار ہو کر ہمیں جانا کدھر چاہیئے؟ والد صاحب نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا انہوں نے قاہرہ کا حکم دیا۔ اس زمانہ میں مملوک سلطان بیبرس کا سیارہ اقبال عروج پر تھا اور اس کا شہرہ سرزمین مصر سے نکل کر فرانس، جرمنی، پرتگال، بلجیم، اسپین اور انگلستان تک پہنچ چکا تھا۔ صحرائے گوبی کے منگول بھی اس کی ہیبت، دبدبے، تدبر اور سپاہیانہ فضیلت کے قائل تھے کیونکہ اس نے اپنے بارے میں لوگوں میں یقین اور اعتماد مقابلہ کے بعد پیدا کیا تھا۔ میں نے یہ بات کلثوم سے چھپائی کہ میں برک سے فرار ہو کر قاہرہ جاؤں گا۔

رات ہونے سے پہلے کلثوم کئی بار مجھ سے ملی۔ اس کا عجب حال تھا۔ اس کی اصل کیفیت یا احساسات کا میں صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ کبھی ملول اور افسردہ نظر آئی تو کبھی خوش اور بشاش۔ اس نے ایک درخواست ضرور کی وہ یہ کہ جب میں صحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں تو کسی بھی طرح اس کو اس سے مطلع ضرور کر دوں۔ میں نے اس کا وعدہ کر لیا۔

مغرب کے بعد میں اس حویلی کے در و دیوار حسرت سے دیکھتا رہا۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ذرہ ذرہ میرے پیر پکڑ رہا تھا۔ یہی حال والد صاحب کا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ گو کہ اس حویلی نے انہیں کوئی ایسا سکھ نہ دیا تھا جو قابلِ ذکر ہوتا پھر بھی والد صاحب کو اس جگہ سے محبت ہو گئی تھی۔ کئی بار تو یہ سوچا کہ اپنی تجویز پر عمل کرنے سے باز رہوں اور جو کچھ ہونے والا ہے ہو جانے دوں لیکن کلثوم نے اشارتاً یہ بتلایا کہ میرے والد کے ساتھ جتنا مہیب اور دردناک ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے اس کا میں اندازہ تک نہ کر سکتا تھا۔ جس وقت عشاء کی اذان کی صدا کانوں میں گونجی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں جو تھوڑا بہت سامان اپنے ساتھ لے کر جانے والا تھا۔ اس کو گٹھری کی شکل میں باندھ لیا۔ دو بستر اور دو کمبل بھی لپیٹ لئے۔ اذان کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد میں اصطبل کی طرف گیا۔ میں نے اس کے دروازے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں قفل نہیں پڑا ہے بلکہ صرف چٹخنی کنڈے میں پھنسی ہوئی ہے۔ اب مجھے اپنے پروگرام کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔

روانگی سے تقریباً پون گھنٹہ پہلے کلثوم ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں ارتعاش تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ گے!! جی چاہتا ہے نہ جانے دوں۔ روک لوں۔ لیکن، لیکن تم چلے جاؤ۔ میں نہیں روکوں گی تم دونوں کو۔"

اس وقت والد صاحب کے احساسات نہ معلوم کیا تھے۔ وہ ہم دونوں کو بہت محبت سے دیکھ رہے تھے۔ کلثوم ان کے پاس چلی گئی اور دریافت کیا۔ "محترم! کیا آپ اعتماد اور یقین کے ساتھ گھوڑے کی سواری کر سکیں گے؟"

والد صاحب نے زبردستی بشاشت پیدا کی، بولے۔ "بالکل حالانکہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں لیکن پھر بھی کم از کم دو سو میل کا سفر با آسانی کر لوں گا۔"

کلثوم نے کہا۔ "خدا آپ دونوں کی حفاظت کرے۔"

والد صاحب نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن وہ دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ چلتے چلتے کہتی گئی کہ "بس اب دیر نہ کیجئے نکل جائیے یہاں سے۔"

اس کے جاتے ہی میں اصطبل چلا گیا۔ وہاں کئی گھوڑے کھڑے تھے لیکن یہ معمولی گھوڑے تھے جو لمبے سفر میں ہمارا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ بہرحال پھر بھی جو ان میں سب سے اچھے گھوڑے تھے۔ دو گھوڑوں میں لگام ڈال کر زین کسی اور سامان لینے چلا گیا۔ دو مرتبہ میں سارا سامان اصطبل میں پہنچ گیا پھر والد صاحب کو لینے چلا گیا۔ انہیں لے کر جب میں اصطبل کی طرف جا رہا تھا تو کلثوم ایک بار پھر مجھے ملی اس کے ہاتھ میں تالا تھا۔ کہنے لگی۔ "تم جیسے ہی یہاں سے فرار ہو گئے میں اصطبل میں تالا لگا دوں گی۔ صرف اس لئے کہ دوسرے لوگ تمہارا تعاقب نہ کر سکیں۔" کلثوم قدم قدم پہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔

میں نے جلدی جلدی گھوڑوں پر سامان لادا، ان کے پیر آزاد کئے اور ایک پر اپنے بیمار باپ کو ڈالا اور دوسرے پر خود سوار ہو گیا۔ ہم دونوں نے ایڑ جو لگائی تو گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جب ہم حویلی سے نکل رہے تھے تو کلثوم کی نگاہیں جالیوں کے پیچھے سے ہمارا تعاقب کر رہی تھیں۔

جب ہمارے گھوڑے سرپٹ بھاگتے ہوئے حویلی کے صدر دروازے سے گزرے تو دربانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بعد میں پتا اور معلوم ہوا کہ وہ اصطبل کی طرف گئے لیکن اس میں قفل پڑا تھا اور کلثوم کے بقول اس کی کنجی یعقوب کے پاس تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ہم دونوں فرار ہو چکے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ پچاس میل کی مسافت طے کر لینے کے بعد کسی جگہ رُک کر دم لیں گے اس کے بعد آگے بڑھیں گے لیکن ابھی ہم نے بمشکل تیس میل ہی کا سفر طے کیا ہو گا کہ اپنے پیچھے بہت سے گھوڑوں کی ٹاپ سنی۔ ہم دونوں کے گھوڑے زیادہ تیز رفتار نہ تھے۔ اس لئے آنے والے لمحہ بہ لمحہ ہم سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے لئے ایک دشواری یہ بھی تھی کہ والد کی صحت قطعاً اس لائق نہ تھی کہ ہم اپنے گھوڑوں کو مسابقت کے انداز میں بھگا سکتے۔ میں نے عالم وحشت اور بدحواسی

میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میرے داہنی جانب بے پی درس کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ والد نے اپنے گھوڑے کو میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "شہزادی! ہمیں اپنے گھوڑوں کی رفتار کم کر دینی چاہیے اور پھر آہستہ آہستہ بے پی درس کے جنگل میں غائب ہو جانا چاہیے۔"

میں نے والد کے ساتھ ہی اپنے گھوڑے کو داہنی طرف موڑ دیا اور بتدریج دونوں گھوڑوں کی رفتار کم ہونے لگیں۔ اندھیری رات میں آواز کی آہٹ ہی سے کسی شے کی سمت متعین کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں جنگل میں داخل ہو گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر والد کو ایک اور ترکیب سوجھی۔ کہنے لگے۔ "تعاقب کرنے والوں کو گمراہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے ایک گھوڑے سے مایوس ہو جائیں، ہمیں فوراً خالی گھوڑے کو مار کر بھگا دینا چاہیے تاکہ لوگ اس کے پیچھے لگ جائیں اور ہم دونوں سر دست ایک گھوڑے پر سفر کریں۔"

لیکن مجھے اس سے اتفاق نہ تھا کیونکہ ابھی تک یہ بات قطعی نہ تھی کہ پیچھے آنے والے ہمارے دشمن ہی ہیں یہ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں جب میں نے اپنے اس شبے کا اظہار والد صاحب پر کیا تو انہوں نے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "تم ناتجربہ کار ہو۔ ٹاپوں کی آواز بتلا رہی ہے کہ یہ تعاقب کرنے والے ہیں۔"

والد نے فوراً ایک گھوڑے کو خالی ہنکا دیا لیکن ٹاپوں کی آوازیں اب بھی ہم سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پھر جنگل کے سرے پر یہ آوازیں رک گئیں۔ بہت سے آدمیوں کے گھوڑوں سے پھاندنے کی آوازیں صاف سنائی دیں۔ ہم دونوں جنگل میں زیادہ اندر نہیں گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آنے والے ہماری تلاش میں اندر زیادہ دور تک چلے جائیں گے اور اندھیرے میں ہمیں با آسانی تلاش کر لینا بہت دشوار ہے لیکن ہمارا یہ ذرا سا اطمینان اس وقت ایک دم رخصت ہو گیا جب پندرہ بیس مشعلیں یکے بعد دیگرے روشن ہو گئیں۔ اب ہمارا روپوش رہنا ناممکن تھا چنانچہ تلاش کرنے والے جلد ہی ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ایک آواز گونجی۔ "یہی ہیں وہ دونوں، یہ رہا ان کا گھوڑا سامان سے لدا ہوا۔"

اور پھر درختوں کو ہٹاتی ہوئی ایک مشعل ہمارے سر پر آ گئی اور ایک زوردار قہقہہ جنگل میں گونجا۔ "پکڑے گئے۔"

یہ چپٹی ناک والے یعقوب کی آواز تھی۔ اس کے بعد اس نے والد کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا۔ ان کی چیخ نکل گئی۔ میں نے انہیں بچانا چاہا لیکن مجھ کو دو دوسرے آدمیوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

والد صاحب چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ "ظالمو! میں نے یہ سب کچھ ظلم سے نجات پانے کے لئے کیا تھا۔ اور یہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔"

یعقوب انہیں بالوں سے کھینچتا ہوا باہر لے جانے لگا۔ مجھے اس کا نہایت مجبوری اور دکھ کے ساتھ احساس ہو رہا تھا کہ جھاڑیوں کے خاردار پودے والد کے جسم کو چھلنی کر دیں گے۔

جنگل کے باہر بیس پچیس سوار اپنے گھوڑوں سمیت اکٹھے ہو گئے۔ خالی گھوڑا ابھی پکڑا گیا تھا۔ والد کو رسیوں سے جکڑ کر اس پر ڈال دیا گیا۔ مجبوری اور بے بسی کے اس احساس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری تھا۔ احساس کے ساتھ جوش اور غصہ بھی تھا۔ میں نے اسی وقت یہ تہیہ کر لیا کہ مجھے اعلیٰ درجہ کا سپاہی بننا ہے۔

دوسرے دن رات کو اسی وقت جب ہم فرار ہوئے تھے وہ خوفناک اور لرزہ خیز کھیل کھیلا گیا۔ کلثوم نے ایک بوڑھی کنیز کے ذریعے مجھے مطلع کیا کہ "جو کچھ ہونے والا ہے اس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس لئے قوت برداشت پیدا کرو۔ مستقبل تمہارے ساتھ ہے۔"

ہمارے تعاقب کے بارے میں اس نے یہ بتلایا کہ مرسیہ نے یعقوب کو سب کچھ بتا دیا تھا اور شکار کا محض ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے باپ کی وہ گفتگو یاد دلائی جس میں اس نے مجھے شکار میں ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے کہلوایا تھا کہ کیا تمہیں اب بھی اس میں چھپا ہوا طنز محسوس نہیں ہوتا؟ یعقوب کے شکار جنگلی جانور نہیں تم دونوں تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں بربر کے بزرگ اور دانشمند سر جوڑ کے بیٹھے اور یعقوب نے ان کے سامنے ہمارے والد کا مقدمہ پیش کر دیا۔ انہوں نے بزرگوں اور دانشمندوں کی اس مجلس کو اس مقدمہ کی رُوداد کچھ اس طرح سنائی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ والد صاحب یعقوب کے نہ صرف مقروض ہیں بلکہ وہ فرار ہونے کے جرم کے ساتھ ساتھ چوری کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ انہوں نے پانچ ہزار درہم کی چوری کی ہے۔ والد نے اس سے انکار کیا لیکن بزرگوں اور داناؤں کی مجلس نے والد کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اسلام میں چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور قبائلی اور علاقائی قانون میں چور اور بھگوڑے غلام کی سزا موت ہے۔ ایسی موت جو مجرم کو پہاڑی سے لڑھکا کر دی جاتی ہے۔ چونکہ ایک ہی وقت میں ہاتھ کاٹنے اور پہاڑی سے لڑھکا کر ہلاک کرنے کی سزائیں نہیں دی جا سکتیں اس لئے ایک سزا پر اکتفا کیا گیا۔ وہ ایک سزا تھی مجرم کو پہاڑی سے لڑھکا کر ہلاک کر دینا۔ مجلس نے یقین دلایا کہ اس کا یہ فیصلہ خدا، اس کے رسول اور قبائل کے علاقائی قانون کے مطابق ہے۔

فیصلے کے آخر میں ان بزرگوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر ارشاد فرمایا۔ "خدا ہم سب کو قانون

اور قانون کے مطابق زندگی گزارنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔" ایسا محسوس ہوا جیسے میری چیخ نکل گئی لیکن والد کا چہرہ ہر قسم کے جذبات کے تاثرات سے عاری تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس فیصلے کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے کعبہ کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "یا رسول اللہؐ! گواہ رہیو کہ میں بے گناہ ہوں۔"

سہ پہر کو یعقوب نے مجھے سمجھایا۔ اس نے کہا "شادی تم میرے بیٹے ہو۔ تم آزادی اور بے فکری سے رہو۔ تم نوجوان ہو اور نوجوانوں سے غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں اس لئے تمہیں بزرگوں اور دانشمندوں کی مجلس نے نظرانداز کر دیا ہے۔"

پھر کچھ ٹھہر کر میرے جذبات کا اندازہ لگا کر پھر بولا "خلیفہ دوم عمرؓ نے اپنے بیٹے کو کوڑوں کی سزا سے ہلاک کر دیا تھا۔ اسلام ہمیں جرم و سزا کے معاملے میں ہمت، حوصلے اور کشادہ دلی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور پھر ایک ایسے بوڑھے کی زندگی کا کیا فائدہ جو ہم سب کے کسی کام کا بھی نہیں رہ گیا۔ تم میرے بیٹے ہو اور میں اب بھی اس عہد پر قائم ہوں کہ اگر تم اپنے لئے اپنی محنت سے ایک مکان تعمیر کر لو گے تو کلثوم تمہاری ہو جائے گی اور اس شرط کی تکمیل کی راہ میں تمہیں میرا پورا پورا تعاون حاصل رہے گا۔"

میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں چپ چاپ خاموشی سے اس آتش سیال کو جو میری رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش میں تھی برداشت کر گیا۔ یعقوب سے انتقام اور کلثوم کی حصولیابی بس یہ دو مقاصد میری سب سے بڑی خوشی اور آرزو بن گئے تھے۔

کلثوم بھی مجھ سے ملی۔ وہ بہت اداس تھی۔ وہ مجھ سے آنکھیں نہ ملا سکی نظریں جھکائے جھکائے کہنے لگی "شادی! میں قبل از وقت تعزیت کے لئے آئی ہوں۔"

میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو۔ کیا تمہارے بزرگوں اور داناؤں کی مجلس کا فیصلہ کچھ کم تھا۔"

کلثوم نے تلخی سے جواب دیا "اس فیصلے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں ریاکار نہیں ہوں شادی! مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے لیکن محبت نہیں۔ انسانی ہمدردی، ایک طویل عرصے تک ساتھ رہنے کی ہمدردی۔ تم ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ میں خوشامد میں جوانی کے خاص جذبے کے زیر اثر تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کر کے خود کو بے گناہ ثابت کر رہی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ فوراً واپس چلی گئی۔ اس وقت میں جس کرب اور اذیت میں مبتلا تھا اس میں میں نے کلثوم کے اس رویے کا کوئی اثر نہ لیا۔

عشاء کی نماز کے چند گھنٹے بعد پورا برک مشعلوں کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ ایک ہجوم یعقوب کی حویلی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے آتے ہی والد کو اسی گھوڑے پر جس پر فرار ہونے کی کوشش کی گئی تھی باندھ کر ڈال دیا گیا۔ وہ کراہ رہے تھے لیکن ان ظالموں پر والد کے کراہنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ لوگ افریقی جنگلیوں کے انداز میں ڈھول تاشے پیٹتے ہوئے برک کی مشرقی عمودی چٹانوں کی طرف چل پڑے۔ ان کے چلنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی بڑا قلعہ سر کر کے واپس ہو رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ سب چٹانوں کے دامن میں پہنچ گئے۔ دیوانہ جلوس یہیں بدل گیا۔ ایک بدبخت بدشکل اور خبیث بربری نے والد کو گھوڑے سے اتارا۔ رسی کی بندشیں دور کیں اور انہیں بالکل آزاد کر کے سیدھا کھڑا کر دیا۔ ان کے قریب ہی شراب کا ایک خالی ڈرم لا کر رکھ دیا گیا۔

ایک بوڑھے بربری نے والد سے کہا: "خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو تاکہ یہ آخری اور زندگی کی سب سے بڑی اذیت میں کمی ہو جائے۔ بے شک خدا ستار اور غفار ہے۔"

والد نے آسمان کی طرف دیکھا اور رقت آمیز لہجے میں کہا: "خدایا! میں بے گناہ ہوں۔ یہ ظالم مجھ سے میری بے گناہی کی معافی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں تجھ سے انصاف اور اجر کا طالب ہوں۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک شفقت آمیز نظر مجھ پر ڈالی اور زور سے کہا: "شادی! یہ لوگ ظالم ہیں اور ساتھ ہی بدعہد بھی ان پر کبھی بھی بھروسہ نہ کرنا۔"

یعقوب تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے میرے والد کو اٹھا کر شراب کے خالی ڈرم میں ٹھونس دیا۔ ڈھولوں اور نقاروں پر چوٹ پڑی اور اس شور میں نہایت بے دردی سے ڈرم کا منہ بند کر دیا گیا اس میں سے والد کی چیخیں آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب اس کا منہ بند کر کے اس میں بڑی بڑی کیلیں ٹھونکی جانے لگیں تو ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ مجھے دو آدمیوں نے جکڑ رکھا تھا۔ پھر اس ڈرم کو لے کر لوگ پہاڑی چٹان پر چڑھنے لگے۔ جب یہ اوپر چڑھ گئے تو ان کے پیچھے ہی یعقوب بھی پہنچ گیا۔

یکایک ڈھولوں اور نقاروں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اب یعقوب کے برابر ہی برک کا معمر ترین بزرگ کھڑا ہو گیا۔ یہ بوڑھا بستی کے بزرگوں اور داناؤں کی مجلس میں بھی موجود تھا۔ تھوڑی دیر تک معلوم نہیں کیا بڑبڑاتا رہا۔ ڈرم اس کے قدموں میں رکھ دیا گیا۔ بوڑھا جب بڑبڑا چکا تو اس نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے اس کے ساتھ ہی سبھی ہاتھ اٹھ گئے۔ مشعلوں کی روشنی میں پہاڑی دہک رہی تھی اور پورا ماحول آسیب زدہ نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے شیطان نے دعا ختم کر کے دونوں ہاتھ رخساروں پر پھیر لئے۔ بوڑھے نے اپنے پیروں سے ڈرم کو دھکا دیا اور یعقوب نے پوری قوت سے ڈرم کو نشیب کی طرف

لڑھکا دیا۔ ڈھولوں اور نقاروں نے پھر شور کرنا شروع کر دیا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے ماموں اور چچا بھی آچکے تھے اور ان کا یعقوب سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ یعقوب یہ کہہ رہا تھا کہ تم وقت پر نہیں آئے۔ ماموں یہ کہتے تھے کہ وقت پر نہ آنے سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ تو کا دروی کو ہلاک کر دے گا۔ چچا قصاص لینے پر تلے ہوئے تھے۔ یعقوب اس پر مصر تھا کہ خیریت اسی میں ہے کہ پچیس ہزار درہم دے کر واپس چلے جاؤ ورنہ تم دونوں کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی۔

بالآخر اس پر تصفیہ ہو گیا کہ پچیس ہزار درہم اس شرط پر یعقوب کو دے دیئے جائیں گے کہ وہ والد کی لاش ان کے حوالے کر دیں۔ یعقوب کو کیا انکار ہو سکتا تھا وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ لاش کو ڈرم سے نکالا گیا۔ جاں کنی کی تکلیف مرنے کے بعد بھی چہرے سے عیاں تھی۔ آنکھیں حسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ سر اور جسم کے مختلف حصوں سے خون رِس رہا تھا۔ کئی جگہ کی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ میں پھر رونے لگا۔ چچا اور ماموں نے بھی آنسو بہائے۔ ماموں نے رقت سے کہا۔ "جو لوگ کارواں سے بچھڑ جاتے ہیں انہیں منزل نہیں ملتی۔" میرا خیال تھا وہ رات برک ہی میں گزاریں گے لیکن وہ لاش کو لے کر فوراً ہی واپسی پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے یعقوب سے کہا۔ "کا دروی کے بعد ہمیں اس لڑکے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اسے رکھنا پسند کرو گے؟"

ان کا یہ اشارہ میری بابت تھا۔ یعقوب نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ میرے ساتھ رہے گا لیکن اگر تم اسے بھی لے جانا چاہو تو اتنی ہی رقم اور حاضر کر دو اور اسے بھی لے جاؤ۔"

ماموں نے کہا۔ "میں اس پر ایک درہم بھی خرچ نہ کروں گا۔ یہ تجھی کو مبارک رہے۔"

اس کے بعد وہ میرے قریب آئے اور آہستہ سے کہا۔ "شادی! تم کچھ دن خاموش رہو میں عنقریب تمہیں لینے آؤں گا۔"

وہ بھی کتنا دردناک منظر تھا کہ مشعلوں کی روشنی اور لوگوں کے ہجوم میں ہم برک کی بستی کی طرف جا رہے تھے اور میرے چچا اور ماموں والد مرحوم کی لاش لے کر واپس ہو رہے تھے۔ یعقوب بے حد خوش تھا کہ والد کو من مانی سزا بھی دے لی اور ان کی لاش کے معاوضہ میں پچیس ہزار درہم بھی وصول کر لئے۔

اس واقعہ کو پندرہ دن گزر گئے۔ اس درمیان کلثوم سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یعقوب مجھ پر بے حد مہربان تھا لیکن میں اپنے دل میں طے کر چکا تھا کہ کچھ بھی ہو والد کا انتقام ضرور لینا ہے۔ اسی دوران کلثوم سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یعقوب میرے باپ کا اتنا دشمن کیوں ہو گیا تھا۔ دراصل اسے یقین کی حد

تک شک ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی کنیز چھپ کر ولید سے ملتی ہے اور ان دونوں نے یعقوب کے قتل کا کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے۔ اس کے پاس اس ناقابلِ یقین خبر کا کوئی یقینی ثبوت نہ تھا لیکن یعقوب کا قول تھا کہ جس جگہ دھواں نظر آئے وہاں آگ کی موجودگی یقینی ہے اور دھوئیں پر جتنا آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے آگ پر نہیں۔ چنانچہ انہوں نے دھواں دیکھ لیا تھا اور اس پر آسانی سے قابو پا لیا تھا۔

یعقوب مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتا رہتا۔ دولت اس طرح جوڑی جاتی ہے، جائیدادیں یوں بنتی ہیں، ملوک کس طرح ملتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ محنت اور کم سے کم اس کا معاوضہ کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اب اس حویلی میں یعقوب اور کلثوم کے بعد میں تیسرا صاحبِ اختیار شخص تھا۔ لیکن میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ یعقوب نے درمیان سے مکان بنانے کی شرط بھی ہٹا دی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں کلثوم سے شادی کر لوں اور اس گھر کا باقاعدہ ایک فرد بن جاؤں لیکن مجھے یوں تامل تھا کہ میں یعقوب کو اپنا خسر بنانے میں شرمساری اور بے غیرتی محسوس کرتا تھا۔ کلثوم کو بھی انکار تھا اور اس انکار کی وجہ یہ بتاتی کہ یعقوب اور میری حیثیت حکایت کے اس سانپ اور آدمی جیسی ہے جو ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ اتفاقاً ایک دن سانپ نے اس آدمی کے جوان لڑکے کو ڈس لیا۔ آدمی اسے مارنے دوڑا۔ لیکن سانپ نے بل میں گھس کر اپنی جان بچا لی۔ لڑکا مر گیا۔ کچھ سال بعد اس آدمی کی نظر سانپ پر پھر پڑی۔ سانپ بھاگا۔ لیکن آدمی نے پکار کر کہا کہ اے ناگ! ہم دونوں ہی کو اسی گھر میں رہنا ہے جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اگر میں تمہیں مار بھی دوں تو لڑکا تو زندہ ہونے سے رہا۔ اس لئے اب بہتری اسی میں ہے کہ ہم دونوں صلح صفائی اور میل محبت سے رہیں۔ سانپ نے بدستور بھاگتے ہوئے کہا تھا کہ نہ بابا! ہم دونوں میں دوستی نہیں ہو سکتی جب تک تیرے دل میں جوان بیٹے کی موت کا زخم اور میرے ضمیر میں جرم کا چور موجود ہے دونوں کے دل مل ہی نہیں سکتے۔ دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ کلثوم نے یہ حکایت سنا کر کہا کہ والد تو سٹھیا گئے ہیں۔ انہوں نے تمہارے ساتھ جو ظلم کیا ہے اس کے بعد بھی وہ تم سے کسی اچھے سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں؟

ابھی ہم لوگ اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ چار ہزار سپاہیوں نے برک کا محاصرہ کر لیا۔ ان میں ماموں اور چچا پیش پیش تھے۔ برک والوں نے تلواریں سنبھالنا چاہیں لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ملوک حکمران بیبرس کے سپاہی ہیں تو سبھی کے حوصلے جاتے رہے۔ سپاہیوں کو یعقوب کی تلاش تھی۔ میرے ماموں اور چچا نے مجھ سے دریافت کیا کہ یعقوب کہاں ملے گا۔ کلثوم نے اسے تہہ خانے میں چھپا دیا تھا۔ میں نے نشاندہی کر دی۔ بیبرس کے سپاہیوں نے اس کو تہہ خانے سے باہر نکال لیا۔ دوپہر کی دھوپ میں بستی

لڑکے مردوں کو ایک طرف کھڑا کیا گیا۔ بوڑھوں کو دوسری طرف، عورتیں الگ جمع کی گئیں۔ لڑکوں میں وہ مسلمان بھی تھا جس نے میرے والد کے ورثہ کو پہلی ٹھوکر لگائی تھی۔ یعقوب کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اچانک چار ہزار سپاہیوں کے ہجوم سے ایک میانہ قد کا شخص باہر نکلا۔ بال سرخ، چہرہ کشادہ لیکن دھوپ سے سنولایا ہوا ایک آنکھ زخم کے نشان سے بند ریشمی لباس پر مخمل کی صدری، سر پر منقش خود اور اسی خود پر دستار تھی۔ تلوار بائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے پرجوش اور بھاری آواز میں کہا۔

”تم لوگ مسلمان ہو، مملوک بھی مسلمان ہیں۔ تمہارے ہاتھوں ایک مملوک کی جان جس طرح ضائع ہوئی ہے انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے کہ تم سب اسی طرح ہلاک کر دیئے جاؤ لیکن صلیبیوں اور منگولوں کے پیش نظر ہمیں باہمی اتحاد ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔ یعقوب کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ پچیس ہزار درہموں کے ساتھ ہی دو لاکھ درہم گاوردی کی موت کے قصاص میں ادا کرے اور اس کی اسی وقت تعمیل ہوگی۔“

یعقوب کی طبع یہاں بھی باز نہ آئی بولا۔ ”لیکن میں نے گاوردی کے بیٹے شادی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے گاوردی کا قصاص ظاہر ہے کہ شادی کا حق ہے اور میں تو اپنی کل جائیداد شادی کو دینے پر آمادہ ہوں۔“

سرخ بالوں والا دہاڑا۔ ”او بدبخت احمق، یہودی کی اولاد! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ دو لاکھ پچیس ہزار درہم دے کر فوراً حساب صاف کر دے ورنہ تیری بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔“

اس نے جوان عورتوں کو اپنی فوج میں تقسیم کر دیا اور بوڑھوں کو زندہ رہنے اور آہیں بھرنے کے لئے برک ہی میں رہنے دیا۔ بچے قاہرہ روانہ کر دیئے گئے۔ جوانوں کو فوج میں جبری بھرتی کر لیا گیا۔ ان مظالم کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ برک کے لوگ یہودی نسل کے منافق مسلمان ہیں جن کا ان ہنگامی اور نازک حالات میں بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

یعقوب نے جبراً و قہراً قصاص کی مطلوبہ رقم حاضر کر دی۔ کلثوم چچا کے حوالے کر دی گئی اور میرے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ اس لشکر میں شامل ہو جاؤں اور بہترین سپاہی بننے کی کوشش کروں۔ والد مرحوم کی آخری خواہش یوں پوری ہو رہی تھی۔ یعقوب کو بستی میں بوڑھوں کے ساتھ کڑھنے یا سسک سسک کر جینے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے بڑی منت سماجت کی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان تمام باتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ ”یہودی رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔“

میرے ماموں اور چچا کلثوم کو لے کر وطن روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے یہ کہتے گئے کہ چند ماہ بعد ہم قاہرہ پہنچیں گے۔ کلثوم تمہاری امانت ہے جب ہم تمہیں وطن واپس لے جائیں گے تو کلثوم تمہیں صحیح سلامت

ملے گی۔"

ہم لوگ طرابلس کی طرف روانہ ہو گئے کیونکہ یہ لشکر بیبرس کے ان سفیروں سے تعلق رکھتا تھا جو سلطان کا ایک خاص فرمان انطاکیہ کے بادشاہ بوہے منڈ کے نام لے جا رہے تھے۔ بوہے منڈ ان دنوں مسلمانوں سے بہت ناخوش تھا۔ چاروناچار ہمیں اس کو تسلیم کرنے کے بعد وطن واپس روانہ ہو گئے۔

بیبرس نے ایوبی حکومت کے بوسیدہ ایوان پر اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ مصر اور شام میں اسی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ بیبرس نے کسی کی مدد کے بغیر بغداد کی طرف بڑھنے والے منگولوں کے طوفان بلاخیز کا منہ موڑ دیا تھا اور اب وہ صلیبی مجاہدین کو للکار رہا تھا اسے معلوم ہوا تھا کہ انطاکیہ کا بادشاہ بوہے منڈ طرابلس کے محل میں بیٹھا ہوا عالم اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف ہے۔ یہ وفد بوہے منڈ سے جواب طلب کرنے جا رہا تھا۔ مجھ پر ان کی نظر عنایت اس لئے خاص تھی کہ بیبرس میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ بیبرس کے کارناموں اور اس کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں اتنی کہانیاں مشہور تھیں جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہارون رشید کی رُوح بیبرس کے وجود میں حلول کر گئی ہے۔ وہی بھیس بدل بدل کر ملک کے حالات کا جائزہ لینا ہے وہی زندہ دلی، وہی ذہانت، وہی شجاعت، وہی عزیمت و فراست۔

بانیاس کے سرخ ٹیلے ہمارے سامنے تھے۔ یہیں دریائے اردن کا پانی زمین کے اندر بہتے بہتے ایک بار پھر سطح زمین پہ نمودار ہو جاتا ہے۔ فوج نے یہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔

دو دن بعد بیبرس کے سفیر بوہے منڈ کے قلعے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان سفراء میں وہ دیو قامت بائیں ہاتھ میں تلوار سنبھالنے والا بھی شامل تھا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے سفراء کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ بوہے منڈ نے انہیں فوراً طلب کیا۔ ہم لوگ جب محل کے بالاخانے پر پہنچے تو نائٹوں اور مسلح سپاہیوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد بوہے منڈ بھی آ گیا۔ یہاں سفراء کے قائد نے جس بے باکی اور جرأت سے بوہے منڈ سے گفتگو کی۔ میرے لئے یہ منظر ہی کچھ عجیب تھا۔ وہ بوہے منڈ پر بیبرس کی طرف سے یہ الزام لگا رہا تھا کہ اس نے بیبرس کے خلاف منگولوں اور صلیبیوں سے نامہ و پیام جاری کر رکھا ہے۔ کیوں نہ اس معاملے میں طرابلس اور انطاکیہ کے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے۔ اس گفتگو کی خاص بات یہ تھی کہ سفیروں کا قائد بوہے منڈ کو بادشاہ کی بجائے کاؤنٹ کہہ کر مخاطب کرتا رہا۔ بوہے منڈ اور اس کے امراء ان سفیروں کے لہجہ میں سخت اہانت محسوس کر رہے تھے

بو بے منڈ نے انہیں ٹوکا بھی کہ وہ کاؤنٹ سے نہیں شاہ سے مخاطب ہیں لیکن ہیبرس کے سفیر اس پر مُصر رہے کہ انہیں یہی ہدایت کی گئی ہے کہ بو بے منڈ کو کاؤنٹ ہی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔
بو بے منڈ کے حاجب نے شاہ کے مشورے کے بعد وفد کے قائد کو سرزنش کی۔ "تم یا تو تہذیب سے بات کرو یا خاموش ہو جاؤ۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ میرا آقا شاہ انطاکیہ ہے تمہیں بھی شاہ کے کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔"
مملوک وفد کے قائد نے اسی جرات و دلیری سے جواب دیا۔ "صاحبان! مجھے یہ ہدایت ملی ہے کہ میں تمہارے شاہ کو کاؤنٹ کہہ کر مخاطب کروں۔ میں اپنے الفاظ اور لہجے میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔"
بو بے منڈ نے مسلح محافظوں اور نائٹوں کو اشارہ کیا کہ انہیں حراست میں لے لیا جائے۔ اسی وقت دیو قامت سائیس جو ابھی تک گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہوئے تھا آگے بڑھا اور مملوک وفد کے سردار کے پاؤں چھو لیے۔ مملوک قائد فوراً بول اٹھا۔ "اچھا جناب پرنس آپ مطمئن رہیں۔"
اس کے بعد امن و آشتی کے ماحول میں گفتگو شروع ہو گئی۔ لمبا تڑنگا سائیس ادھر اُدھر دلیری سے ٹہلنے لگا۔ وہ قلعہ کی دیواروں اور سپاہیوں کے ہتھیاروں کا جائزہ لیتا رہا۔
کافی دیر بعد جب یہ لوگ وہاں سے واپس ہوئے تو دیو قامت سائیس خود بھی ایک تازی گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا۔ جب ہم لوگ طرابلس کے باہر آ گئے تو دیو قامت سائیس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ بو بے منڈ کا مذاق اڑاتا ہوا بولا۔ "احمقوں کے بادشاہ! اب معلوم ہو گیا کہ تو کتنا بڑا بادشاہ ہے۔ کاؤنٹ کہیں کا۔"
یہ بیبرس تھا جو بو بے منڈ اور اس کے امرا کی نفسی کیفیات کا جائزہ لینے خود پہنچ گیا تھا۔ مجھ پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ جب میں قاہرہ واپس پہنچا تو میں قطعی اس موڈ میں نہ تھا کہ وطن واپس جاؤں۔ میں بیبرس کے آس پاس رہ کر باپ کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ چھ ماہ بعد میرے ماموں نے مجھے واپس لے جانا چاہا لیکن میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے ساتھ ایک غلام بھی تھا۔ اس نے چپکے سے ایک خط مجھے دیا۔ یہ کلثوم کا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔
"شادی! میں اپنے باپ کی بداعمالیوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔ تم فوراً آؤ اور مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ تمہارے گھر والوں کا میرے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے۔ میرا باپ بُرا آدمی ہے لیکن اس نے تمہیں ہمیشہ آرام سے رکھا۔ تمہارے گھر کے لوگ میرے دشمن ہو رہے ہیں اگر تم نہ آ سکے تو میں مجبوراً وہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گی جس کی تم امید بھی نہ کرتے ہو گے۔"

یہ خط پڑھ کر میں واپسی کے لئے آمادہ ہو گیا۔

جب میں برک میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یعقوب نے پہاڑی سے خود کو گرا کر ہلاک کر لیا ہے
یہ وہی پہاڑی تھی جہاں سے والد مرحوم کو ڈرم میں بند کر کے لڑھکایا گیا تھا۔

جب میں وطن واپس پہنچا تو پورے خاندان میں زلزلہ سا آ گیا۔ میری بوڑھی ماں مجھ سے لپٹ گئی۔ اسے یقین نہ آتا [redacted] کہ اس کا وہ ڈھائی سال کی عمر میں بچھڑ جانے والا بچہ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔

کلثوم کی صحت بہت زیادہ گر چکی تھی۔ میں تین ماہ رہ کر والدہ اور کلثوم کو لے کر برک واپس آ گیا۔ یہاں کلثوم کی اتنی جائیداد تھی کہ اس کی دیکھ بھال میرے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ یعقوب کی کنیزوں نے حصے بخرے کرنے پر بڑا شور وغل مچایا۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ ساتھ رہیں گی تو ان کی ذمہ داری اور کفالت گوارا کر لی جائے گی ورنہ ایک پیسہ نہیں ملے گا۔

اور اب کلثوم کو پا جانے کے بعد جبکہ میں اس کی جائیداد اور املاک کا واحد مالک قرار پا گیا ہوں اس تذبذب کا شکار ہوں کہ اب بھی میں والد مرحوم کی خواہش پوری کر سکوں گا یا نہیں؟

عشقِ بلقیس

ملکۂ سبا بلقیس کی دلکش اور پُر اثر داستان کہانی۔ کہتے ہیں ملکۂ سبا کو شکار کا شوق تھا اور وہ نسیان کے عارضے میں مبتلا تھی۔ ایک ایسے ہی موقعے پر جبکہ اس نے ایک بد صورت شہزادے کا شکار کیا تھا اور نسیان کے عارضے میں مبتلا ہو گئی تھی اسے تاریخ کے ایک ایسے سانحے سے دوچار ہونا پڑا جس میں مایوسی اور ناکامی کے دبیز و عمیق ویرانے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دلوں کو پگھلا دینے والی پُرسوز و حسین ترین کہانی

پہاڑ کی چوٹی پر مارب کا قلعہ صاف نظر آرہا تھا۔ پہاڑ کے آس پاس گنجان آبادی کے محلے سامنے تھے۔ حبشہ کا شہزادہ اکثوم اپنی عمر کے اٹھارھویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا قیمتی مشکی گھوڑا شاہانہ دبدبے کے ساتھ مارب کے قلعہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نوعمر شہزادے کے دائیں جانب اس کا اتالیق اور فلسفی عریب اور بائیں طرف شوخ اور چرب زبان سندی تھا۔ یہ دونوں بھی گھوڑوں پر سوار اپنی دلچسپ اور دانشمندانہ باتوں سے شہزادے کا دل بہلا رہے تھے۔ ان تینوں کے جلو میں ان کا لشکر تھا۔ لشکر کے پیچھے مختلف مسالوں اور خوشبویات سے لدے پھندے خچر اور اونٹ تھے۔ شہزادے کا رنگ سیاہ، بال گھنگریالے اور اعضاء مضبوط تھے۔ دھوپ کی تمازت سے چہرے پر پسینے کے قطرات چمک رہے تھے۔

شہزادے نے مارب پہاڑ کی چوٹی پر دمکتے ہوئے قلعے کی طرف نظریں جمائے ہوئے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیوں عریب! خدا تمہیں حبشہ کی لطیف ہواؤں سے دوبارہ لطف اندوز کرے۔ ذرا بتلانا تو یہ پہاڑ پر کیا چیز دمک رہی ہے؟"

عریب نے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "شہزادے! یہ بلقیس کا قلعہ ہے۔ سبا کی ملکہ اسی قلعہ میں رہتی ہے۔"

شہزادے کے چہرے پر تازگی پیدا ہو گئی۔ عریب نے اسے محسوس کر لیا کہنے لگا "جب میں حبشہ سے شہزادے کے ساتھ چلا تھا تو شہزادے کے بزرگوں نے مجھے یہ اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔ کہ شہزادہ نوجوانی کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اور سبا کی ملکہ بلقیس نہ صرف غیر معمولی ذہین اور حسین ہے بلکہ اُسے شکار کا بھی بہت شوق ہے۔"

اب چرب زبان سندی بھی چُپ نہ رہ سکا۔ چہکتا ہوا بولا۔ "میں نے تو یہ بھی سُن رکھا ہے کہ ملکہ کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اور وہ اپنے دوستوں کو بہت جلد بھول جاتی ہے۔"

شہزادہ خوب سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں کی باتوں کا مطلب کیا ہے؟ کچھ بھی ہو اسے کسی بات کی بھی پروا نہ تھی۔ وہ ملکہ سبا سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن دیکھنے سے قاصر تھیں۔ کیونکہ تصور کی آنکھیں ملکہ سبا کو دیکھ رہی تھیں۔ کان کھلے تھے لیکن ان میں ملکہ سبا کی شیریں اور لطیف آواز گونج رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا اور اس دھڑکن میں ملکہ سبا کے لئے اشتیاق اور آرزو موجود تھی۔

آس پاس خوشبودار درختوں کے باغات تھے اور طرح طرح کی خوشبو کے جھونکوں نے ان کے دماغوں کو معطر کر دیا تھا۔ انہی باغات میں جب ایک جگہ انہیں ایک میدان نظر آیا تو عریب نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور کھڑا ہو گیا۔ "شہزادے!" وہ کہنے لگا۔ "اب ہمیں یہیں پڑاؤ ڈالنا چاہیئے۔ ملکہ کو ہمارے

استقبال کے لئے آنا چاہیے۔"

شہزادہ کا دل ملکہ کو تکلیف پذیرائی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ملکہ کو ہماری آمد کی اطلاع مل چکی ہے؟"

"ہاں!" عریب نے جواب دیا۔ "میں نے سات گھڑ سوار رات ہی روانہ کر دیئے تھے۔ انہوں نے ملکہ کو شہزادے کی آمد کی اطلاع ضرور دے دی ہوگی۔"

شہزادے کے رکتے ہی لشکر رک گیا اور اسی میدان میں خیمہ زن ہو گیا۔ دوپہر سے رات ہو گئی لیکن ملکہ سبا ان کی پذیرائی کے لئے مارب کی چوٹی کے قلعہ سے نمودار نہ ہوئی۔

صبح چڑیوں کی چہکار اور ناقوسوں کے شور نے فضا کی خاموشی کو ختم کر دیا اور شمسی ہیکلوں میں آفتاب کی عبادت شروع ہو گئی۔ شہزادہ اکثوم کی نظریں ملکہ سبا کے پہاڑی محل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پہاڑی پُرپیچ راستوں سے آدمیوں کے ہجوم کو قطاروں میں اترتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جو کبھی چٹانوں کی اوٹ میں ہو جاتے اور کبھی نمودار ہو جاتے۔ ان میں ایسے گھوڑے بھی تھے جن پر کوئی سوار نہ تھا۔ جب یہ لوگ پہاڑی کے نیچے کھلے میدان میں آ گئے تو معلوم ہوا کہ یہ ایک لشکر ہے۔ شہزادے کے اتالیق عریب نے پیش گوئی کی۔ "یہ ضرور ملکہ کی استقبالی فوج ہے جو شہزادے کی پیشوائی کو نکلی ہے۔"

شہزادے نے اشتیاق سے سوال کیا۔ "کیا ان میں بلقیس خود بھی موجود ہوگی؟"

عریب نے جواب دیا۔ "اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ بلقیس اپنے محل سے باہر نہیں نکلتی اور محل سے باہر نکلنا سبا کے رسم و رواج کے خلاف ہے۔"

کچھ دیر بعد شہزادے کے ساتوں گھڑ سوار واپس آ گئے اور انہوں نے مطلع کیا کہ ملکہ کا وزیر عمائدین مملکت اور معززین شہر کے ساتھ بے شمار تحفے تحائف لئے شہزادے کے استقبال کو آ رہا ہے۔

وزیر جب اکثوم کے لشکر کے قریب پہنچا تو احتراماً گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور پاپیادہ شہزادے کے استقبال کو آگے بڑھا۔ شہزادے نے اپنے خیمے کے دروازے پر بوڑھے وزیر کو خوش آمدید کہا اور اسے لئے ہوئے اندر چلا گیا۔ شہزادے کے آس پاس عریب اور سدی تھے اور ان کے بعد وہ لوگ تھے جو شہزادے کے مقرب بارگاہ تھے۔ سبا کے بوڑھے وزیر کو شہزادے کے سامنے مکلف فرش پر جگہ دی گئی۔ یہیں اس نے شہزادے کو ملکہ کا سلام اور اس کی آمد پر ہدیۂ تشکر پیش کیا اور سب سے آخر میں تحائف کی فہرست پیش کی۔ اور زبانی عرض کیا کہ ملکہ بلقیس اپنے ملک کے رسم و رواج کی وجہ سے آپ کی پیشوائی کو حاضر نہیں ہو سکی لیکن اس کا دل جذبۂ پیشوائی سے معمور ہے اور وہ اپنے محل کے پُرتکلف آراستہ اور خوشبویات سے معطر دارالضیافت میں ملنے کے لئے بے چین ہے۔"

شہزادے نے وزیر سے دریافت کیا۔ "تمہاری ملکہ کو ہمارے ملک کی کیا چیز سب سے زیادہ پسند ہے ؟"

وزیر نے عرض کیا۔ "یہ ہاتھی دانت کا سامان اور اگر اس سامان میں ہاتھی دانت کا تخت بھی ہو تو اُسے ملکۂ عالیہ بے حد پسند فرمائیں گی۔"

شہزادہ چپ ہو گیا اور دل میں یہ طے کر لیا کہ تحائف میں سے ہاتھی دانت کی بہترین چیزیں اور ہاتھی دانت کا تخت ملکہ کی خدمت میں خود پیش کرے گا۔

شہزادہ بڑی دیر تک بوڑھے وزیر سے اس کی ملکہ کی طبیعت، مذاق، پسند اور ناپسند، ذہانت اور معلومات کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ملکہ صحت اور تندرستی بہت پسند کرتی ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ملکہ کو حسین چیزیں بہت پسند ہیں۔ اس موقع پر اس کو حسن و رعنائی کی دیوی عشتار پر بہت غصہ آیا جس نے اس کو اس کی قوم کو حسن اور رنگ سے محروم رکھا تھا۔ اس وزیر کے ذریعے شہزادے کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ملکہ محل کی حدود سے نکل کر آزادانہ گھوم پھر بھی نہیں سکتی۔ اس کو ملکہ کی روایتی قید پر افسوس ہوا۔ اور اس نے یہ طے کر لیا کہ جب وہ ملکہ سے ملے گا اور رسمی تعلقات بے تکلفی کی حدود میں داخل ہو جائیں گے تو ایک دن کسی بھی طرح ملکہ کو محل کی حدود سے باہر ضرور لے جائے گا۔

دوپہر گزر جانے کے بعد شہزادے کے لشکر نے کوچ کیا اور مارب کے شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب یہ لوگ محل کے دروازے پر پہنچے تو انہیں یہاں اور لوگ بھی پذیرائی کے لئے کھڑے نظر آئے۔ شہزادے کے ساتھیوں کو محل کے چوگرد ابرکوں میں اور شہزادے کو شاہی دارالضیافت میں ٹھہرایا گیا۔ دارالضیافت کے بغلی کمرے میں عریب اور سدی کو جگہ دی گئی۔ رات کو شہزادے کی دل بستگی کے لئے گانے والیوں کا ایک پرا بھیجا گیا لیکن شہزادے نے انہیں واپس کر دیا۔ وہ صرف ملکہ سبا سے ملنے کا خواہش مند تھا اور گانے والیوں کو واپس کر دینے میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ جب ملکہ بلقیس یہ سُنے گی کہ شہزادے کو عام عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو اپنی طرف والہانہ رجحان محسوس کر کے بہت خوش ہو گی۔

وہ دن اور رات بھی شہزادے کو ملکہ سے نہ ملا سکے۔ ملکہ نے اپنے بوڑھے وزیر کے ذریعے شہزادے کو مطلع کیا تھا کہ ملکہ آنے والی صبح کو آفتاب کی پرستش سے فارغ ہونے کے بعد اسے شرفِ ملاقات بخشے گی۔

اسی رات کو فلسفی عریب نے دارالضیافت کے اُوپر خلا میں دیکھا ایک روشن ستارہ اپنے گرد و پیش کی فضا کو روشن کرتا ہوا خاصا نیچے تک آیا اور پھر شمال مغرب میں گر کر بجھ گیا۔ بوڑھے فلسفی نے کاہنوں کی طرح پیشگوئی

کی کہ" شہزادہ معاملاتِ قلب کا شکار ہو گا اور اس میں اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا"۔ لیکن ستدی نے اس سے اختلاف کیا۔ اس نے کہا۔ "ستارے تو ہر روز ہی ٹوٹتے ہیں۔ یہ دراصل خبیث ارواح ہیں۔ جو آسمانی حدود میں داخل ہو کر آسمان کے سب سے بڑے دیوتا سے ملنا چاہتی ہیں۔ لیکن دیوتا کے ذکر جاکر ان کو راستے ہی میں جنگ کر کے پسپا کر دیتے ہیں"۔

بوڑھے عریب کو ستدی کی باتیں احمقانہ محسوس ہوئیں۔

وہ رات شہزادے نے اپنے مصاحبوں سے بات چیت میں گزار دی۔ عریب ملکہ سے گفتگو میں پیش آنے والے متوقع موضوعات پر شہزادے کو اپنے لائحہ عمل سے مطلع کرتا رہا۔ شہزادہ بس ہوں ہاں کرتا اور اسے کچھ بھی پتا نہ تھا کہ بوڑھا عریب اتنی دیر سے کیا بکواس کر رہا ہے۔

دوسرے دن صبح آفتاب کی پرستش سے فارغ ہونے کے بعد ملکہ حسب وعدہ شہزادے سے ملنے پہنچ گئی۔ ملکہ کی خواصیں ساتھ تھیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد انہیں رخصت کر دیا گیا۔ شہزادے نے ملکہ سبا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ تو اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ جتنا چرچا تھا۔ ملکہ بلقیس نے اپنے سیاہ اور لمبے بالوں کو رومال کے اندر چھپا رکھا تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے چاندی جیسے دانت شہزادے کے قلب پر بجلی گراتے اور اس کے رخساروں میں گڑھا پڑ جاتا۔ اس کی ٹھوڑی کا چاہِ ذقن شہزادے کے عشق کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیتا۔

بلقیس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "مبارک ہو کہ سبا کی سرزمین پر پیغام خیر سگالی کے ساتھ نازل ہوا۔ میری مملکت میں تمہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں اٹھانی پڑی؟"

شہزادہ تو اس کے سراپا میں ڈوبا ہوا تھا۔ پوری بات نہ سن سکا۔ فرطِ جذبات میں جواب دیا۔ "حسن و جمال کی دیوی عشتار تجھ سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی اور پھر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عشتار بذاتِ خود تجھ میں حلول کر گئی ہو!"

ملکہ شہزادے کی بے خودی اور والہانہ انداز پر دل ہی دل میں مسکرائی اور ایک چرکا لگایا۔ "سنتی ہوں کہ عشتار حبشہ سے بہت ناراض ہے اور ادھر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی"۔

شہزادہ تلملا گیا۔ "تو صحیح کہتی ہے"۔ وہ افسردگی سے کہنے لگا۔ "لیکن ہمیں صحت و توانائی ضرور عطا کی گئی ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ صحت و توانائی سب سے بڑی نعمت ہیں"۔

وہ دونوں دیر تک اسی قسم کی باتوں میں الجھے رہے۔ ملکہ نے اس سے کئی پہیلیاں بجھائیں جن میں چند کے اس نے صحیح جوابات دیئے بقیہ کے نہ بوجھ سکنے کا اس کو بڑا ملال ہوا۔ اس کے بعد ملکہ حبش کی

آب وہوا" وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار فصلوں اور موسموں کا حال پوچھتی رہی، اور شہزادے نے ان سب کے لیے جوابات دیے جس سے ملکہ کے دل میں بے انتہا اشتیاق پیدا کرنا مقصود تھا۔ ملکہ نے بھی شہزادے کی باتیں کچھ اس طرح اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا جھپکا کر اور مسکرا مسکرا کر سنیں کہ شہزادے کے دل کا آخری فیصلہ ہو گیا۔

رات کو جب بوڑھے اتالیق نے ملکہ کی تفصیلات جاننا چاہیں تو اس کے پاس ایک ہی جواب تھا "ملکہ بہت حسین ہے۔ عشتار سے زیادہ حسین بلکہ بہت ذہین ہے۔ اتنی ذہین کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ ذہانت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

بوڑھے اتالیق نے شہزادے کی باتوں سے ایک ہی نتیجہ نکالا "شہزادہ ملکہ کے حسن و جمال اور ذہانت کا شکار ہو چکا ہے۔"

اس نے شہزادے کو اشاروں کی زبان سے سمجھایا "شہزادے! دنیا بڑی ناقابل اعتبار شے ہے۔ اور حسن و جمال اس سے بھی زیادہ ناقابل اعتبار ہوتا ہے لیکن ایک تیسری چیز بھی ہے جو ان دونوں سے زیادہ ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔"

شہزادے نے کراہت سے دریافت کیا "وہ کیا؟"

بوڑھے نے فوراً جواب دیا "عورت۔ داناؤں نے اس کے مزاج اور طبیعت کو مرغ باد نما سے تشبیہ دی ہے۔"

شہزادے کو غصہ آ گیا جوش میں بولا "عمر کے ساتھ لوگوں کے جذبات بھی سرد پڑ جاتے ہیں۔ اور پیری میں دل بھی مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔"

موقع شناس سدی نے شہزادے کی ایما کے پیش نظر عرض کیا "یہاں یہ بھی تو دیکھا گیا ہے کہ ہم ہمیشہ اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جو ہمیں میسر نہیں ہوتی۔ دن کا دامن رات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور سرخ و سپید چہرے اور آنکھ کے سفید ڈھیلے پر سیاہ پتلیاں ہی بھلی لگتی ہیں۔"

شہزادے کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ لیکن بوڑھا اتالیق ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ اس نے کہا "لیکن میں مجبور ہوں کہ خوش فہمی سے قطع نظر حقائق بیان کر دوں۔"

اور بالآخر یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی کہ ملکہ سے گفتگو کے دوران یہ ضرور طے کر لینا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ محصول کم کیے جائیں۔ اور حبشہ سے مفرور باغیوں کو ملکہ واپس کر دیا کرے اور حبشہ کی حکومت سبا کے باغیوں کو واپس کر دے گی۔"

لیکن شہزادے کی نظر میں یہ ساری باتیں فضول تھیں۔ ملکہ سے ایسی باتیں کرنا اس کے حسن و جمال کی ہتک تھی۔

سات دن گزر گئے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھ گئے۔ شہزادے نے ایسا محسوس کیا جیسے ملکہ اس پر بڑی طرح مفتون ہو چکی ہے۔ بوڑھا اتالیق تقریباً روزانہ ہی شہزادے کو دنیا، حسن، عورت اور جوانی جیسی ناقابلِ اعتبار چیزوں کی ناپائیداری کا درس دیتا رہتا لیکن شوخ اور موقع پرست سدی ایسی ہی باتیں کرتا جو شہزادے کو پسند اور مرغوب ہوتیں۔

ایک دن ملکہ نے شہزادے سے کہا۔ "الکزم! اس محل کی چہار دیواری میں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ آؤ رات کو ہم دونوں معمولی آدمیوں کا بھیس بدل کر چور دروازے سے نکل چلیں اور خوب آزادانہ مارب کی گلی کوچوں اور بازاروں کی سیر کریں۔"

شہزادہ فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "تو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ جب میں تجھ سے ملا بھی نہ تھا تو یہ سنا تھا کہ تو اپنے ملک اور قوم کے رسم و رواج کے ماتحت محل کی حدود میں رہنے پر مجبور ہے۔ تو میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب میں تجھ سے قریب ہو جاؤں گا اور باہمی تعلقات بے تکلفی اور یگانگت کی حدود میں داخل ہو جائیں گے تو میں تجھے کسی بھی طرح اس محل کی چہار دیواری سے نکال کر کھلی فضا میں لے جاؤں گا۔ اور خوب جی بھر کے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کروں گا۔" اس رات ان دونوں نے معمولی آدمیوں کے لباس پہنے اور محل کے چور دروازے سے نکل کر بازار کی راہ لی۔

چاندنی رات اور کھلی فضا نے ملکہ کو بے قابو کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگی۔ وہ مکانوں کی کنڈیاں کھٹکھٹا کر چھپ جاتی اور جب کوئی مکان سے باہر نکل کر حیران و پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتا تو کھلکھلا کر ہنسنے لگتی اور دیکھنے والا اس کو پاگل تصور کرتا۔ شہزادہ بھی اس جیسی پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ جب ان حرکتوں سے دل اکتا گیا تو وہ دونوں ایک شراب خانے کی طرف چل پڑے۔ وہ فقیروں اور پاگلوں کے سے انداز میں شراب خانے میں داخل ہو گئے۔ ہوشیاروں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ "بھکاری معلوم ہوتے ہیں لیکن بھکارن بہت حسین ہے۔"

ایک نے آہ کھینچ لی۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ "یہ تو کسی ملک کی ملکہ بننے کے لائق ہے اگر یہ مجھے مل جائے تو میں دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔"

دوسرے نے رائے دی۔ "اس کی حصولیابی کے لئے کسی قربانی کی ضرورت نہیں طاقت کی ضرورت ہے اس دیوزاد حبشی کو مار دو اور عورت پر قبضہ کر لو۔"

بدمستوں کے نشے ہرن ہو گئے۔ پینے والوں کے جام جہاں تک پہنچے تھے وہیں رُک گئے۔

ملکہ نے شہزادے کے کان میں کہا۔ "ہمیں یہاں سے فوراً بھاگ نکلنا چاہیے۔ ورنہ یہ شرابی تجھ پر حملہ کر کے مجھ پر قبضہ کر لیں گے۔"

لیکن شہزادے پر طاقت کا جنون طاری تھا دوسرے وہ اس نازک موقع پر یہ بات بھی ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ طاقت اور مار دھاڑ میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اکیلا سو پچاس پر بھاری ہے۔ اس نے جنگلی بھینسے کی طرح سینہ تان کر جواب دیا۔ "تو فکر نہ کر، میں ان سب کے لئے اکیلا کافی ہوں۔"

ملکہ نے سرگوشی میں کہا۔ "پاگل مت بنو۔ ہم چھپ کر باہر نکلے ہیں۔ یہ راز افشا نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک بدمست نے آوازہ کسا۔ "ذرا اس بدمذاق خوبرو حسینہ کو تو دیکھنا اپنے بھینس جیسے عاشق سے کیسی چہلیں کر رہی ہے۔"

شہزادے نے اطمینان سے کئی پیالے حلق سے نیچے اتارے اور ملکہ کو بھی پلائے۔ ملکہ نے شراب کی قیمت چکائی اور دونوں شراب خانے سے باہر نکل آئے۔ ہوا نے اپنا اثر کیا اور دونوں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے ایک سبزہ زار کی طرف بڑھے۔ عشق کا زہر شہزادے کی رگ رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور ہوس کا دیو بیدار ہو رہا تھا۔ اس نے نشے میں بدمست ملکہ کو سبزہ زار پر گرا دیا اور خود بھی اس کے برابر ہی لیٹ گیا۔ لیکن اسی لمحے دونوں شرابی ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شہزادے کے سر پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ شہزادہ غصے میں اٹھ کر ان دونوں پر جھپٹا اور ایک سے ڈنڈا چھین کر ذرا سی دیر میں دونوں کو مار گرایا۔ ملکہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اس نے زخمی شہزادے کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے فوراً بھاگ چلو۔ ابھی اسی وقت اسی لمحے بھاگ چلو۔"

شہزادے نے ملکہ کے حکم کی تعمیل کی اور نشے اور زخموں سے چور لڑکھڑاتا ڈگمگاتا محل کی طرف چل پڑا۔ ابھی محل تک وہ پہنچے بھی نہ تھے کہ شہزادے کو چکر آ گیا۔ اس کے سر سے خون جاری تھا۔

جب شہزادے کو ہوش آیا تو اس نے دھندلی دھندلی سی روشنی میں بڑھے عریب اور شوخ اور موقع پرست سدی کو مغموم اور اداس بیٹھے دیکھا اور محل کا شاہی جراح اس کے زخموں پر دواؤں میں تر رُوئی کے پھائے رکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے تصور کی سطح پر زخموں سے پہلے کا ماضی ابھرا اور اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ یہاں تک کہ جب اس کو یہ یاد آیا کہ ملکہ اور وہ، دونوں ایک ساتھ محل کی طرف واپس جا رہے تھے لیکن محل تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ وہ تنہا رہ جانے والی ملکہ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ اس نے تینوں سے سوال کیا۔ "ملکہ کہاں ہے؟"

شاہی جراح نے جواب دیا۔ "وہ محل میں ہے اور اسی نے مجھ کو تمہارے معالجے پر متعین کیا ہے۔"
زخموں سے ٹیس اٹھی۔ شدت کرب سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بڑبڑایا۔ "دیوتا اسے اپنی امان میں رکھیں۔ کیا وہ خیریت سے ہے؟ محل میں اس سے کوئی باز پرس تو نہیں کی گئی؟"
شاہی جراح نے تنبیہہ کی۔ "شہزادے! کچھ دنوں کے لیے تمہیں خاموش رہنا چاہیے۔ تمہارے جسم سے خون بہت نکل چکا ہے۔"
بوڑھا اتالیق شہزادے کے قریب پہنچا اور شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شہزادے! میرے آقا! تمہیں اپنے معالج کی ہدایت پر خاموش رہنا چاہیے۔ ورنہ میری زبان تم سے تیز چل سکتی ہے اور بیسیوں سوالات ہیں جو ہونٹوں تک آکر رہ گئے ہیں۔"
شہزادے نے آنکھیں کھول دیں۔ "عریب! میرے استاد! ملکہ کو مطلع کر دو کہ اکثوم ہوش میں آچکا ہے اور تم سے ملاقات کا خواستگار ہے۔"
"میں اطلاع کر دوں گا" عریب نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ سردست ملکہ آنے کی نہیں۔"
"کیوں؟" شہزادہ پوری قوت سے پاگلوں کی طرح چیخا۔ "کیوں نہیں آئے گی۔ یہ تم نے کس طرح سمجھ لیا؟ وہ مجھ سے ڈر رہی ہے گی۔"
اس نے دفور جوش میں سر کو جھٹکا دیا تو زخموں کے منہ پھر کھل گئے۔ اور ان سے خون جاری ہو گیا۔ اور وہ رفتہ رفتہ ڈوبتا چلا گیا۔ جب وہ بے ہوش ہو گیا تو بوڑھے اتالیق نے شاہی جراح کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گڑگڑایا۔ "اے سبا کے شاہی جراح! تو اسے اچھا کر دے اس کے صلے میں تو جو مانگے گا میں دوں گا۔ میں اس کے بزرگوں کو کیا جواب دوں گا؟"
شاہی جراح نے افسوس سے کہا۔ "اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہے ورنہ زخم ایک ہفتے میں مندمل ہو جائیں گے۔"
اس طرح شہزادہ دو دن اور دو رات مدہوشی اور نیم مدہوشی کی کیفیت کا شکار رہا۔ اور ملکہ اس کو ایک بار بھی دیکھنے نہ آئی۔

آفتاب ابھی غروب بھی نہ ہوا تھا کہ شمسی ہیکلوں سے ناقوسوں کا شور بلند ہوا۔ سبا کی قوم غروب ہونے والے آفتاب کے الوداعی سجدے میں گر گئی۔ محل کے خدمتگاروں نے شہزادے کے کمرے میں فانوس روشن کر دیئے۔ اکثوم چپ چاپ ناقوسوں کی آوازوں میں گم روشن کیے جانے والے ایک فانوس کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا لیکن اس کے حافظے کی سطح پر وہ صبح تھی جب انہی ناقوسوں کے شور میں اس نے ملکہ کے استقبالی نمائندگان

سے ملاقات کی تھی۔ بوڑھا عریب اور شیخ سدی مجبور اور مظلوم شہزادے پر نظریں جمائے اس کے پیچیدہ اور ناقابل فہم مستقبل کی بابت غور کر رہے تھے۔

جب فانوسوں کو روشن کرنے والا چلا گیا تو شہزادے کو اچانک اپنے محبوں اور ہمدردوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو اپنے قریب بلایا اور عریب سے دریافت کیا "میرے شفیق استاد! مجھے یقین ہے کہ جس طرح تمہاری ماں ایک تھی اسی طرح باپ بھی ایک ہی تھا۔ ذرا بتلانا تو آج مجھے صاحب فراش ہوئے کتنے دن گزر چکے ہیں؟"

بوڑھے اتالیق نے زیر لب کچھ حساب لگایا اور جواب دیا "پورے سات دن اور سات راتیں گزر چکی ہیں"

شہزادے نے ڈرتے ڈرتے دوسرا سوال کیا "کیا ملکہ بلقیس مجھے دیکھنے آئی تھی؟"

بوڑھے عریب نے گول مول جواب دیا "ملکہ کا جراح کہتا ہے کہ شہزادے کو ابھی دو دن اور خاموش رہنا چاہیئے"

شہزادے نے بوڑھے دانا کو بے بس کر دیا۔ کہنے لگا "اچھا میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ لیکن تمہیں تو بولنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ ذرا ملکہ کی بابت وہ سب کچھ تو بتانا جس کا تمہیں علم ہے۔ میں اپنی زبان کو بند اور کانوں کو کھلا رکھتا ہوں"

عریب نے جواب دیا "ملکہ کی ہدایت پر دن رات میں کئی بار شاہی جراح شہزادے کو دیکھنے آتا ہے۔ لیکن خود ملکہ ایک بار بھی نہیں آئی ہو سکتا ہے شاہی جراح نے سردست اس کو یہاں آنے سے روک دیا ہو"

"یہ بات نہیں ہے!" شہزادہ جوش میں چیخا اور اٹھ کر بیٹھ گیا "کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کو تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو لیکن مجھے بھی قسم ہے اس دیوتا کی جس نے سطح زمین پر گول آسمان کی چھت قائم کر رکھی ہے کہ میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گا"

اس کے بعد شہزادہ جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو ہوا تو چکر آ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ پیروں میں لرزش ہوئی اور وہ اپنے تئیں سنبھال نہ سکا۔ چکرا کر پختہ فرش پر گر گیا۔ زخم ایک بار پھر پھٹ گئے اور ان سے خون جاری ہو گیا۔ عریب اور سدی نے بے ہوش شہزادے کو سنبھال کر اس کے بستر پر ڈال دیا۔ اور فوراً ملکہ کے جراح کے پاس آدمی روانہ کر دیا۔

کئی دنوں کے بعد جب شہزادے کی حالت ذرا سنبھلی تو ڈرتے ڈرتے عریب نے ملکہ سبا کا وہ نوشتہ پیش کر دیا جو ایک دن پہلے اس کے پاس آیا تھا۔ اس میں ملکہ کے خارجی امور کے وزیر نے ملکہ کی طرف سے لکھا تھا:۔

ملکہ عالیہ مملکت سبا ان دنوں طسم و جدلیس کے شہزادوں کی میزبانی کے فرائض انجام دینے پر مجبور ہیں اور ان سے بعض اہم تجارتی امور پر معاہدے کر رہی ہیں اس لئے وہ زخمی اور ہذیانی کیفیت کے شکار حبشی شہزادے کی خدمت میں آنے سے معذور ہیں۔ ملکہ عالیہ شہزادے کو یہ مشورہ دینے پر مجبور ہیں کہ شہزادے کو اپنے ملک واپس چلا جانا چاہیئے۔ کیونکہ وطن کی فرحت بخش ہوائیں زخموں کے لئے مرہم اور ہذیان کے لئے معالجے کا کام کریں گی۔"

شہزادے نے یہ نوشتہ بوڑھے عریب سے پڑھوایا۔ سن چکنے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بھرائی آواز میں عریب سے پوچھا۔ "میرے شفیق سچے اور تجربہ کار بزرگ! مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے مجھ سے بعض ناقابل اعتبار چیزوں کا ذکر کیا تھا۔ ذرا ایک بار پھر تو ان کا ذکر کرنا۔"

بوڑھے عریب کا دل لرز گیا۔ اس نے کہا۔ "شہزادے! چونکہ دنیا بذات خود ناقابل اعتبار اور ناپائیدار ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ اس دنیا کی ہر شے ناقابل اعتبار اور ناپائیدار ہے۔"

"نہیں ایسا نہ کہو۔" شہزادہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "اس دنیا کی ہر شے قابل اعتبار اور پائیدار ہے بجز ملکہ سبا کے۔ اور ہاں ذرا دیکھنا تو اس نوشتے کے آخر میں دستخط کس کے ہیں؟"

بوڑھے عریب نے دستخط پڑھ کر جواب دیا۔ "وزیر امور خارجہ کے۔"

شہزادے نے بے چینی سے سوال کیا۔ "ملکہ کے دستخط نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں!" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وزیر امور خارجہ اتنا اہم نوشتہ اپنی مرضی سے تو لکھ نہیں سکتا۔"

شہزادے کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے امید کا دامن ایک بار پھر پکڑ لیا۔ "وزیر امور خارجہ سے ایسی تحریر ضرور کسی ایسے شخص نے لکھوادی ہے جو ملکہ سبا اور میرے عشق و محبت سے حسد رکھتا ہے۔ میں ملکہ سے ایک بار ملوں گا۔ اور اس سے اس نوشتے کی بابت دریافت کروں گا۔"

بوڑھے عریب نے ملکہ کی بابت اپنی دلی نفرت کو دباتے ہوئے کہا۔ "بہر حال ہمیں واپسی کی تیاریاں ضرور کرنی چاہئیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ شہزادے کی ملکہ سے ایک ملاقات اور ہو جائے۔"

لیکن موقع پرست سندی نے عریب کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ "بہتری اسی میں ہے کہ اب شہزادے کو ملکہ سے ہرگز نہ ملنے دیا جائے۔"

شاہی جراح اور طسم اور جدلیس کے شہزادوں کی موجودگی میں حبشہ کے شہزادے نے ملکہ سے

ملاقات کی۔ دونوں شہزادوں کے حسن وجمال کے مقابلے میں الکوم حقیر نظر آرہا تھا جب اس نے ان دونوں کے حسن وجمال سے اپنا موازنہ کیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کو ایک بار پھر عشتار پر غصہ آیا جس نے اس کو اور اس کی قوم کو حسن وجمال سے یکسر محروم رکھا تھا۔

پھر بھی اس نے ملکہ سے دریافت کیا۔ "پھولوں سے زیادہ نرم ونازک اور عشتار سے زیادہ حسین ملکہ! میرے نام نوشتہ کیا تیرے وزیر امور خارجہ نے تیری اعلیٰ میں بھیجا ہے؟"

ملکہ نے شاہی جراح کی طرف دیکھا۔ جراح نے جواب دیا۔ "ملکہ کی ایماء کے بغیر کوئی فرمان کس طرح جاری کیا جا سکتا ہے۔"

"ارے او خبیث جراح!" شہزادہ گرجا۔ "تو چپ رہ، میں ملکہ سے بات کر رہا ہوں اور اس سے اپنے سوالات کے جوابات چاہتا ہوں۔"

ملکہ نے ترش روئی سے تیوریوں پر بل ڈالے اور کہنے لگی۔ "میری موجودگی میں جو بھی بولے گا اس کو ہماری طرف سے بولنے کی اجازت حاصل ہوگی۔"

شہزادے نے التجا کی۔ "لیکن میں ملکہ کی موجودگی میں کسی اور سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

ملکہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

پھر شہزادے نے نہایت درد انگیز پیرائے میں وہ گفتگو اور واقعات یاد دلائے جو ان دونوں کے مابین زخمی ہونے سے پہلے پیش آ چکے تھے۔ ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب شہزادے نے کہا۔ "کیا ملکہ کو وہ واقعہ بھی یاد نہیں رہا۔ جب ہم دونوں معمولی آدمیوں کے لباس میں چور دروازے سے نکل کر بابل کے بازار میں پہنچے تھے۔ اور کھلی فضا میں پہنچتے ہی ملکہ پر از خود رفتگی کا دورہ پڑا تھا اور ملکہ پاگلوں کی طرح لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتی پھرتی تھی اور کیا ملکہ کے حافظے میں شراب خانے کا وہ واقعہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ جس میں ایک شرابی نے ملکہ کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس کو یہ بھکارن مل جائے تو وہ زندگی کی بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہے۔ اور کیا ملکہ دوسرے شرابی کے اس جواب کو بھی بھول چکی ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ اس کی حصولیابی کے لئے کسی قربانی کی نہیں طاقت کی ضرورت ہے اور پھر بعد میں انہی دونوں نے ایک سبزہ زار میں میری بے خبری میں مجھے شدید زخمی کر دیا تھا؟"

ملکہ نے پہلے تو حیرت سے شہزادے کو دیکھا اس کے بعد اپنے جراح سے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ اب بھی ہذیان میں مبتلا ہے۔ تمہیں اس کا علاج جاری رکھنا چاہیئے یا پھر اسے اپنے وطن واپس چلا جانا چاہیئے۔"

شہزادے کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "میں وطن واپس چلا جاؤں گا اور وہاں

تیری باتیں یاد کر کے ہذیان میں مبتلا ہو جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے میں چند باتیں ملکہ کے گوش گزار ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بوڑھے اتالیق نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ دنیا کی تین چیزیں سخت ناقابل اعتبار ہیں۔ دُنیا، اس کا حسن و جمال اور عورت، لیکن میں نے غصہ میں اس کو یہ جواب دیا تھا کہ عمر کے ساتھ لوگوں کے جذبات بھی سرد پڑ جاتے ہیں۔ لیکن آج سوچتا ہوں کہ بوڑھے اتالیق نے سب کچھ سچ ہی کہا تھا۔ ملکہ! تو بے وفا ہے۔ لیکن میرا دل تجھے بے وفا کہنے پر آمادہ نہیں ہوتا مجھے اپنے حشر کا کوئی افسوس نہیں۔ افسوس تو ان پر ہے۔ جو میرے بعد تیرے شکار ہوں گے۔"

اس کے بعد شہزادے کی گردن جھک گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس پر غشی کا دورہ پڑ گیا ہو لیکن ذرا سی دیر بعد اس نے اپنا سر اٹھایا اور طلسم اور جدلیس کے دونوں شہزادوں کو مخاطب کیا۔ "اے خوش قسمت شہزادو! کہ تمہیں ملکہ کا قرب اور التفات حاصل ہو گیا ہے۔ میرے پاس کچھ باتیں تم سے کہنے کی بھی ہیں۔ جب پہلے پہل مارب میں ملکہ کے محل کو میں نے دیکھا تھا تو میرے ہمدرد اتالیق نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ ملکہ نہ صرف غیر معمولی حسین بلکہ بلاکی ذہین بھی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ملکہ کو شکار کا بے حد شوق ہے اس پر میرے دوسرے ہمدرد ستری نے یہ اضافہ کیا تھا کہ ملکہ کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اور وہ اپنے دوستوں کو بہت جلد بھول جاتی ہے۔ آج وہ ساری باتیں حرف بحرف سچ ثابت ہو چکی ہیں۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم ملکہ سے کنارہ کشی اختیار کر لو لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کو دوسرے کے تجربات سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیئے۔"

ملکہ فرطِ جوش میں اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی محل میں غائب ہو گئی کہ "میں اس پاگل کی باتیں مزید نہیں سن سکتی۔"

عریب کے لئے سبا اور حبش میں کسی معاہدے کی تکمیل کے بغیر واپسی ایک مسئلہ تھی۔ اس نے شہزادے سے اجازت طلب کی کہ اسے ملکہ سے ملنے اور معاہدے کی تفصیلات طے کرنے کی اجازت دی جائے۔ شہزادے کو ان امور سے اب کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ اس نے بوڑھے عریب کو سمجھایا کہ ملکہ بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ اس لئے ایک ناقابل اعتبار ذات کے عہد و پیمان اور معاہدات پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عریب مجبور تھا کیونکہ وہ کسی معاہدے کے بغیر حبشہ واپس کس طرح جا سکتا تھا۔

اسے ملکہ سے ملنے کے لیے ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ طلسم و جدلیس کے شہزادوں کی دل دہی اور ضیافت میں حد درجہ مشغول تھی۔ دوسری طرف شہزادہ واپسی کے لئے بے چین تھا۔ اور اب اسے شاہی محل کا ذرہ ذرہ کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

عریب کو ملکہ نے شرف باریابی اس طرح بخشا کہ اس کا دربار بوڑھوں اور سرداروں سے بھرا ہوا تھا۔ طسم اور جدیس کے شہزادے ملکہ سے دور دوسری صف میں بیٹھے تھے۔ ساحلی ہواؤں کے خوشبو بدوش جھونکے لوگوں کے دل و دماغ معطر کر رہے تھے۔ ملکہ کے دائیں جانب فرش پر ایک ہُدہُد بیٹھا ہُوا تھا۔ عریب بوڑھا تھا۔ اسے بوڑھے دانشمندوں کی پہلی صف میں جگہ دی گئی۔ عریب نے ملکہ کے حسن و جمال کو دیکھا اور اس کے بوڑھے دل میں عہدِ گزشتہ کی یادیں اور تمنائیں کروٹیں لینے لگیں اور اس کے انصاف پسند دل نے پہلی بار شہزادے کی تباہی کو حق بجانب قرار دیا۔

ملکہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور اس نے درباریوں اور خاص کر اپنے بوڑھوں اور دانشمندوں کو مخاطب کیا۔ اس نے ہُدہُد کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"لوگو! جیسا کہ تم اس ہُدہُد کو دیکھ رہے ہو یہ میرے نام شمال کے بادشاہ سلیمان کا ایک خط لے کر آیا ہے۔ میں اس کا خط پڑھ کر سناتی ہوں تم سب مجھے مشورہ دو کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے مشوروں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔"

اس کے بعد ملکہ نے خط پڑھ کر سنایا:۔

"مبارک ہیں وہ جو خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو اور تیری قوم آفتاب کی پرستش کرتی ہے۔ میں تجھے اور تیری قوم کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں۔ تجھ پر لازم ہے کہ اس خط کے ملتے ہی میری بارگاہ میں حاضر ہو۔ اگر تو نے میرا حکم نہ مانا تو میں جانوروں، پرندوں، روحوں اور رات کے دیووں کی فوج لے کر خود تیرے ملک پر حملہ آور ہوں گا اور پھر جو اس کا انجام ہوگا تو اس کا خوب اندازہ کر سکتی ہے۔"

خط سنا کر ملکہ نے اپنے مشیروں سے کہا۔ "اور یہ طے ہے کہ جب بادشاہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس کو ویران کر ڈالتے ہیں۔ وہاں کے معززین اور باشندگان کو ذلیل بنا ڈالتے ہیں۔"

سبا کے لوگ جنگ سے ناآشنا تھے۔ یہ لوگ تاجر تھے۔ انہوں نے ملکہ کو مشورہ دیا کہ اس کو سلیمان کے جواب میں تحفے تحائف کے ساتھ یہ جواب لکھنا چاہیئے کہ یروشلم جتنی مدت میں لوگ پہنچتے ہیں میں اس سے آدھی مدت میں پہنچ رہی ہوں۔"

ملکہ نے جواب لکھ کر ہُدہُد کے بازو پر باندھ دیا۔ وہ اسی وقت پرواز کر گیا۔ اب ملکہ نے اپنے مہمانوں کو مخاطب کیا:۔

"کیا ہمارے جملہ مہمان دربار میں موجود ہیں؟"

ملکہ کے بوڑھے وزیر نے افسوس کے ساتھ عرض کیا۔ "افسوس کہ حبش کے شہزادے نے اپنی جگہ اپنے اتالیق کو بھیج دیا ہے۔"

عین اسی لمحہ ملکہ کے ذاتی اطلاع کنندہ نے اسے آہستہ سے مطلع کیا۔ "ملکہ عالیہ! میں نے سُنا ہے کہ طلسم اور جدیس کے شہزادوں کے ارادے اچھے نہیں۔ وہ اپنی معمولی فوج کے بل بوتے پر مارب میں کچھ گڑ بڑ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں تاجر اور خود کو جنگجو سمجھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ملکہ عالیہ ان کی مستقل مہمان بن کر ان کے قبائل میں تشریف لے جائیں۔"

ملکہ گھبرانے کے بجائے مسکرانے لگی اس نے پوری طمانیت سے جواب دیا۔ "مجھے شمال میں یروشلم کے بادشاہ سلیمان نے مدعو کیا ہے۔ جس کے پاس پرندوں، جانوروں، جنوں اور رات کے دیوؤں کی فوج ہے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہے۔"

اس کے بعد اس نے بوڑھے وزیر کو حکم دیا۔ "ہمارے معزز مہمان حبش کے شہزادے کو لایا جائے تاکہ ہم اسے پورے عزت و احترام سے رخصت کریں۔"

اور جب حبش کے شہزادے اکثوم کو دربار میں لایا گیا تو ملکہ نے اس کو اپنے قریب بٹھانے کا شرف بخشا اور اس کی مزاج پرسی مسکرا مسکرا کر اس طرح کی جیسے کبھی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اس نے شہزادے سے بطور خاص کہا۔ "مبارک ہیں وہ جو معاملاتِ عشق میں صبر و استقلال رکھتے ہیں اور مبارک ہیں وہ جن کی محبت مُدرع میں ہوتی ہے۔"

شہزادہ اس طرزِ تخاطب اور عزت افزائی پر ایک بار پھر مغالطے کا شکار ہو گیا اور اس کے دل کی کدورتیں دُور ہو گئیں۔ اس نے سوچا کہ ملکہ پر ضرور کسی ایسی رُوح کا سایہ ہے جو کبھی کبھی اس کو ایک ناقابل فہم شخصیت بنا دیتی ہے۔

دربار پر سناٹا طاری تھا۔ ملکہ نے اس سکوت کو ایک بار پھر توڑ دیا۔ اس نے مہمانوں کو مخاطب کیا۔ "اے سبا کے معزز مہمانو! جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ مجھے یروشلم کے عظیم بادشاہ سلیمان نے مدعو کیا ہے میں بہت جلد سبا کو چھوڑنے والی ہوں۔ اس لئے تم سب کی عزت و تکریم کے ساتھ واپسی کی خواہشمند ہوں۔"

طلسم کا شہزادہ گستاخانہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سلیمان سے پہلے تجھے میں نے مدعو کیا ہے اس لئے پہلے تو ہماری مہمان ہو گی۔ اس کے بعد سلیمان کے پاس جائے گی۔"

جدیس کے شہزادے نے کھڑے ہو کر اس کی تائید کی۔ ملکہ نے نہایت اطمینان سے زیر لب مسکرانے کے ساتھ اکثوم کی طرف دیکھا۔ شہزادہ جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باوقار انداز میں دونوں شہزادوں کو جواب

دیا: "تم دونوں ملکہ کے مہمان ہو اور ظاہر ہے کہ ملکہ تمہاری گستاخیوں کا جواب گستاخی سے نہ دے گی لیکن میں تم دونوں کو اس طرح دفعان کر سکتا ہوں جیسے تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا ہی نہ ہو۔"

ملکہ خاموشی سے اٹھ کر محل میں چلی گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اگر دونوں شہزادے اپنی حد سے آگے بڑھیں، تو اکثوم کو اس کی اجازت ہے کہ وہ انہیں سزا دے اور وہی دربار جہاں تھوڑی دیر پہلے عزت و وقار سکون اور تمکنت کا راج تھا مبارزت کا اکھاڑا بن گیا۔ دونوں شہزادوں نے اکثوم پر ایک ساتھ حملہ کیا شہزادے نے ایسا محسوس کیا جیسے ملکہ محل کے جھروکے سے اس مقابلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس میں بلا کی چستی توانائی اور دلیری آگئی اور جب یہ مقابلہ ختم ہوا تو دونوں شہزادے بُری طرح زخمی ہو چکے تھے اور خود اکثوم اس لائق نہ تھا کہ دربار سے اپنے پیروں سے واپس جا سکتا۔ عریب اسے ملکہ کے آدمیوں کی مدد سے اٹھا لے گیا اور ایک بار پھر شاہی جراح کو اس کے علاج کی طرف رجوع ہونا پڑا۔

طمسم اور جدیس کے شہزادے زخمی ہونے کے باوجود اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

ملکہ نے اپنی روانگی سے پہلے بیش قیمت لکڑیاں، سلیمان کے خدا کے معبد کے لئے خوشبویات گراں بہا جواہر اور موتی اور سونے کی وافر مقدار تحفے کے طور پر روانہ کر دی۔ ان تحائف کے ساتھ ایسے چھ ہزار غلام اور لونڈیاں بھی بطور تحفہ بھیجیں، جن کی پیدائش ایک ہی ساعت میں ہوئی تھی۔ ان کے قد و قامت ایک اور شکلیں یکساں تھیں اور ان سب کو حریر سرخ کا لباس پہنایا گیا تھا۔

کئی سال بعد جب ملکہ یروشلم کے قریب پہنچی تو سلیمان نے اس کی پیشوائی کو ایک ایسا نوجوان روانہ کیا جو صبح کی مانند خوبصورت تھا۔ ملکہ اس کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوئی۔

سلیمان نے ملکہ سے شیشے کے محل میں ملاقات کی ملکہ سمجھی، بادشاہ پانی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اپنے زیریں لباس کو اُوپر اٹھایا تو دونوں پنڈلیاں کھل گئیں۔ سلیمان ملکہ کی پنڈلیوں کے بڑے بڑے بال دیکھ کر مسکرائے انہوں نے فرمایا: "خوب۔ شکل تو تو نے حسین و جمیل عورت کی پائی ہے لیکن تیری پنڈلیوں پر بال مردوں جیسے ہیں۔" پھر سلیمان نے خدا کی شان بیان کی: "بیشک خدا کی یہی شان ہے کہ جو چیز مردوں کی زینت ہے۔ وہی عورتوں کے لئے عیب۔"

اس کے بعد ملکہ نے سلیمان سے بہت سی پہیلیاں پوچھیں اور سلیمان نے ان سب کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے دیئے کیونکہ سلیمان سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔

ملکہ سلیمان کی دانشمندی، اس کے دستر خوان، نوکروں کی نشست و برخاست، ان کی پوشاک اور خداوند کے اس مسکن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی جس پر چڑھ کر سلیمان اپنے خدا کو قربانیاں چڑھاتے تھے۔ ملکہ کے ہوش

اڑ گئے۔ وہ اس سے پہلے کسی سے بھی اتنی مرعوب اور متاثر نہ ہوئی تھی۔ اس نے سلیمان سے کہا: "اے یروشلم کے بادشاہ! میں نے تیری دانش اور تیرے کاموں کی نسبت اپنے ملک میں جو سنا تھا۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ میں نے اصل حقیقت کا آدھا بھی نہ سُنا تھا۔ مبارک ہیں تیرے لوگ اور مبارک ہیں تیرے نوکر جو ہمیشہ تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو۔ جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھ کو اسرائیل کے تخت پر بٹھایا اور تجھ کو بادشاہ بنایا کہ عدل و انصاف کرے۔"

سلیمان نے ملکہ کے حسن و جمال اور فراست و تدبر کا بڑا اثر قبول کیا۔ انہوں نے کہا۔ "میرے باپ داؤد نے تیرے ملک کی بابت پیش گوئی کی تھی کہ سبا کے بادشاہ یروشلم کے بادشاہ کو نذریں دیں گے اور تحفے پیش کریں گے، اسی طرح اشعیا نبی نے پیش گوئی کی تھی کہ اے یروشلم! حبش اور سبا والوں کی تجارت جو شریف ہیں تیرے پاس آئے گی۔ اے یروشلم! اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی اور مدین اور عیفا کی اونٹنیاں تمام سبا سے سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔ آج یہ پیش گوئیاں پوری ہو چکی ہیں۔"

اس کے جواب میں ملکہ نے سلیمان کی خدمت میں ایک سو بیس قنطار سونا بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر پیش کئے۔ کہتے ہیں کہ اس جیسی خوشبوئیں یروشلم والوں کو پھر کبھی سونگھنے کو نہ ملیں۔ سلیمان نے سبا کی ملکہ کو اس سے زیادہ تحائف عطا کئے۔

ملکہ یروشلم کے بادشاہ سلیمان کی معزز مہمان بن کر رہی۔ لیکن پھر اس کا دل اکتا گیا۔ سلیمان کی سات سو بیویاں اور تین سو حرم ملکہ کے لئے مستقل سوہان روح تھیں۔ اس نے سلیمان سے واپسی کی اجازت طلب کی اور اپنے ملازموں سمیت سبا واپس آ گئی۔

یروشلم کے سفر اور سلیمان کی کثیر ازدواج اور حرم نے ملکہ کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ مارب کا عیش و عشرت کے سامان سے آراستہ محل اس کو خوش نہ کر سکا اور اس کو زندگی میں پہلی بار حبشی شہزادے کی یاد آئی۔ چمڑے کی کشتیاں تیار کی گئیں اور ان پر لاؤ لشکر اور سامان بار کیا گیا۔ ملکہ اپنے مشیروں اور بزرگوں کے ساتھ حبشہ روانہ ہو گئی۔ اس کو یقین تھا کہ سادہ لوح اور احمق شہزادہ ابھی اس کو بھولا نہ ہو گا۔

وہ حبشہ کے ساحل پر خیمہ انداز ہو گئی اور سات افراد پر مشتمل ایک وفد حبشہ کے بادشاہ کی خدمت میں ملکہ کی آمد کی اطلاع کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ جب یہ وفد واپس آیا تو اس کے ساتھ بوڑھا عریب بھی تھا۔ ملکہ نے اس کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے خیمے میں بٹھایا۔ ملکہ کی نظریں شہزادے کو تلاش کرتی رہیں۔ بوڑھے نے اس جستجو کو پڑھ لیا [redacted] گویا ہوا! "ملکہ عالیہ! وہ اکثوم جسے تو نے مارب کے محل میں دیکھا تھا۔ دنیا حسن اور عورت کی ناقابل اعتباری سے مجروح ہو کر مر چکا ہے۔ اس کی جگہ دوسرے اکثوم نے جنم لیا ہے۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ وہ ملکہ سے ملنا گوارا کرے۔"

ملکہ پریشان ہو گئی۔ اس کا دل الجھنے لگا۔ بوڑھے عریب کی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئی تھیں۔ اس نے سوال کیا۔ "میری سمجھ میں تیری باتیں نہیں آرہی ہیں۔"

بوڑھے نے ساحل سمندر پر تعمیر شدہ ایک مینارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے خاص مصاحبین کے ہمراہ اس مینارے تک میرے ساتھ چل جس الکوم سے تو ملنے آئی ہے اب وہ حبشہ کے شاہی محل یا تخت پر نہیں ملے گا۔ وہ اس مینارے پر بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا ہے۔"

ملکہ کے دل میں امید کی کرن پھوٹی۔ وہ سمجھ گئی کہ الکوم کا یہ انتظار اس کے سوا کسی اور کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

بوڑھا عریب ملکہ کو لے کر مینارے کی طرف چل پڑا۔ ملکہ کے جلو میں ایک سو مصاحبین اور مشیر بھی تھے، یہ لوگ مینارے کے نیچے پہنچ کر رک گئے۔ بوڑھا عریب انہیں نیچے چھوڑ کر مینارے پر چڑھ گیا اور تھوڑی دیر بعد ملکہ کو تنہا لے کر مینارے پر واپس گیا۔ ملکہ کا ہر قدم جو اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا دل کو امید اور ناامیدی کے جھولے دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ مینارے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ رہی تھی تو اس کے دل کا برا حال تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دل ایک بار زور سے دھڑک کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانے والا ہے۔

جب وہ بالکل اوپر پہنچ گئی تو اس نے دیکھا کہ حبشہ کا سادہ لوح شہزادہ مینارے کے شمالی روزن سے خلا میں کچھ گھور رہا ہے۔ ملکہ کے قدموں کی چاپ بھی اس کے انہماک کو ختم نہ کر سکی۔

عریب نے شہزادہ کو مخاطب کیا۔ "شہزادے! سبا کی ملکہ تجھ سے ملنا چاہتی ہے اور اس وقت تیری پشت پر کھڑی تیری ملاقات کی منتظر ہے۔"

شہزادے نے گھوم کر ملکہ بلقیس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ملکہ! سبا واپس جاؤ۔ مجھے کاہنوں اور آنے والے زمانے کی باتیں بتانے والوں نے بتایا ہے کہ حرا کے غار اور فاران کی چوٹی سے ایک چاند طلوع ہونے والا ہے۔ اسے لوگ رحمت عالم کہیں گے۔ یہ انسان کی وحشیانہ زندگی کو نظم و ضبط اور بے راہ رو حیات کو اخلاق و آداب دے گا۔ ٹوٹے دلوں کا سہارا اور زخمی دلوں کا مرہم بنے گا۔ اس کے لوگ حبش آئیں گے اور مبارک اور خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو ان کا دیدار کریں گے۔ میں اس مینارے سے شمال مشرق میں طلوع ہونے والے اس چاند کا منتظر ہوں۔"

ملکہ کچھ دیر کھڑی شہزادے کی باتیں سنتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ شہزادہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس کو شکست ہوئی تھی اور اس کے حسن کی جملہ رعنائیاں اور قیامت سامانیاں ایک سادہ لوح کو حبشی کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

ملکہ بلقیس گرتی پڑتی مینارے سے نیچے اتری۔ اس کے مصاحبوں نے پہلی بار اس کے حسین و جمیل چہرے پر خزاں کو دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی روز وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ چمڑے کی کشتیوں سے سبا واپس چلی گئی۔

کافرِ عشق

[illegible] بصورت عثمانی

عنزہ فاطمہ اور اس کے مزاج میں پرورش پانے والا رومان، انمول اور اس کی محرابوں اور دستوروں کے درمیان گھومتے پھرتے حرماں نصیبوں کی داستانِ عشق و محبت ۔ دونوں کی حیثیت ان دو متوازی لکیروں جیسی تھی جو ایک دوسرے سے ملنا چاہتی تھیں لیکن جھکنا نہیں چاہتی تھیں۔ انھیں اس تلخ حقیقت کا علم نہیں تھا کہ دو متوازی لکیروں میں سے کسی ایک کا دوسری کی طرف ختم ہو جانا بہت ضروری ہے!

لوجا کی تسخیر کے بعد فرڈی ننڈ اور ازابیلا کی فوجیں ملاغہ کی طرف بڑھیں اور مسلم حکمران الزغل کو یہاں سے بھی بے دخل ہونا پڑا۔ اسقف اعظم اپنے دو کمتر درجے کے پادریوں کے ساتھ فوج کے درمیان سے نمودار ہوا۔ دونوں پادری ایک بڑی سی صلیب کو اپنے ہاتھوں سے سنبھالے ہوتے تھا اسقف اعظم کے پیچھے پیچھے ملاغہ کے قلعے پر چڑھ گئے تھے قلعے کی بلند ترین برج کے اوپر ہلالی پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اسقف اعظم نے نفرت اور حقارت کی شدت کے زیر اثر ہلالی پرچم کو اتار کر قلعے کے نیچے پھینک دیا اور اس کی جگہ پورے عزت و احترام کے ساتھ صلیب نصب کر دی گئی۔ اسقف اعظم اور دونوں پادریوں کے چہروں پر مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئیں۔ پیچھے مسیحی افواج اور ان کے آقا فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا کی نظریں بھی ملاغہ کے قلعے پر جمی ہوئی تھیں، صلیب کی تنصیب کے ساتھ ہی نعرہ تحسین و مسرت سے میدان گونج گیا اور ملاغہ کی پہاڑیوں سے بلند ہونے والی صدائے بازگشت نے ملاغہ کے مسلمان شہریوں کو بتلایا کہ اب وہ فاتح نہیں مفتوح ہیں، وہ حاکم نہیں محکوم ہیں۔ اب عیسائی فرماں روا فرڈی ننڈ اور اس کی ملکہ ازابیلا ان کے بادشاہ تھے اور ملاغہ کے مسلمان ان کی رعایا۔

ملاغہ کے بعد اب غرناطہ ان کے سامنے تھا اور یہ آخری قلعہ تھا جس کی تسخیر کے بعد فرڈی ننڈ اور ازابیلا فرط خوشی میں یہ نعرہ بلند کر سکتے تھے کہ "اب اندلس ان کا ہے اور اندلس کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں ان دونوں سے زیادہ عظیم اور ناقابل فراموش فاتح نہیں پیدا ہوئے۔"

غرناطہ کے قصر الحمرا میں ابو عبداللہ نے فرڈی ننڈ اور ازابیلا کی فتحمندی کی خبر جوش مسرت سے سنی اور اپنے شکست خوردہ چچا الزغل کو مدد یا پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو عبداللہ نے مسیحی فاتح کی خدمت میں لوجا اور ملاغہ کی فتحمندی پر پیغام مبارکباد روانہ کیا۔ اس نے اپنے نامۂ مبارکباد میں لکھا تھا۔

"تو جانتا ہے کہ تیرا مفتوح الزغل میرا حقیقی چچا ہے لیکن میں اسے اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتا ہوں، جب میرے باپ ابوالحسن نے میری ماں عائشہ کے مقابلے میں اپنی مسیحی بیوی زہرا پر اپنے لطف و کرم کی بارش کر دی اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ غرناطہ کی حکومت زہرا کی اولادوں میں چلی جائے گی تو میں نے اپنی ماں کے اشارے پر بدرجۂ مجبوری اپنے باپ ابوالحسن کے خلاف اعلان بغاوت کر کے الحمرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اب میں غرناطہ کا واحد حکمران ہوں اور جب میں نے اپنے باپ ابوالحسن پر غرناطہ کے دروازے بند کر دیئے تو یہ میرا چچا الزغل ہی تھا جس نے اسے پناہ دی میرا باپ

چند دن بیمار رہ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور الزغل تیری بہادر سپاہ کے ہاتھوں ملاغہ سے دستبردار ہو چکا اب غرناطہ کے سوا سب کچھ تیرے قبضے میں ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ تو اپنے وعدوں کے مطابق میرا مخلص دوست بلکہ مربی ثابت ہو گا۔ تو اپنی لوجا اور ملاغہ کی شاندار فتح پر میری جانب سے پُر خلوص مبارک باد قبول فرما۔"

لیکن فرڈی ننڈ اور ازابیلا پر اس مبارکباد کا یہ اثر پڑا کہ ملاغہ کے بعد ان کی فوجیں غرناطہ کی طرف بڑھیں اور اسے اپنے محاصرے میں لے لیا۔ آس پاس کی مسلم آبادی کو قتل اور فصلوں کو برباد کر دیا گیا۔ مکانات نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ ابو عبداللہ قصر الحمرا کی وسعتوں میں چھپ گیا۔ جب مسیحی افواج کے محاصرے نے طول کھینچا اور غرناطہ والوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو بزدل اور کم ہمت ابو عبداللہ نے دشمن کی پُر فریب نرم شرائط پر صلح کر لی۔ غرناطہ کی سپردگی سے پہلے ابو عبداللہ نے فرڈی ننڈ کے سامنے جو شرائط بھی رکھیں وہ بلا تامل اور بے چون و چرا مانتا چلا گیا اور اپنی بزدلی اور دون ہمتی کے زیرِ اثر تاریخ کا یہ نکتہ فراموش کر گیا کہ دُنیا کی بدترین ناانصافیاں اور بد عہدیاں میدانِ جنگ میں ہی رُونما ہوتی رہی ہیں۔

قرطبہ کے بنو سراج ابو عبداللہ کے فیصلوں کے خلاف تھے۔ لیکن ان کے اختلاف کو بھی نظر انداز کر دیا گیا اور معمولی اور غیر معمولی سڑسٹھ وعدے حاصل کرنے کے بعد ابو عبداللہ غرناطہ اور قصر الحمرا کو فرڈی ننڈ کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ان سڑسٹھ وعدوں میں یہ وعدے بھی شامل تھے کہ غرناطہ سے دستبرداری کے بعد اسے البوکسرا کی جاگیر عطا کی جائے گی۔ کسی مسلمان کو جبراً عیسائی نہ بنایا جائے گا۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور املاک پر زبردستی قبضہ یا نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔

بنو سراج کے موسیٰ نامی غیرت مند جرنیل نے بزدل ابو عبداللہ سے اختلاف کیا اور اپنا خاندانی نعرہ "عزت یا موت" بلند کیا وہ دشمن کے دم دلاسوں سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے ابو عبداللہ سے کہا کہ "اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی میراث سے محروم اور وطن سے دستکش ہو جائیں تو ہمیں خدا کے اس فیصلے کو جوانمردی اور غیرت مندی کے جذبوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے۔"

اس کے بعد موسیٰ نے ابو عبداللہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا۔ جسم کو فوجی ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ بیوی کو الوداعی بوسہ دیا اور پھر اپنے تین سالہ بچے حسن کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے گالوں کو چوما اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بیوی کے حوالے کر دیا۔ اسی لمحے ایک کمرے سے موسیٰ کا بوڑھا باپ نکلا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور موسیٰ کو یہ محسوس ہوا جیسے بوڑھا باپ کہہ رہا ہو۔۔۔

عزت یا موت!

موسیٰ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کے باہر نکلا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا فرڈی نند کے لشکر کے سامنے پہنچ گیا۔ اور مقابلے کے لئے کسی بہادر کو طلب کیا۔ یکے بعد دیگرے کئی بہادر موسیٰ کے مقابلے پر آئے اور پھر اپنے لشکر میں واپس نہ جا سکے۔ موسیٰ کے سامنے چالیس ہزار پیادے اور دس ہزار شہسوار اس عجیب و غریب مقابلے کو حیرت اور رشک سے دیکھ رہے تھے۔ پچاس ہزار سپاہیوں کے اُس پار دُور دُور تک ان کے خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ جب فرڈی نند نے یہ یقین کر لیا کہ اس دو بدو مقابلے میں اس کے بہت سے بہادروں کے مارے جانے کا احتمال ہے تو اس نے موسیٰ کو گھیر کر زندہ گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ موسیٰ نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور اسے دوڑاتا ہوا دریائے شنیل کے کنارے پہنچ گیا۔ ایک بار پیچھے مڑ کر فرڈی نند کی سپاہ کو دیکھا اور پھر گھوڑے سمیت دریا کی گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا۔

پھر غرناطہ کے دروازے کھل گئے اور فرڈی نند کی فوجیں قصر الحمرا کے سامنے پہنچ گئیں۔ ابو عبداللہ اپنے خاندان سمیت قصر کے باہر آ گیا۔ اس نے بچشم نم مرتعش ہاتھوں سے قصر کی کنجیاں فرڈی نند کے حوالے کر دیں اور رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تو ہمارا بادشاہ ہے اور ہم تیری رعایا"

ابو عبداللہ اور اس کے خاندان کی موجودگی میں الحمرا کی چوٹی سے ہلالی پرچم اتار کر صلیب نصب کر دی گئی۔ ان کے دل بھر آئے اور جب وہ پادول کی پہاڑیوں سے گزر رہے تھے تو ابو عبداللہ کی ماں عائشہ نے اسے روتے ہوئے دیکھ کر طنز کیا۔ "جس حکومت کی تو مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکا اس پر عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟"

فرڈی نند کے سپاہیوں نے غرناطہ کے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو فاتحین کسی مفتوح قوم کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ ان کی املاک جلا دیں فصلیں ویران کر دیں اور شہر دھوئیں کے بادلوں میں چھپ گیا۔ انہی میں موسیٰ کا بوڑھا باپ بھی کام آ گیا۔ اس بوڑھے سے جب یہ کہا گیا کہ وہ مکان خالی کر کے افریقہ چلا جائے تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں اپنے باپ دادا کے مقابر کے قریب رہنے کا خواہشمند تھا لیکن اندلس کے مشہور پیشہ ور مسیحی جنگجو خاندان سیڈ کے ایک فرد نے اس بوڑھے کو ہلاک کر دیا۔ بوڑھے کی پسلیوں میں نیزہ ننھے حسن کی آنکھوں کے سامنے اتارا گیا تھا۔ ماں کی چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد انہیں دوسرے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ افریقہ جلا وطن کر دیا گیا۔ کچھ خاندان مراکش چلے گئے۔ کچھ نے فاس کی راہ لی۔ اور بنو سراج طرابلس

کے ساحل پر آباد ہو گئے۔ انہیں اپنا آبائی وطن غرناطہ بری طرح یاد آ رہا۔ وہ نمازیں پڑھ چکنے کے بعد اپنا منہ غرناطہ کی طرف کر لیتے اور خدا سے دوبارہ وطن پہنچنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ وہ کسی معجزے کے منتظر تھے۔ ایک ایسا معجزہ جو انہیں فاتح کی حیثیت سے غرناطہ میں دوبارہ پھر حکمرانی عطا کر سکتا [redacted]۔

اس بات کو بیس سال گزر گئے اور حسن اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں داخل ہو گیا۔ ماں اپنے بیٹے کی جوانی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر موسیٰ کا ابو داعی منظر اور ہمیشہ کی گمشدگی کو ابھی تک نہ بھولی تھی، اور پھر حسن کے دادا کی بیکسانہ موت نے اسے اور بے چین کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دشمن سیڈ خاندان سے اچھی طرح واقف تھی، وہ بیس سال تک مسلسل ان دونوں اذیت ناک واقعات کو حسن کے سامنے بیان کر کے اسے انتقام پر آمادہ کرتی رہی۔ آخر جب وہ تیئیس سال کا ہو گیا تو وہ خود ہی ایک تاجر کے بھیس میں غرناطہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے ریشم اور کتان کے قیمتی کپڑے اپنے ساتھ لئے اور طرابلس کے ایک تجارتی جہاز پر سوار ہو کر اندلس روانہ ہو گیا۔ راستے میں کئی بار اس کا جہاز طوفانوں میں گھر گیا لیکن بچتا بچاتا ایک ماہ بعد وہ اندلس کے جنوب مشرقی ساحل المیریہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا۔

جب وہ چھلانگ لگا کر ساحل پر اترا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ساحل کے کنارے کنارے دُور تک سبزہ اُگا ہوا ہے۔ اسے کچھ عمر رسیدہ مسلمان تاجروں نے بتلایا کہ جب وہ اس ملک کے حکمران تھے تو اس ساحل سے اتنی تجارت ہوتی تھی کہ جہاں آج سبزہ اُگا ہوا ہے، وہاں لوگوں کی کثرت آمد و رفت سے زمین چکنی ہو گئی تھی۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے "لیکن تقدیرِ الٰہی پر بھلا کس کا زور چلتا ہے!"

المیریہ کے قدرتی مناظر اور ان کی دلکشی نے حسن کے دل کو جیت لیا، یہ شہر دو پہاڑیوں پر اور اس کے بیچ میں آباد تھا۔ اس نے کرائے کے خچروں پر اپنا سامان بار کیا اور شہر میں مسلمان تاجروں کی سرائے میں جا اترا۔ اس نے ایک رات سرائے میں سکون سے گزاری۔ اس کے بعد صبح ہی صبح المیریہ کی آبادیوں اور اس کی اسلامی تاریخی یادگاروں کو دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔ کرائے کے خچروں پر سوار وہ شہر کے سرسبز و شاداب حصوں سے گزرتا ہوا جب شمالی پہاڑی کی آبادی کی طرف بڑھا تو اسے دُور ہی سے غریب الوطن اندلسی مسلمانوں کی عظیم الشان یادگاریں دکھائی دینے لگیں۔ حسن کا رہنما اور خچر کا مالک اس کے ساتھ پیدل سفر کر رہا تھا۔ حسن نے دُور پہاڑی کے درختوں اور عمارتوں کے درمیان نظر آنے والے سب سے بلند میناروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میرے دوست! خدا تجھے دولتِ ایمان سے شادکام کرے۔ ذرا بتلانا تو یہ بلند ترین مینارے کس چیز کے ہیں؟"

رہنما ساتھی نے ناگواری سے جواب دیا "معزز مہمان! ہم اپنے وطن کو مسلمان کافروں سے تقریباً ۲۰۰ سال پہلے ہی نجات دلا چکے ہیں۔ تمہیں اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئیے کہ میرا دل مسیح کی محبت اور ایمان سے منور ہے اور اب تمہیں اس روشنی کی البتہ ضرورت ہے۔"

حسن غریب الدیار تھا۔ مجبوراً اپنے رہنما کی تلخ ترین بات کے زخم کو سہہ گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

رہنما ساتھی نے کہا۔ "یہ قلعہ خیران ہے جسے یہاں کے مسلمان عامل خیران صقلبی نے تقریباً چار ساڑھے چار سو برس قبل تعمیر کرایا تھا۔"

حسن مسلمانوں کی شکست خوردگی اور جلاوطنی کو سوچ کر مغموم ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اے میرے فاتح ہم مذہبو! تم کہاں ہو؟ کیا تمہاری روحیں میرے آس پاس موجود میرے سوگوار دل کی حالت محسوس کر رہی ہیں؟"

اس نے اپنے عبا کی آستین سے آنکھوں کے آنسو خشک کئے جیسے رہنما سمجھ گیا کہ اجنبی مرد اپنی قوم کے زوال سے متاثر ہو کر آنسو بہانے پر مجبور ہو گیا ہے۔

جب وہ قلعہ خیران میں داخل ہوا تو اُسے اپنے سامنے دُور تک شاندار عمارتوں کا طویل سلسلہ نظر آیا اور آس پاس لیمو، سنگترے اور بادام کے درختوں کے گھنے سلسلے پھیلے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کی بھینی بھینی ترشی آمیز خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔ وہ خچر سے اتر پڑا۔ اور اسے اپنے رہنما کے حوالے کر کے تنہا درختوں کے جھنڈ میں ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ اس کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ کہ اس کے آباؤ اجداد اس جنتِ ارضی سے جبراً جدا کر دیئے گئے۔ ابھی وہ فرطِ دیوانگی میں یہاں کے قدرتی مناظر سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہوا تھا کہ درختوں کے ایک گوشے سے ہلکے سروں میں طنبورے کی آواز سنائی دی وہ بے ساختہ اس آواز کی طرف کھنچا چلا گیا۔ یہ آواز لیمو کے درختوں کے جھنڈ میں سے آ رہی تھی۔ وہ درختوں کی شاخیں دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہاں چند نوجوان لڑکیاں بیٹھی ساز و نغمات سے اپنے دل بہلا رہی تھیں۔ ایک اجنبی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گئیں اور اٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ ایک لڑکی جو کیتھولکوں کے مخصوص وضع کے شلوکے اور پاجامے میں ملبوس تھی کھڑے ہو کر حسن کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے چہرے کو باریک ترین جالی میں چھپا

لیا۔ حسن معذرت کرتا ہوا بولا۔" اے حسینان رشکِ حور! مجھ سے خوفزدہ مت ہو۔ میں جلاوطن موروں کی اولاد ہوں اور یہاں سامانِ تجارت لے کر آیا ہوں!"

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اس نے اسپینی آمیز عربی میں کہا۔" مجھے مور بہادروں سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی جو اولادیں یہاں رہ گئی تھیں وہ بزدل تھیں، تم کہاں شہر سے ہو اور کس چیز کی تجارت کرتے ہو؟"

حسن لڑکی کی بے تکلفی پر خوش ہو گیا۔ اس نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔" میں ریشمی اور کتان کے کپڑوں کی تجارت کرتا ہوں اور یہاں کے موروں کی سرائے میں ٹھہرا ہوں۔"

لڑکی نے اپنی سہیلیوں کو آواز دے کر واپس بلالیا۔" میری ہم عمرو! واپس آجاؤ۔ یہ مور بہادر شریف تاجر ہیں جو یہاں کے فاتح اور جلاوطن موروں کی اولاد میں سے ہیں!"

لڑکیاں واپس آگئیں۔ اس لڑکی نے کہا۔" بہادر مور! میں حقیقتہً غرناطہ میں رہتی ہوں، یہاں میرے ماموں رہتے ہیں۔ میں سمندری ہواؤں، ان کی سرکش موجوں اور المیریہ کے حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے چند دنوں کے لئے یہاں آگئی ہوں کیا تم غرناطہ جانا پسند کرو گے؟"

حسن نے محسوس کیا لڑکی کی آنکھوں میں دلوں کو موہ لینے والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اسی لمحے درختوں کے ایک گوشے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی داخل ہوا جو اپنے معمولی لباس کی وجہ سے خدمت گار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آتے ہی گہری نظر سے حسن کو دیکھا اور پھر اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔" میرینہ! تیرے ماموں کھانے پر تیرے منتظر ہیں، اور یہ مور یہاں کیوں آیا؟"

لڑکی نے جلدی جلدی حسن کا تعارف کرایا اور آخر میں کہنے لگی۔" جو بحر یہ خود بھی یہاں اجنبی اور مسافر ہے اور تجارت کی غرض سے آیا ہے۔ اس لئے ہمیں پرانی کدورتیں اپنے دلوں سے دور کر کے اس کا ایک مہمان کی حیثیت سے خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرنا چاہیے۔"

اس دوران دوسری لڑکیاں جا چکی تھیں، اور اب وہاں خدمتگار میرینہ اور حسن کے سوا جو تھا کوئی شخص نہ تھا۔ میرینہ نے جب اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو جیسے اسے ہوش آ گیا اور حسن نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ چہرے کی باریک جالیوں کے اس پار شرم و حیا سے نظریں جھک چکی ہیں۔ کوئی ایسی ہی کیفیت تھی جس نے میرینہ کو بدحواس کر دیا تھا۔ اور اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔ اسی عالمِ وحشت اور کیفیتِ گم گشتگی میں میرینہ مزید کچھ کہے سنے بغیر اپنے خدمتگار کے ساتھ چلی گئی۔ حسن خود بھی حیرت زدہ اور کھویا کھویا سا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گردوپیش پھیلے ہوئے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئیں اور جب

حسن کو ہوش آیا تو اسے پتہ تک نہیں معلوم تھا کہ میرینہ ان درختوں کے جھنڈ میں کہاں غائب ہو چکی ہے۔ وہ شکستہ دل سے بھاری بھاری قدم بیماروں کی طرح اٹھاتا ہوا باہر آیا۔ جہاں اس کا پرانا ساتھی اس کے انتظار میں ایک درخت کے تنے سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ حسن کے قدموں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خچر کو اس کے قریب لے جاتا ہوا بولا۔ "مور بہادر! اب کدھر کا ارادہ ہے؟ کیا خیران صقلبی کی عظیم الشان عمارتیں دیکھنا پسند کرو گے؟"

حسن اچھل کر خچر پر سوار ہو گیا۔ "مور تاجروں کی سرائے واپس چلو۔ ان ماتم کدوں سے میری طبیعت گھبرا گئی ہے۔" اس کے بعد اس نے دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "یا رسول اللہ! اپنے محبوں کو ان کے آبا و اجداد کے وطن اندلس کی حکومت دوبارہ عطا فرمایئے!"

رہنما عیسائی نے طنز سے ہنستے ہوئے کہا۔ "مور! یہ تیرا خیال خام ہے تو ایسی دعا کیوں مانگتا ہے جو اب کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ آخر کبھی ہمارے آبا و اجداد نے بھی تو مفتوحوں جیسی زندگی گزاری ہے۔"

اب حسن کسی اور ہی کش مکش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مور تاجروں کی سرائے میں بیسیوں تاجر ٹھہرے ہوئے تھے اور سبھی اپنی کاروباری مصروفیات میں سرگرم عمل تھے۔ حسن چاہتا تو اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کاروباری بات چیت کرتا لیکن اب وہ ہر روز علی الصباح المیریہ کی شمالی پہاڑی پر چلا جاتا اور وہاں خیران صقلبی کے محلات، لیموؤں کی جھاڑیوں اور بادام و سنگتروں کے سلسلے میں خاموشی سے میرینہ کو تلاش کرتا۔ وہ میرینہ سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک جھلک دکھا کر اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ اب المیریہ کے اس سرسبز و شاداب علاقے میں پہلی جیسی خوبصورتی باقی نہیں رہی تھی۔ اور خیران صقلبی کے محلات اب اپنی عظمت اور بڑائی کے اعتبار سے حسن کی نظر میں روز اول جیسے نہ تھے۔ افسوس تو یہی تھا کہ وہ میرینہ کی بابت کسی سے پوچھ گچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس تلاش اور جستجو میں اس نے آٹھ دن گنوا دیئے لیکن میرینہ کی شکل دوبارہ نہ دکھائی دی۔ پھر آہستہ آہستہ مایوسی نے گھر کرنا شروع کر دیا اور اس نے اپنے آپ کو خوب لعنت ملامت کی کہ ایک ایسی لڑکی کے لئے اس نے آٹھ دن کیوں ضائع کر دیئے جو ظالم اندلسی مسیحیوں سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے اس جذبے پر نفرین کی جو وہم سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس پشیمانی اور خجالت کے باوجود المیریہ کی دلکشی واپس نہ آ سکی۔ اسے اپنا وہ عہد یاد آیا جسے وہ اپنے دل میں چھپائے المیریہ کے ساحل پر اترا تھا۔ اس کی اصل منزل غرناطہ تھا اور وہاں اس خاندان کو تلاش کرنا تھا جس نے تقریباً بیس سال قبل

اس کے باپ کو نابید اور دادا کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس پر اپنے باپ اور دادا کی طرف سے ایک قرض واجب الادا چلا آرہا تھا اور وہ یہاں اسی قرض کو چکانے آیا تھا۔

اس نے اپنا سامان باندھا اور ایک دن غرناطہ جانے والے قافلے میں شامل ہو گیا۔ اسے راستے میں کئی دریا ملے جو لہروں میں مچلتے ہوئے ادھر ادھر نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ اس نے سبزہ زاروں اور انگوروں کی بیلوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے راز و نیاز میں مصروف عاشقوں اور ان کے محبوبوں کو دیکھا اور ایسے ہر منظر نے اس کے دل میں خود بخود میرینہ کی یاد تازہ کر دی۔ جب سیحی فوجی سوار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے تو اسے گھور کر دیکھتے ضرور اور پھر دیر تک اور دور تک پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتے رہتے کیونکہ حسن کی وضع قطع ڈیل ڈول اور صورت شکل عام موروں سے بہت مختلف اور زیادہ شاندار تھی۔ شیلر کی پہاڑیوں سے نکلنے والے دریائے شنیل کو پار کر کے وہ غرناطہ کے قریب پہنچا اور پھر دور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے کنارے سے گزرتا ہوا وہ دریائے ڈارو کے ساحل پر پہنچ گیا اور پھر اس کے کنارے کنارے چل کر بیس دروازوں اور ایک ہزار برجوں کے شہر غرناطہ میں داخل ہو گیا۔

حسن نے پہاڑی پر برف پوش سیرا نواد کی چوٹی سے نیچے سرخ رنگ مربع برجوں کو دیکھا جن کا نچلا حصہ سبزہ زاروں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اس حسین منظر کو دیکھا تو تڑپ گیا۔ اپنے ایک ہم قافلہ بزرگ سے پوچھا: "میرے بزرگ! خدا تجھے اور تیری آنکھوں کے نور کو ہمیشہ قائم رکھے۔ کیا تو واقف ہے کہ یہ سرخ اور مربع برج کس چیز کے ہیں؟"

عمر رسیدہ تاجر نے ایک نظر حسن پر ڈالی اور افسردہ لہجے میں جواب دیا: "بہادر مرد! یہ قصر الحمرا کے برج ہیں۔ ملت اسلامیہ غرناطہ کا آفتاب اسی قصر میں غروب ہوا تھا۔"

حسن کے دل سے ایک آہ ابھری اور پورے جسم کو لرزا گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسی قصر میں بنو سراج کے محلات بھی تھے۔ جہاں آج اداسی اور ویرانیت نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اسی قصر میں شیر دل والا وہ حوض بھی موجود ہو گا جہاں بنو سراج کے چھتیس بہادروں کو دعوت کے دھوکے سے جمع کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ان کی ہمدردیاں ابو عبداللہ کے باپ ابوالحسن کے حق میں تھیں۔

غرناطہ میں موروں کی سرائے شہر کے جنوب مشرقی کنارے واقع تھی۔ حسن سرائے میں آیا

گیا۔ ایک دن اور ایک رات اس نے منصوبہ بندی میں گنوا دی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ بیس سال پہلے اس کا خاندان یہاں کہاں آباد تھا اور اب اس مکان پر کس کا قبضہ تھا۔ تقدیر کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ آج وہ اپنے آبائی وطن کی سرائے میں مسافر بن کر ٹھہرا تھا اور کسی کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ دو دن تک وہ ایک مقامی کیتھولک مسیحی راہنما کے ساتھ شہر میں گھومتا پھرتا رہا اور یہاں کے چپے چپے کے بارے میں نہایت ذوق و شوق سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس کے رہنما کو حسن سے بہت ہمدردی تھی۔ اور جب حسن کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں تو کیتھولک رہنما رونے میں حسن کو حق بجانب قرار دیتا۔ آخر ایک دن حسن نے اپنے رہنما کی ضرورت کو بھی فضول سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور تنہا نکل کھڑا ہوا۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ جن مسجدوں سے چوبیس گھنٹوں میں پانچ بار مؤذن کی پرشکوہ آوازیں گونجتی تھیں آج وہ گرجوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اور اب وہاں سے صبح و شام دعاؤں کی گھنٹیاں بجا کرتی تھیں۔ اس نے چند ایسی شاندار عمارتیں دیکھیں جو ویران تھیں اور انہیں مقفل کر دیا گیا تھا۔ ان سب کے بڑے بڑے دروازوں کی پیشانی پر ایک جیسی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔

"دنیا چار چیزوں سے قائم ہے' دانا کے علم سے' بڑے آدمی کے انصاف سے' عابد کی دعا سے اور بہادروں کی بہادری سے۔"

اس نے کسی راہگیر سے پوچھا کہ "یہ کس کی رہائش گاہیں تھیں؟"

اسے جواب ملا کہ "یہ رہائش گاہیں نہیں' درسگاہیں تھیں۔ موروں میں ہر قسم کے علوم حاصل کیا کرتے تھے۔ لیکن موروں کے اخراج کے بعد انہیں مقفل کر دیا گیا ہے۔"

حسن نے اپنے دل میں کہا کہ "میرے بزرگو! تم میں نہ تو دانائی تھی نہ انصاف تھا نہ عبادت تھی اور نہ ہی بہادری باقی رہ گئی تھی پھر تم حکومت کی مسند پر کس طرح فائز رہ سکتے تھے۔"

غرناطہ کی جامع مسجد کے بلند مینارے اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ لیکن اب وہ مسجد کی جگہ گرجا بن چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر خطِ نسخ کی عبارتیں کچھ مٹائی جا چکی تھیں کچھ باقی تھیں۔ وہ فرطِ جذبات میں دیوانوں کی طرح اس کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ستونوں اور محرابوں کے جنگل سے گزرتا ہوا جب وہ اس کے درمیانی صحن میں پہنچا تو وہاں کے سبزہ زار اور فواروں سے ٹکرا کر آنے والی ہواؤں نے طبیعت میں فرحت اور تازگی پیدا کر دی۔ ایک پادری نے اسے روکا۔ اور مختلف قسم کے سوالات کئے۔ حسن نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ آوارہ وطن مور ہے جسے ان یادگاروں کی کشش نے طرابلس کے ساحل سے کھینچ بلایا ہے۔

پادری مسکرا دیا اور زہریلے لہجے میں کہا "تجھے اپنے باپ دادا کی فضول کاریوں کو ضرور دیکھنا چاہیے لیکن یہ بات مت بھولنا کہ اب یہ مسجد نہیں گرجا ہے!"

پادری کے پاس سے گزرتا ہوا مسجد کے منبر کی طرف بڑھا۔ جسے اب قربان گاہِ مسیح میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ابھی اس کے اور منبر کے درمیان کئی ستون حائل تھے کہ اس نے کسی عورت کو قربان گاہِ مسیح کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا دیکھا پہلے تو اس نے یہ سوچا کہ مزید آگے بڑھنے سے گریز کیا جائے لیکن اسی لمحے اس کے کانوں میں عورت کی آواز اتر گئی، عورت کا لہجہ گریہ دبا کا تھا جیسے وہ رو رو کر کوئی مناجات کر رہی ہو۔

حسن چوروں کی طرح پنجوں کے بل آگے بڑھا اور عورت کے قریب ترین ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ عورت بدستور مناجات میں محو رہی۔ اُسے حسن کی آمد کا بالکل علم نہ تھا۔ عورت کی پشت حسن کی طرف تھی اور چہرہ قربان گاہِ مسیح کے روبرو۔ حسن نے سوچا معلوم نہیں اس عورت پر کون سی افتاد آپڑی ہے جس کے لئے اپنے مسیح سے استعانت کی طلبگار ہے۔

حسن واپسی کے ارادے سے مڑنے ہی والا تھا کہ عورت کو کسی طرح اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا، اور اس نے پلٹ کر دیکھا حسن لڑکھڑا گیا گویا ایک بجلی سی کوند گئی۔ عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ میرینہ تھی۔ حسن بے خیالی میں خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرینہ کی آنکھوں میں حیرت، اشتیاق اور خوشی کی چمک پیدا ہو چکی تھی۔

حسن تقریباً دوزانو ہو گیا۔ "دیکھ میرا خدا کس قدر سچا ہے۔ میں نے اس کے آگے تجھ سے ملنے کی صدقِ دل سے دعا مانگی تھی۔"

میرینہ کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔ "اور میرے مسیح کی بابت کیا کہتے ہو۔ میری خواہش کا ابھی پوری طرح اظہار بھی نہ ہوا تھا کہ تم نظر آ گئے۔"

حسن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ کہتا رہا۔ "میں تجھے المیریہ کی پہاڑی آبادیوں میں تلاش کرتا رہا۔ غیرانِ صقلبی کے محلات میں ڈھونڈا اور سنگتروں اور باداموں کے سلسلے میں تیری جستجو کرتا رہا!"

میرینہ نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ آہستہ سے بولی "اس طرح مت بیٹھ۔ کوئی دیکھ لے گا تو میری رسوائی ہو گی۔"

حسن کھڑا ہو گیا۔ "میں تیرا پتہ پوچھنا بھول گیا تھا۔"

میرینہ گھبرا رہی تھی۔ اس کے اعصاب انتشار اور بے چینی کے شکار ہو گئے تھے۔ اس نے گھبرائے

ہوتے لہجے میں پوچھا "تم میرا پتہ کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے؟"
حسن کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اس غیر متوقع سوال سے ذرا گھبرا گیا۔ میرینہ اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب وہ کوئی جواب نہ دے سکا تو میرینہ خود بولی "میں نے تمہارا ذکر اپنے باپ سے کیا تھا وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا۔ میرے باپ کی نظر میں صرف بہادر لوگ ہی عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں تاجروں سے کوئی دلچسپی نہیں"
حسن کے جی میں آئی کہ اسی وقت یہ راز کھول دے کہ اس کا تعلق غرناطہ کے مشہور بہادر خاندان سراج سے ہے جنہوں نے کبھی ابوالحسن کی عیسائی بیوی زہرا کا ساتھ دیا تھا لیکن خود عیسائیوں نے انہیں جلا وطن کر دیا۔ مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا وہ مرے وہ جس ارادے کے ساتھ یہاں آیا تھا اسے اس انکشاف سے نقصان پہنچ جاتا۔ حسن نے جواب دیا "تجارت کوئی برا پیشہ تو نہیں۔ ہمارے پیغمبر خاتم النبیین بھی تو تاجر رہے تھے!"
میرینہ نے تکلیف دہ لہجے میں کہا: "یہ تم بار بار اپنے خدا اور اپنے پیغمبر کا ذکر کیوں چھیڑ دیتے ہو؟"
حسن نے کہا "اچھا اگر تمہیں اس ذکر سے تکلیف پہنچتی ہے تو میں آئندہ اس سے پرہیز کروں گا"
اس کے بعد اس نے مسجد کے منبر کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور دعائیہ انداز میں بولا "یا رسول اللہ! آپ اس کے گواہ ہیں کہ میرے دل میں اس وقت بھی آپ کے لئے وہی محبت اور عقیدت موجود ہے جو میرینہ کی ملاقات سے پہلے تھی"
میرینہ کو حسن کی اس اضطراری کیفیت پر ہنسی آ گئی۔ پھر اس کی نظریں دور مسجد کے صحن کی طرف اٹھ گئیں۔ کوئی شخص صحن کے فواروں کے پاس سے گزرتا ہوا اُن کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میرینہ گھبراہٹ میں مسیح کی قربان گاہ کی طرف بڑھ گئی اور حسن کو آہستہ سے بتاتی گئی۔
"والد صاحب غالباً میری تلاش میں ادھر آ رہے ہیں تم تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے ٹل جاؤ۔ ان کی موجودگی میں دوبارہ آ جانا"
حسن نے صحن کی طرف دیکھا۔ اس وقت میرینہ کا باپ مسجد کے ستونوں کی آڑ میں ہو چکا تھا حسن اپنے داہنے ہاتھ کی دیوار پر کندہ عربی آیتوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دیوار قربان گاہ مسیح سے ذرا فاصلے پر تھی۔ حسن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان آیات کو پڑھ لے لیکن انہیں تو کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کی گئی تھی کچھ دیر تک وہ ان آیات کے پڑھنے کی کوششوں میں کھویا رہا جب ذرا ہوش آیا تو اس نے دیکھا میرینہ اور اس کا تقریباً پچاس پچپن سالہ باپ دونوں حسن کی طرف چلے آ رہے تھے۔ بوڑھے کی کمر سے تلوار لٹک رہی تھی۔

اور اس کا لباس چست تھا۔ سر اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے داڑھی گھنی اور چہرہ بارعب تھا۔ جسم بالائی نصف حصہ ابھی خم نہ ہوا تھا۔

جب وہ دونوں حسن کے قریب آگئے تو میرینہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور میرینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ اپنے باپ سے بولی "بابا جان! یہی وہ تاجر نوجوان ہے جو مجھے المیریہ میں ملا تھا اور جس کا میں نے ذکر کیا تھا!"

میرینہ کے باپ نے خندہ پیشانی سے اس مور کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اور دونوں نے خالص مشرقی انداز میں مصافحہ کیا۔ میرینہ کا باپ کہنے لگا "تو سپاہی نہیں تاجر ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ اندلس کی فضا میں تجھے کوئی خوشی تو نہیں حاصل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ یہ جنت زار موروں کے لئے جہنم زار بن چکا ہے لیکن ایک مور ہونے کی حیثیت سے میں تیری عزت کرنے پر مجبور ہوں۔ تیرے آباؤ اجداد واقعی بہادر اور بیغرت مند تھے۔"

حسن کو حوصلہ ہوا کہ اب وہ بھی کچھ بڑھ چڑھ کر باتیں کر سکتا ہے۔ اس نے کہا "ہمیں دو ہی چیزیں زیادہ پسند ہیں۔ میدان کارزار جہاں ہمیں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے یا پھر تجارت کہ اس کے ذریعے شوق مہم جوئی بھی پورا ہوتا ہے اور دنیا کو سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔"

میرینہ چپ چاپ ان دونوں کی باتیں سنتی رہی وہ بہت خوش تھی کہ حسن کا تعارف کسی تکلیف دہ واقعے کے بغیر اس کے باپ سے ہو گیا تھا۔

اس کا باپ کہہ رہا تھا "بہادر مور! تم مجھ سے میرے گھر پر مل سکتے ہو۔ میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا اور یہ معلوم کروں گا کہ جب تم لوگ سرزمین اندلس کو چھوڑ کر افریقہ پہنچے تو تم پر کیا بیتی اور وہاں کی فضائیں تمہیں کس حد تک راس آئیں!!"

حسن آزردہ ہو گیا۔ مغموم لہجے میں بولا "اس وقت میں تین سال کا تھا مجھے کچھ پتا نہیں کہ جب میرا خاندان یہاں سے ہجرت کر رہا تھا تو اسے کیسے کیسے مصائب سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہسپانیہ سے جدا ہو کر میری ماں قبل از وقت بوڑھی ہو گئی اور غرناطہ کی یاد آج بھی اسے ستاتی رہتی ہے!"

میرینہ کے باپ نے دریافت کیا "تیرا باپ کہاں ہے؟"

حسن نے دروغ گوئی کا سہارا لیا "وہ طرابلس پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی رخصت ہو گیا تھا۔"

"اچھا!" بوڑھے نے افسوس کا اظہار کیا "تم کسی وقت بھی میرے گھر آسکتے ہو!"

چونکہ وہاں زیادہ دیر تک کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہنا تہذیب اور شائستگی کے خلاف تھا۔ اس لئے انہیں ایک دوسرے سے مجبوراً جدا ہو جانا پڑا۔ حسن نے میرینہ کے بوڑھے باپ سے اس کا پتہ خوب اچھی طرح سمجھ لیا۔

میرینہ نے جلتے جلتے ایک اچٹتی نظر حسن پر ڈالی۔ اس میں بڑی التجائیں تھیں، گویا کہہ رہی ہو: "دیکھو آنا ضرور، بھول نا مت! میں تیرا انتظار کروں گی۔"

اب حسن کو قرار آچکا تھا۔ میرینہ سے ملتے رہنے اور اس سے ربط ضبط بڑھانے کی راہ کھل چکی تھی لیکن اب ایک نئی خلش احساس بن کر دل کو کچوکے لگا رہی تھی۔ مستقبل کے خدشات، میرینہ عیسائی تھی اور وہ خود مسلمان، اور وہ قرطبہ کی کو اپنے مذہب سے جنون کی حد تک محبت تھی۔

حسن تلاش کرتا ہوا جب میرینہ کے گھر پہنچا تو اس کا باپ گھر میں موجود نہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرینہ کی بجھی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے حسن کے استقبال میں والہانہ انداز اختیار کیا۔ اس کے دل میں میرینہ کا بہت ہلکا سا یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں یہ محبت یکطرفہ نہ ہو اور میرینہ کی خوش اخلاقی ایک بے یار و مددگار کے لئے جذبہ ہمدردی کے سوا کچھ نہ ہو لیکن استقبال کے والہانہ انداز نے اس کے اس شبہے کو تقریباً زائل کر دیا۔ وہ حسن کو لئے ہوئے ایک ایسے کمرے میں چلی گئی جس کی دیواروں پر چاروں طرف ہتھیار ہی ہتھیار لٹک رہے تھے۔ اشبیلیہ اور غرناطہ کی بہترین تلواریں، زرہیں، خنجر، ڈھالیں، تیر کمانیں اور دوسرے کئی ہتھیار دیواروں پر سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ میرینہ نے حسن کو ایک منقش کرسی پر بٹھایا۔ مسکراتی ہوئی بولی: "بہادر مور! تم تاجر ہو، ہو سکتا ہے کہ تمہیں آلات سپاہ گری سے آراستہ یہ کمرہ پسند نہ آئے لیکن میرے خاندان کے مردوں کے یہی آلات زیور ہیں!"

اس مرتبہ حسن نے میرینہ کے خیال خام کو جھٹلا دینے کی کوشش کی: "میرینہ! میں صرف تاجر ہی نہیں، سپاہی بھی ہوں۔ وقت آنے میں اپنی سپاہیانہ برتری بھی ثابت کر دوں گا!"

میرینہ کو شبہ گزرا کہ شاید مور کو اس کی بات ناگوار گزری ہے۔ معذرت کرنے لگی: "آئندہ میں اس قسم کی باتوں سے گریز کروں گی۔ بابا جان بازار گئے ہیں!"

اسی دن حسن کو یہ معلوم ہوا کہ میرینہ کے ساتھ اس کے باپ کے علاوہ ایک خادمہ بھی رہتی ہے۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور بڑا بھائی قسمت آزمائی کے لئے میکسیکو جا چکا ہے۔

میرینہ نے باپ کی عدم موجودگی میں اس کی پھلوں سے ضیافت کی۔ باپ کے واپس آجانے پر دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پوری گفتگو میں حسن نے یہ محسوس کیا کہ میرینہ کے باپ کو اپنے خاندان

کی شجاعت اور برتری کا بے حد احساس ہے اسے لئے عیسی ہونے پر بھی بڑا فخر تھا۔ اور وہ عیسی مذہب کو دنیا کا اعلیٰ ترین مذہب سمجھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ مذہب کے بارے میں یہی خیالات میرینہ کے بھی ہوں گے۔ اور اگر یہ صحیح تھا تو حسن کے لئے اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات دوسری نہ ہو سکتی تھی۔

جب وہ وہاں سے واپس آیا تو اس کی طبیعت پر بڑا بوجھ تھا اسے بڑا دکھ تھا کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی میرینہ کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ میرینہ جو عیسی تھی اور جس کے آباد اجداد کا منشا طلیطلہ کے مسلمانوں کو خارج البلد کرنے میں یقیناً ہاتھ رہا ہو گا۔ کئی بار یہ ارادہ کرنا چاہا کہ وہ میرینہ کے خیال کو اپنے دل سے نکال دے لیکن ارادے کے تصور ہی سے اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ دیر تک سجدے میں پڑا گڑگڑاتا رہا کہ "الٰہ العالمین! مجھے اس آزمائش سے نکال دے اور مجھے دین اسلام پر استقامت سے قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔"

جذباتی دباؤ اور احساس بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب اچھی طرح آنسو بہہ گئے تو طبیعت ذرا قابو میں آئی۔

کئی دن گزر گئے لیکن حسن میرینہ سے ملنے نہیں گیا۔ اس نے اپنا سامان تجارت اونے پونے فروخت کر دیا چوتھے دن ایک ادھیڑ عمر شخص سرائے میں اسے پوچھتا ہوا آیا۔ وہ میرینہ کا ایک خط لے کر آیا تھا حسن نے دھڑکتے دل اور مرتعش ہاتھوں سے میرینہ کا خط پڑھا۔

"مور بہادر! شام کو میری سالگرہ ہے میری خواہش ہے کہ اس میں تم بھی شرکت کرو۔ میرے بابا جان بھی تمہیں کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ میرے دوسرے اعزا بھی اس میں شرکت کریں گے۔ میں تمہیں ان سب سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔"

اس خط نے حسن کو بالکل بے بس کر دیا۔ اس نے میرینہ کو زبانی پیام بھیج دیا کہ "تو انتظار کر میں شام کو ضرور آؤں گا۔"

شام کو وہ میرینہ کے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم تھا میرینہ کا باپ آگے بڑھا اور اس نے حسن کا شایان شان استقبال کیا۔ رات کے کھانے سے پہلے حسن کا خاندان کے دوسرے بزرگوں سے تعارف کرایا گیا انہی میں کچھ ایسے مہمان بھی تھے جنہیں زبردستی عیسائی بنا لیا گیا تھا۔ حسن کو ان پر بڑا رحم آیا کہ افسوس یہ لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

کھانے کے بعد مہمان لڑکیوں نے رقص پیش کیا۔ میرینہ گہرے نیلے رنگ کا شلوکا پہنے سر پہ باریک سفید دوپٹہ ڈالے اس طرح بیٹھی تھی گویا آسمان سے پری اتر آئی ہے۔ جب لڑکیاں تھک گئیں

تو انہوں نے میرینہ کو مجبور کیا کہ اب وہ گانیوں کے خانہ بدوشوں کا رقص پیش کرے۔ میرینہ کو اس رقص میں کمال حاصل تھا پہلے تو وہ لجاتی شرماتی رہی لیکن بالآخر مجبور ہو گئی کیونکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں حسن کی ایما بھی حاضرین محفل کی فرمائش میں شامل ہو گئی تھی۔ میرینہ اٹھی۔ خنجری ہاتھ میں لی اور رقص شروع ہو گیا۔ خنجری کے زیروبم کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم نے تھرکنا شروع کر دیا اور بہت جلد اپنے رقص کو نقطۂ عروج کو پہنچا دیا۔ کبھی وہ خنجری کو بجاتی ہوئی اسے اپنی آنکھوں سے اوپر اس طرح لاتی، گویا دھوپ کی تمازت سے آنکھوں کو بچا کر جنگل میں اپنے محبوب کو تلاش کر رہی ہے۔ کبھی آگے کی طرف جھکی جھکی اس طرح چلتی جیسے اس کا محبوب درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہو اور وہ اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے کبھی تن کر واپس آجاتی گویا اپنے محبوب کو ناز نخرے دکھا رہی ہو۔ اس کی ذرا ذرا سی حرکت سے حاضرین محفل کے منہ سے داد و تحسین کی صدائیں نکل رہی تھیں حسن کا سینہ فخر سے تن گیا کہ یہ باکمال حسینہ اس سے محبت کرتی تھی۔

سب کے آخر میں جب تقریب کے خاتمے کا اعلان ہوا تو ایک گندمی رنگت کا عنابی اور گہرے سرخ رنگ میں ملبوس تقریباً ساٹھ سالہ بوڑھا تمکنت کے ساتھ میرینہ کے باپ کی طرف بڑھا۔ میرینہ اپنے باپ کے داہنی طرف بیٹھی کنکھیوں سے حسن کو دیکھ رہی تھی اور حسن اپنے مستقبل اور انجام کی فکروں میں ڈوبا سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

یکایک بوڑھے کی آواز گونجی "نواب سانتانی! تو جانتا ہے کہ میرا بیٹا دان جان تیرے بیٹے کے ساتھ میکسیکو گیا ہوا ہے دو ماہ قبل جب ایک جہاز وہاں سے آیا تھا تو اس کے ایک مسافر نے مجھے یہ پیغام دیا تھا کہ چند دنوں بعد دان جان واپس آرہا ہے اور اپنے ساتھ بے پناہ دولت بھی لا رہا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں باپ کی حیثیت سے میں تجھ سے میرینہ کا رشتہ مانگتا ہوں' یوں بھی میں میرینہ کا ماموں ہوں اور اس کا سب سے زیادہ مستحق دان جان ہی ٹھہر سکتا ہے!"

ابھی نواب سانتانی نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ میرینہ نے آزردگی سے کہا۔ "ماموں! میری شادی کے مسئلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی باداجان کو بولنا چاہیے۔ اپنے فیصلے سے میں خود مطلع کر دوں گی۔"

نواب سانتانی نے کہا۔ "بے شک اپنے معاملات میں تو آزاد ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دان جان تیرے ماموں کی اولاد ہونے کے سبب تیری ہمدردی کا مستحق ہے!"

حسن کو ایسا لگا جیسے اس گفتگو سے اس کے دل و دماغ مجروح ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے

معنی خیز اور استفہامیہ نظروں سے میریہ کو دیکھا۔ میریہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی کہ: "میں ابھی اپنی شادی کے مسئلے پر غور نہیں کرنا چاہتی۔ تم لوگ مجھے مجبور نہ کرو۔"

حسن نے بھی نواب سانتانی سے واپسی کی اجازت طلب کی اور بوجھل قدموں سے چلا آیا۔ میریہ کے ماموں نے اس افسردہ اور مضمحل ہو کر بھاری قدموں سے جاتے ہوئے دیکھا اور کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

پھر میریہ کے باپ سے کہا: "نواب سانتانی! میریہ میرے بیٹے ڈان جان کو کیوں ناپسند کرتی ہے۔ میں کسی حد تک اس راز سے واقف ہو گیا ہوں۔ تجھے اس تاجر مور سے ہوشیار ضرور رہنا چاہیے!"

نواب سانتانی مشتعل ہو گیا۔ "المیریہ کے بوڑھے! اب تو شرافت کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جا۔ میں میریہ کی مرضی کے خلاف اس کے مستقبل کا سودا نہیں کر سکتا۔"

حسن میریہ سے مل کر کچھ عہد و پیمان کرنا چاہتا تھا۔ وہ تنہائی میں اس سے ملنے کا متلاشی تھا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے بعد نواب سانتانی اور میریہ کے ماموں کے درمیان کیا بات ہوئی۔ دوسری طرف میریہ بھی پریشان تھی، یہ جلاوطن مور جو آناً فاناً اس کے دل و دماغ پر غیر شعوری طور پر چھا گیا تھا۔ معلوم نہیں کب تک غرناطہ میں رہے گا۔ حسن تاجر ہے جو ایک نہ ایک دن غرناطہ سے چلا جائے گا اس نے سوچا۔ اے کاش یہ غرناطہ ہی میں رہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کبھی وہ اپنے سخت گیر اور تند خو بڑے بھائی کا خیال کر کے لرز جاتی جو میکسیکو گیا ہوا تھا اور کسی دن بھی آ ٹپکنے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بڑا بھائی اس مور کو ہرگز پسند نہ کرے گا کیونکہ اسے اسلام اور موروں سے سخت نفرت ہے۔

ایک دن صبح صبح جب وہ صبح کی دعا کے بعد گرجا سے واپس آ رہی تھی، اس کی ملازمہ کتاب الدعا سنبھالے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ تو اس نے دو دو منزلہ مکانوں کے درمیان سے حسن کو نکلتے ہوئے دیکھا وہ سر جھکائے کچھ سوچتا چلا آ رہا تھا۔ میریہ کے قدم بھاری پڑنے لگے وہ حسن کو خود مخاطب نہیں کرنا چاہتی تھی اس کی دلی آرزو تھی کہ حسن خود ہی اسے دیکھ لے تو اچھا ہے جب وہ میریہ کے بالکل قریب آ گیا تو اس نے غیر ارادی طور پر سر اٹھایا اور میریہ کو دیکھ کر افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ میریہ کا ایک ایک عضو خوشی میں سرشار تھا۔

حسن نے کہا: "میریہ! اس وقت میں تیری ہی بابت سوچ رہا تھا!"

میریہ برابر چلتی رہی کہنے لگی: "میں خود بھی اب اکثر تمہاری ہی بابت سوچتی رہتی ہوں۔"

"میں تیرا شکر گزار ہوں!" حسن سراپا خوش بن گیا۔ "لیکن تو نے کبھی اس کے انجام پر بھی غور کیا؟"
میرینہ اداس ہو گئی۔ "مجھے اپنے آگے تاریکی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ اپنا انجام کیا ہو گا؟"
"تب پھر ایسا کر!" حسن کہنے لگا۔ "میں نے ابھی تک قصر الحمرا نہیں دیکھا۔ میں اپنے بزرگوں کی اس نادرہ کار اور یگانۂ روزگار عمارت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں تو میری راہ نمائی کا فرض خوب اچھی طرح انجام دے سکے گی۔"
"ہاں!" میرینہ بولی۔ "میں اس کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ میں نے اس طلسمی عمارت کو اتنی بار دیکھا ہے کہ اب میں خود اس عمارت کے راہ نما کے فرائض انجام دے سکتی ہوں۔"
"آج دوپہر بعد!" حسن نے کہا۔ "ظہر کی نماز کے بعد تو میرے ساتھ چل، میں پُراسرار الحمرا کے ستونوں کے درمیان اپنی قسمت کا آخری فیصلہ کر دوں گا!"
میرینہ کسی موہوم سی امید پر خوش ہو گئی۔ "کیا تو نے اپنے دین کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"
"نہیں کبھی نہیں۔" حسن نے کہا۔ "اسلام تو میری رگ رگ میں موجود ہے، ہاں اگر تو چاہے تو دینِ مسیحی ترک کر کے اسلام کی آغوش میں پناہ لے سکتی ہے!"
اس کے بعد حسن نے میرینہ کے لیے دعا کی۔ "یا رسول اللہ! اس نصرانیہ کی ہدایت فرمایئے۔"
میرینہ نے تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ "چپ رہ۔ میرے حق میں کفر اختیار کرنے کی دعائیں مت مانگو۔ میں بےشک تجھے چاہتی ہوں لیکن یہ بھی یاد رکھ کہ تیرے لیے میں مسیح کو نہیں چھوڑ سکتی۔"
ملازمہ ان کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔ میرینہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ ہم دونوں کے راز اس پر بھی عیاں ہو گئے ہیں، میں چاہتی تو اس وقت تجھ سے بے رخی اختیار کر کے چپ چاپ آگے بڑھ جاتی لیکن مجھے دورنگی نہیں آتی جو کچھ میرے دل میں ہے وہی زبان پر۔"
حسن کچھ شرمسار ہو گیا اس نے پوچھا۔ "کیا دوپہر بعد تو مجھے اپنے ہمراہ الحمرا لے چلے گی؟"
میرینہ نے اندرونی سوز کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "گھر پر میں تیرا انتظار کروں گی۔ میں الحمرا چوروں کی طرح نہیں جانا چاہتی، بابا جان کو بتلا کر ان کے علم میں تجھے لے کر جاؤں گی۔"
باتیں کرتے کرتے ایک موڑ پر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔
دونوں نے درمیانی وقفہ بڑے کرب اور انتظار کی شدت میں گزارا۔ دونوں ہی گفتگو کے دوران اٹھائے جانے والے مسائل، ان کے حل، مفاہمت کی تجاویز اور ناقابل قبول ہونے کی صورت میں متبادل

تجویزوں پر غور کرتے رہے لیکن الپشرات پر دونوں ہی اہل تھے "اسلام ترک نہیں کیا جائے گا۔ دین مسیح ہر قیمت پر محفوظ رکھا جائے گا" اور دونوں ہی سادہ لوح اس سادہ سی حقیقت کو نظرانداز کر گئے تھے کہ دو متوازی لکیریں کبھی نہیں ملتیں، وہ کتنی ہی قریب قریب کیوں نہ ہوں۔ ملنے کے لئے کسی ایک کا دوسری کی طرف ذرا سا جھکاؤ ضروری ہے۔

ظہر کے بعد حسن میرینہ کے گھر پہنچ گیا۔ دو گھوڑے پہلے سے تیار تھے۔ میرینہ حسن کے ساتھ سیرا نوادا کی برف پوش چوٹیوں کی طرف چل پڑی کیونکہ اس کے نیچے ہی قصر الحمرا تھا۔ جب وہ دونوں آبادی سے گزر کر ذرا آگے بڑھے تو انہیں اپنے آس پاس گھنیرے درختوں کی قطاریں نظر آئیں جن پر انواع و اقسام کے پرندے خوش الحانیوں میں مشغول تھے۔ ان درختوں کے نیچے، دونوں طرف پانی کے چشمے بہہ رہے تھے۔ راہ گیر ان دونوں کو دیکھتے اور سوچ سوچ کر خوش ہوتے کہ "یہ مسیحی حسینہ اس سادہ لوح مور کو ضرور عیسائی بنا لے گی!"

دونوں الپرکہ سے داخل ہو کر جب الحمرا کے قصر اللیوث میں داخل ہوئے تو حسن کے دل کی حیرت اور حسرت سے عجیب حالت ہو گئی۔ ہر طرف ستونوں کا ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ محراب دار غلام گردشیں، ان پر نازک، باریک اور خوبصورت ترین گلکاریاں، ستون کہیں علیحدہ علیحدہ تھے۔ کہیں دو دو اور کہیں مختلف ترکیبوں سے اس کی جالیاں اور ان پر نازک ترین آرائشی کام ایسا تھا جس نے تھوڑی دیر کیلئے میرینہ کے خیال کو بھلا دیا۔ میرینہ اسے ایک ایک چیز کی بابت کچھ نہ کچھ بتاتی چل رہی تھی لیکن حسن تو اسے دیکھنے میں محو تھا۔ وہ الحمرا کے حسن میں کھو گیا تھا اور اسے کچھ پتا نہ تھا کہ میرینہ کیا کہہ رہی ہے۔ یہاں تک کہ میرینہ نے اسے ایک ایسی دیوار کے سامنے جا کر کھڑا کر دیا جس پر ایک سو باون وضع کے لیے بیل بوٹے بنائے گئے تھے جو رنگ و روغن اور بناوٹ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ یہاں سے بیت الاختین ہوتے ہوئے بیت العدل میں داخل ہو گئے۔ بیت العدل کے بعد میرینہ اسے ایوان ابن سراج میں لے گئی۔ حسن ایوان کی ایک ایک چیز حسرت و یاس سے دیکھتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا۔ میرینہ سمجھ گئی کہ غریب الدیار مور اپنے بزرگوں کی ان یادگاروں کا دل ہی دل میں ماتم کر رہا ہے۔ وہ یہاں سے گزر کر شیروں والے حوض پر پہنچے، حوض کے چاروں طرف شیر بنے ہوئے تھے۔ میرینہ نے حوض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حسن! یہی وہ جگہ ہے جہاں چھتیس بنو سراج قتل کئے گئے تھے۔ خون کے دھبے آج تک موجود ہیں!"

حسن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے آس پاس اس کے بزرگوں کی روحیں موجود ہیں اور اسے دیکھ رہی ہیں۔

میرینہ حوض کے کنارے بیٹھ گئی اور کہا "اب ہمیں وہ باتیں کر لینی چاہئیں جن کے لیے ہم یہاں آئے ہیں!"

حسن نے نہایت محبت سے میرینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی آنکھوں سے ملنے لگا پھر اسے اپنے رخساروں پر پھرایا اور آخر میں بوسہ دے کر میرینہ کی صورت دیکھنے لگا۔

میرینہ نے کہا "یہ ہاتھ اگر تم چاہو تو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھ میں رکھ سکتے ہو"

"لیکن تو نے اس کی جو قیمت مقرر کی ہے اس کی ادائیگی میرے بس کی بات نہیں ہے!" حسن نے افسردگی سے جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "میرینہ! اگر تو ٹھنڈے دل سے غور کرے اور دونوں مذاہب کا موازنہ کرے تو دین اسلام کی سچائی اور عظمت تجھ پر ضرور منکشف ہو جائے گی!"

میرینہ نے ایسی درشتی سے جس میں اپنی بے بسی اور مجبوری کا جذبہ بھی شامل تھا جواب دیا "میں تیرے ساتھ یہاں اس لیے نہیں آئی ہوں کہ تو میرے سامنے دین مسیح کی برائی کرے اور اس پر اسلام کی برتری ثابت کرے"

"اچھا میرینہ کر!" حسن کہنے لگا "میں تجھے یہ عہد دیتا ہوں کہ میں اپنے دل میں تیرے سوا کسی اور لڑکی کو جگہ نہ دوں گا اور تو بھی مجھ سے یہ عہد کر کہ تو میرے سوا اس وقت تک کسی اور مرد کو اپنے دل میں جگہ نہ دے گی جب تک کہ ہم دونوں کافی غور و فکر کے بعد کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ جائیں!"

میرینہ نے جل کر جواب دیا "یہ تو تو خود سے عہد کر کیونکہ تو مسلمان ہے جن کی زندگی میں بیک وقت چار چار عورتیں داخل ہو سکتی ہیں۔ میں مسیحی بھی ہوں اور عورت بھی، میں کسی عہد کے بغیر ہی تجھے یقین دلاتی ہوں کہ میری امیدوں کا پہلا اور آخری مرکز تو ہے اور تو ہی رہے گا!"

حسن پر میرینہ کی بات کا اتنا شدید اثر ہوا کہ اس کے پائے ثبات میں ہلکی سی لرزش آ گئی اس نے سوچا کہ اگر میرینہ کے لیے دین مسیح اختیار کرنا پڑے تو کوئی حرج کی بات نہیں؟ لیکن اسی لمحے اسے ایسا لگا جیسے حوض کے اندر سے مقتول بنو سراج کی روحیں نکل نکل کر اس پر لعن طعن کر رہی ہیں۔ اس نے کہا "میرینہ! لمحوں میں فیصلے ہو سکتے ہیں اور ثانیوں میں انہیں بدلا جا سکتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے تیری طعن آمیز اور پر سوز باتوں کے زیر اثر یہ سوچا تھا کہ میں تیرے اور صرف تیرے لیے اسلام کو ترک اور دین مسیح کو اختیار کر لوں گا"

میرینہ کا چہرہ مارے خوشی کے گلنار ہو گیا۔ شگفتگی آ گئی "تب پھر تو مجھے آسانی سے حاصل کر سکتا ہے!"

"لیکن" حسن نے بات پوری کی "اسی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مقتول بنو سراج کی روحیں

حوصلے سے نکل نکل کر مجھ پر لعن طعن کر رہی ہیں۔" پھر سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔" اور میں مجبور ہوں کہ اسلام ترک نہیں کر سکتا۔"

میرینہ نے شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں اور فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔" تب پھر تم طرابلس واپس جاؤ۔ افریقیہ کے صحراؤں اور ریگزاروں میں گھوم پھر کر کسی منصفانہ فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ تمہارا یہ فیصلہ جذباتی اور عاجلانہ ہے۔"

حسن نے جواب دیا۔" میرینہ! تو یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ انسان کا اپنے مذہب سے ہمیشہ ہی جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ تو بھی تو انہی میں سے ہے جو اپنے مذہب سے والہانہ عشق اور شیفتگی رکھتے ہیں۔"

پھر دونوں نے اس اذیت ناک موضوع پر گفتگو بند کر دی اور المیہ مستقبل کو سوچے بغیر الحمراء کے ایوانوں اور غلام گردشوں میں گھومتے پھرتے رہے کبھی کسی لمحے جب مایوسی کی چمک اور احساس ناکامی کی کسک ان کے دلوں پر چوٹ لگاتی تو وہ فوراً ہی اس بچے کی طرح جو اندھیرے سے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر کے خوف سے نجات حاصل کرتا ہے اپنے دل و دماغ کے دریچے بند کر کے فکر اور تشویش سے نجات حاصل کر لیتے۔

اسی طرح چار ماہ گزر گئے، دونوں ملتے، پیار محبت کی باتیں کرتے اور بات یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی میرینہ کہتی۔" دینِ مسیح اختیار کرو اور مجھے حاصل کر لو۔"

حسن کہتا۔" اگر تو اسلام قبول کر لے تو میں تیرا بندۂ بے دام ہوں۔"

پھر ایک دن حسن نے میرینہ کو یہ بُری خبر سنا دی۔" میرینہ! میں طرابلس واپس جا رہا ہوں۔"

میرینہ پریشان ہو گئی۔" پھر واپس آؤ گے؟"

"ہاں!" حسن نے جواب دیا۔" لیکن میری واپسی سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

میرینہ گم صُم لہجے میں بولی۔" تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی ایسی ملاقات سے فائدہ' جس میں ہمیشہ اسلام کی خلیج حائل رہے!"

"اسلام کی نہیں مسیحیت کی کہو!" حسن نے دکھ سے کہا۔" اگر تو عیسائی نہ ہوتی تو میری ہوتی۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گی!" میرینہ کہنے لگی۔" تم چاہے دو سال بعد آؤ' لیکن آنا ضرور۔ ممکن ہے اس درمیان مفارقت کی آگ تمہاری مذہبی استقامت کو جلا کر خاکستر کر دے اور تم وہ نہ رہو جو اس وقت ہو!"

حسن نے جواب دیا۔" میں تیری خواہش کا احترام کرتا ہوں' میں ایک بار پھر آؤں گا لیکن تو اس

خیالِ خام کو اپنے دل سے نکال دے کہ میں اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی اسلام کو ترک اور دینِ مسیح اختیار کروں گا۔" پھر نا اُمیدی سے کہنے لگا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جب میں دوبارہ واپس آؤں تو تو اپنے ماموں کے بیٹے دان جان پر ملتفت ہو چکی ہو!"

میرینہ تڑپ گئی۔ "مور! تم خواہ مخواہ حسد کی آگ میں مت جلو۔ جب میں تم سے یہ کہہ چکی ہوں کہ میری زندگی میں میری امیدوں اور تمناؤں کے پہلے اور آخری مرکز تم ہو تو تمہیں مجھ سے اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ مجھ کو جلاؤ مت!"

حسن نے چند ثانیوں تک ٹکٹکی لگائے میرینہ کو دیکھا۔ انتہائے یاس اور جدائی کے صدمے نے اس کے چہرے کی شگفتگی کو پھیکا کر دیا تھا۔ اسے بڑا رحم آیا۔ کہنے لگا۔ "اچھا یہ بتا کہ جب میں دوبارہ تجھ سے ملنے آؤں تو تحفے میں تیرے لیے کیا لیتا آؤں؟"

میرینہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، آنکھوں کے گوشوں سے آنسوؤں کو اپنی انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔ اور مغموم آواز میں بولی۔ "تحفے لوگ اپنی مرضی سے لاتے ہیں، جو جی میں آئے لے آنا!"

حسن نے میرینہ کے غم و اندوہ کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ برقرار رہا۔ وہ اسے اس طرح مغموم چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن مجبوراً جانا پڑا۔

نواب سانتانی اپنی بیٹی کے قلبی معاملات سے آگاہ ہو چکا تھا وہ چاہتا تو اس مور کی آمد و رفت کو حکماً بند کر دیتا لیکن اسے میرینہ سے محبت تھی۔ وہ اس پر جبر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب اسے یہ اطلاع ملی کہ میرینہ حسن کے ساتھ گھنٹوں والہانہ وارفتگی کے ساتھ الحمرا کے محلات میں گھومتی رہی ہے اور پھر اس نے حسن کو افسردہ اور مغموم میرینہ کے پاس سے جاتے دیکھا تو ہمت کر کے بیٹی سے بات کر ہی ڈالی، اس نے کہا۔ "میرینہ! میں تیرے ذاتی معاملات میں دخل تو نہیں دینا چاہتا تھا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے اس جلاوطن مور سے تعلقات تشویشناک حد تک بڑھ چکے ہیں!"

میرینہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ بولی۔ "بابا جان! میں نے اس مور سے کہہ دیا ہے کہ میں ایک دشمنِ مسیح کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ہرگز نہ دوں گی۔"

نواب سانتانی نے بات کاٹ دی۔ "لیکن ایک بات اور ہے وہ یہ کہ مور تاجر ہے اور میں تاجر کو سپاہی سے کمتر درجے کا تصور کرتا ہوں۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ حسن بہادر بھی ہے!" میرینہ کہنے لگی۔ "اس کی بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز سپاہیانہ ہے۔ اس میں سپاہیوں جیسی قوتِ فیصلہ اور شجیع النادون جیسا طرزِ تکلم ہے!"

نواب سانتافی بیٹی سے ہار گیا۔ "دیکھوں گا" اگر تیری باتیں درست نکلیں اور اس نے تیری خاطر اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ دیا تو تیرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دینے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔"

حسن غرناطہ سے المیریہ پہنچا اور ایک تجارتی جہاز جس پر کچھ مسافر بھی تھے اسے لے کر جھاگ اڑاتا ہوا طرابلس کی طرف روانہ ہوگیا۔ جہاز کے عرشے سے اگر حسن کو معلوم ہوتا اور وہ چاہتا تو دیکھتا۔ المیریہ کی پہاڑی سے میرینہ اس کے جہاز کی روانگی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ میرینہ اس کے پیچھے پیچھے المیریہ تک آئی۔ اور دل پر ضبط کی سل رکھ کر الوداعی منظر دیکھتی رہی۔

جب وہ طرابلس واپس پہنچا تو اس کی ماں فالج کا شکار ہو چکی تھی۔ حسن کئی ماہ مسلسل اپنی ماں کے علاج میں مشغول رہا لیکن مرض کے دوسرے حملے نے اس کی جان لے لی۔ اور حسن رو دھو کر اپنی قسمت پر شاکر ہو رہا۔ ان الجھنوں میں اس کا ایک سال نکل گیا۔ میرینہ اسے برابر یاد آتی رہی لیکن اب وہ مایوس ہو چلا تھا۔ اس نے سوچا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر بڑے بڑے وعدے کئے جا سکتے ہیں لیکن کیا واقعی اس ہسپانوی لڑکی میرینہ کے دل میں جلا وطن اور غریب الدیار مور کی یاد اب بھی موجود ہوگی! اسے یقین نہ آیا۔

جب وہ چاروں طرف سے فارغ ہوگیا تو طرابلس کے ساحل پر اس جہاز کا انتظار کرنے لگا جو اسے سمندر کے سینے اور سرکش موجوں کو چیرتا ہوا المیریا کے ساحل تک پہنچا دے۔ ایک دن اسے یہ جہاز مل گیا۔ وہ اس پر سوار ہو کر المیریا روانہ ہوگیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے خوبصورت خرگوشوں کا ایک جوڑا میرینہ کو تحفے میں دینے کے لئے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

المیریا کے ساحل پر وہ دھڑکتے ہوئے دل سے کود کر اترا اور بحری محکمے کی انتظامیہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں اپنے کاغذات دکھائے اور واپس آ کر اپنا سامان لے کر کرائے کے خچر پر اسے بار کیا اور سوتا جاگتا سرائے کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسے ایک بڑی بی نے ایک خط دیا۔ یہ بڑی بی راہ میں پہلے ہی سے منتظر کھڑی تھیں اس نے ایک نظر بڑی بی پر ڈالی اور خط پڑھنے لگا۔ یہ میرینہ کا تھا جس میں لکھا تھا:۔

"بہادر مور! میں حیران صقلبی کی پہاڑی سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ میرا بھائی میکسیکو سے آچکا ہے۔ اس نے تمہیں بالکل ناپسند کر دیا ہے۔ وہ میرا رشتہ دان جان سے کرنا چاہتا ہے میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ تم غرناطہ میں مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں موقع محل دیکھ کر خود ہی تمہیں بلالوں گی۔"

میرینہ کی بدخطی اور حرفوں میں پائی جانے والی غیر آہنگی سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بہت عجلت

میں لکھا گیا ہے اس نے شکستہ دلی سے ایک رات المیریا میں گزاری اور دوسرے دن علی الصباح عرناطہ روانہ ہو گیا۔ وہ کئی دن تک سرائے سے باہر نہ نکلا۔ اسے میرینہ کے دوسرے پیغام کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ یہ سوچ کر باہر نکلا کہ وہ میرینہ کے گھر کے سوا کہیں اور تو جا ہی سکتا ہے، وہ بلا مقصد ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ مسجد الکبیر کے سامنے پہنچا تو اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ یہ وہی مسجد تھی جسے مسلمانوں کے اخراج کے بعد عیسائیوں نے گرجا میں بدل دیا تھا۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں گمشدہ اور لاپتہ میرینہ اتفاقیہ مل گئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے مسجد میں داخل ہو گیا۔ جب وہ قربان گاہ مسیح کے قریب پہنچا تو اس نے ایک شخص کو سر بسجود دیکھا اس کی کمر سے گہرے سرخ رنگ کا پٹکا لٹک رہا تھا۔ حسن کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر چپ چاپ واپس آ گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو مسجد کے دوسرے دروازے سے میرینہ کو نکلتے دیکھا اس کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ میرینہ اسے دیکھ کر گڑا سی گئی۔ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے مسجد کے منبر کے اس پار لے گئی۔ یہ موروں کا قبرستان تھا۔

ایک تناور درخت کی آڑ میں خود بھی بیٹھی اور اسے بھی بٹھا دیا۔ اپنی قلبی خوشی کو چھپاتی ہوئی بولی "کہو کیا فیصلہ کیا؟ میں تیرا فیصلہ سننا چاہتی ہوں!"

حسن میں جواب کا یارا نہ تھا۔ خجالت سے جواب دیا "وہی فیصلہ جو ایک سال پہلے تھا۔ اب بھی اسی پر قائم ہوں!"

میرینہ روہانسی ہو گئی "تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں۔ جانتے ہو کہ اس وقت جہاں تم کھڑے ہو کیا کہلاتی ہے؟"

حسن نے نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ میرینہ کہنے لگی "یہ قبرستان ہے۔ اور تم یقین کرو کہ یہ مجھے بڑی تیزی سے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ مور! یا تو تمہیں میرے دل میں اپنی چاہت کی آگ نہیں لگانی تھی اور اگر لگائی تھی تو اس کے بجھانے کی تدبیر بھی کرتے!"

"میرینہ!" حسن کہنے لگا "میں صرف تیری خواہش پر آیا ہوں ورنہ تجھے اچھی طرح یاد ہو گا۔ میں تجھ سے یہ کہتا گیا تھا کہ اسلام میری رگ و پے میں جاری ہے اور اسے میں کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میرا بھائی مجھ سے نفرت کرتا ہے!" میرینہ بولی "صرف تیری وجہ سے۔ اسے ہم دونوں کی ایک ایک بات معلوم ہو گئی ہے۔ وہ ایک مور اور وہ بھی تاجر کو اپنے میرا رشتہ نہیں کر سکتا۔ میں پریشان ہوں کہ تجھے اپنے گھر میں کس طرح بلاؤں۔ مور! تو نے میرے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"میرینہ! یہ تیری بڑی زیادتی ہے" حسن کہنے لگا "ساری ہی باتوں کا تو تنہا مجھے ذمہ دار قرار دے

رہی ہے۔ اگر تو کہے تو میں سارے عہد و پیمان تجھے واپس کر سکتا ہوں۔"

میر ینہ یہ بھی نہ چاہتی تھی۔ "میں یہ نہیں چاہتی۔ عہد و پیمان اپنی جگہ ہیں اور وہیں رہیں گے لیکن تجھے اس الجھن کو دُور کرنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے!"

"تب پھر اسلام قبول کر لے" حسن نے کہا۔ "ہم دونوں کی ساری الجھن دُور ہو جائے گی۔"

"میں یہ نہیں کر سکتی!" میر ینہ کا طوفان جیسے ٹھہر گیا۔ "ابھی جب تو گرجے کے اندر تھا تو کیا تو نے کسی شخص کو قربان گاہ مسیح کے سامنے گریہ وزاری کرتے دیکھا ہے؟"

"ہاں!" حسن بولا۔ "وہ سرخ چغے والا سپاہی؟ یہ کون ہے؟"

"نعمان جان!" میر ینہ کہنے لگی۔ "وہ بہت کوشاں ہے کہ میں اسے پسند کروں لیکن میں تجھ سے جو پیمان باندھ چکی ہوں، زندگی کی آخری سانسوں تک اس پر قائم رہوں گی۔"

حسن کے شکی دل کو پھر تشویش ہوئی۔ کہیں میر ینہ دان جان سے ملاقات کرنے تو نہیں آئی تھی۔ اور حسن کو دیکھ کر بغیر ملے ہی واپس آ گئی ہو۔ اس نے زہر خند کرتے ہوئے کہا "اچھا تو اس وقت تو اسی سے [illegible] آئی تھی!!"

"مور!" وہ تلملا گئی۔ "تم بہت شکی ہو۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھے دو رنگی نہیں آتی۔ اگر میرے دل میں تمہاری محبت نہ ہوتی تو پہلے ہی کہہ دیتی کہ میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میں تو تمہاری وجہ سے زمانے بھر کی دشمنی مول لے رہی ہوں اور تم ایسی باتیں کرتے ہو۔"

حسن نے پوچھا۔ "تیرا بھائی آخر کہتا کیا ہے؟"

میر ینہ نے جواب دیا۔ "کہتا ہے کہ ایک تاجر مور کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ نہ دوں گا۔ ہاں اگر مور با ہمی مقابلے میں اسے شکست دے دے تو البتہ تیری درخواست پر غور کیا جا سکتا ہے!"

"میں تیار ہوں!" حسن نے بلا تامل کہا۔ "اپنے بھائی سے جا کر کہہ دے کہ غریب الوطن مور تجھ سے مقابلے کے لئے تیار ہے!"

"فضول باتیں مت کرو!" میر ینہ بولی۔ "تم نہیں جانتے کہ میرے بھائی نے یہ شرط کیوں رکھی ہے!"

"کیوں رکھی ہے کچھ تو ہی بتا!" حسن نے کہا۔

میر ینہ نے جواب دیا۔ "صرف اس لئے کہ وہ فن سپاہ گری میں طاق ہے ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں تم بالکل نو آموز اور بچے ہو وہ چند لمحوں ہی میں تمہیں قتل کر دے گا۔"

"یہ تیرا خیال ہے!" حسن نے کہا۔ "میر ینہ! میں آج تیری اور تیرے گھر والوں کی یہ غلط فہمی دُور

کر دینا چاہتا ہوں کہ میں محض تاجر نہیں ہوں مجھے حالات اور وقت نے تاجر بنا دیا ہے ورنہ میری اصل شجاعت اور شہامت ہے۔ جس طرح میں مسلمان ہوں اسی طرح میں ایک سپاہی بھی ہوں!"

"پھر بھی تم میرے بھائی سے مقابلہ نہ کرنا۔ مجھے ڈر لگتا ہے!"

"تیری مرضی!" اس نے کہا۔ "اگر تیرا بھائی اس شرط پر لڑنا گوارا کرے کہ اگر میں اسے زیر کر لوں تو وہ تیرا رشتہ مجھ سے کر دے گا اور اگر وہ مجھے قتل کر دے تو اس طرح وہ اپنے ایک بدترین دشمن سے نجات حاصل کر لے گا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی عمدہ اور شریفانہ شرط ہے جو تجھے بھی پسند آنی چاہیے!"

میرینہ نے کہا۔ "اچھا اس وقت تو تم مجھے گھر جانے دو۔ میں سوچوں گی!"

وہ میرینہ کو مسجد کی دیواروں تک چھوڑنے آیا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ خود بھی اپنی سرائے روانہ ہو گیا۔

اس دن پوری فضا کہر میں ڈوب گئی تھی۔ موسم بہت اداس تھا۔ صبح کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ دو گھوڑے سرائے کے پھاٹک پر آ کر رکے۔ ان کے سوار نہایت وجیہہ نوجوان تھے۔ گھوڑوں کی باگیں سرائے کے سائیس کو تھما دیں اور خود حسن کا پتا پوچھتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ حسن انہیں دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اپنی خداداد ذہانت سے حسن نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ پیشوائی کے انداز میں آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "نواب سانتافی کے بیٹے! خوش آمدید!" پھر اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "اور تو؟ غالباً تو دان جان ہے!"

سانتافی کا بیٹا حسن کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا۔ "تو واقعی ذہین اور دلکش ہے۔ میرینہ تیری یونہی رطب اللسان نہیں ہے!"

"ہسپانوی بہادرو!" حسن خوش اخلاقی سے مسکراتا ہوا بولا۔ "میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ کیا تم پھلوں کا رس پینا پسند کرو گے؟"

"نہیں!" میرینہ کا بھائی کراہت سے بولا۔ "ہم دونوں میرینہ کی لاعلمی میں یہاں آئے ہیں۔ میں تجھ سے کھڑے کھڑے چند باتیں کروں گا۔ اس کے بعد تیرے مستقبل کا فیصلہ تیری اپنی قوت فیصلہ کے مطابق ہو گا!"

"دوستو!" حسن اب بھی ان کا احترام کر رہا تھا۔ "مہمان نوازی میرا دینی فرض اور اسوۂ رسولؐ ہے تم دونوں مجھے اس ثواب سے محروم نہ کرو!"

میرینہ کے بھائی نے اسی اکڑ سے کہا: "مجھے تیری شرط منظور ہے۔ میں تجھ سے مقابلہ کرنے آیا ہوں۔ اگر تو مجھے زیر کرے گا تو میرینہ تیری ہو جائے گی اور اگر میں تجھے قتل کر سکا تو میرینہ کا ہاتھ دان جان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

دان جان آگے بڑھا اور مردانہ شان سے بولا: "مجھے یہ شرط منظور نہیں، میں میرینہ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر میرینہ خود یہ کہہ دے کہ اس مور کو شکست دے دینے کے بعد وہ میری ہو جائے گی تو میں خود اس بہادر کو زیر کرنے کی کوشش کروں گا!"

حسن نے دیوار پر آویزاں اپنی دمشقی تلوار پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور جواب دیا: "میں تم دونوں سے لڑنے کو تیار ہوں!"

میرینہ کے بھائی نے اپنی روایتی متکبرانہ شان سے کہا: "لیکن تجھ سے مقابلہ کرنے میں ایک قباحت آڑے آ رہی ہے؟"

"اسے بیان کر!" حسن نے کہا: "ممکن ہے میں اسے دور کر دوں!"

"تو تاجر ہے!" میرینہ کا بھائی بولا: "تاجر سے مقابلہ کرتے ہوئے میں شرم سی محسوس کرتا ہوں"

اسی لمحے وہاں نواب سانتانی اور میرینہ داخل ہوئے۔ نواب ماحول کی کشاکش سے سمجھ گیا کہ یہاں کس قسم کی باتیں ہو چکی ہیں۔ اس نے حسن کو مخاطب کیا: "بہادر مور! تم میرے ساتھ میرے گھر چلو!" اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے اور دان جان سے بھی اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اور تم دونوں بھی"

حسن نے اپنے مخصوص کپڑے پہنے وہ کپڑے جنہیں پہن کر میدان جنگ کا رخ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی دمشقی ساخت کی تلوار لی، اور تیار ہو کر نواب سانتانی کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

یہ سب خاموشی سے باہر نکلے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر نواب سانتانی کے گھر پہنچ گئے۔ میرینہ دیر تک ان سب کو سمجھاتی رہی کہ کسی طرح یہ مقابلہ ٹل جائے لیکن اب حسن مقابلے پر بضد تھا۔ یہ لوگ اسی کمرے میں بیٹھے تھے جہاں دیواروں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے، جب نواب سانتانی اور میرینہ نے بہت زیادہ امن و آشتی پر قائم رہنے پر زور دیا تو حسن مشتعل ہو گیا۔ اس نے تمتمائے چہرے سے کہا: "نواب سانتانی؛ عزت یا موت! یہی ہمارے خاندان کا نعرہ ہے اور اپنے باپ کی طرح میں بھی اس کی عظمت برقرار رکھوں گا!"

نواب سانتانی چونک پڑا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی زہریلے کیڑے نے ڈنک مار دیا ہو: "کیا تو بنو سراج سے تعلق رکھتا ہے؟"

"ہاں!" حسن نے جواب دیا۔ "میں آج مجبوراً تم سب کی غلط فہمیاں دور کر دینا چاہتا ہوں' میں تاجر نہیں ہوں' سپاہی ہوں اور حکمرانانِ غرناطہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

نواب سانتانی نے سوال کیا۔ "تیرے باپ کا کیا نام تھا؟"

"موسیٰ!" حسن نے جواب دیا۔

نواب سانتانی اپنے ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ "یہ وہی موسیٰ تو نہیں ہے جو فرڈی نینڈ کی پچاس ہزار فوج کے مقابلے میں تنہا پہنچ گیا تھا اور مبارزت طلبی میں کئی بہادروں کو ہلاک کرنے کے بعد دریائے شنیل کی تہہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا تھا!"

حسن نے فخریہ کہا۔ "ہاں وہ میرا باپ تھا!"

نواب سانتانی نے افسوس اور ندامت سے اپنی گردن جھکا لی اور دیر تک سوچتا رہا۔ میرینہ خوش تھی کہ اس کے مسیح نے اس کی لاج رکھ لی تھی اور اس نے ایک بہادر اور شاہی خاندان کے فرد سے محبت کی تھی۔ میرینہ کا بھائی رشک وحسد سے اس کی باتیں سنتا رہا تھا اور دل ہی دل پریشان تھا کہ یہ مور نوجوان خاندانی فخر و وقار میں اس سے بلند اور برتر ہے!

کچھ دیر بعد نواب سانتانی نے اپنی گردن اٹھائی اور حزنیہ لہجے میں بولا۔ "بہادر مور! تو بہت قسمت ہے اور معلوم نہیں ابھی تجھے کتنے غم اور سہنے ہیں!"

اس کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کی ایک دیوار کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "معزز مور! ادھر آ میرے پیچھے!"

حسن اس کے پیچھے اس دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ نواب سانتانی نے ایک مٹی مٹی نسخی عبارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھنا تو یہ کیا لکھا ہے؟"

حسن نے انتہائی غور سے دیکھنے کے بعد پڑھا۔ "عزت یا موت!"

حسن کا سر چکرا گیا' یہ یہاں کیوں لکھا گیا' اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ نواب سانتانی کہنے لگا۔ "جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ تیری قسمت میں ابھی معلوم نہیں کس کس بات کا ماتم لکھا ہے' بہرحال میں یہ حیرت انگیز انکشاف کرتا ہوں کہ اس وقت تو جس مکان میں کھڑا ہے تیرا آبائی مکان ہے!"

حسن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم سے جان نکل رہی ہے۔ سارا جسم ایک کربناک سنسناہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہیں میرا دادا بھی تو ہلاک کیا گیا تھا اور لے تم لوگوں نے اس لئے مار دیا تھا کہ وہ اپنے آبائی وطن اور مکان کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا!"

"ہاں!" نواب سانتافی نے جواب دیا۔ "اسے میں نے ہی ہلاک کیا تھا۔ اس کے بعد میری سپاہیانہ خدمات کے صلے میں ملکہ ازابیلا نے یہ مکان اور کچھ جاگیر مجھے بطور انعام بخش دی تھی۔"

اب حسن گویا وہاں بالکل تنہا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس دشمنوں کی صف محسوس کی۔ اس نے حسرت سے میرینہ کی طرف دیکھا۔ "اب تو کیا کہتی ہے؟"

میرینہ نے صلح آمیز تجویز پیش کی۔ "بھائیوں کی طرح مل جل کر رہو اور خاندانی رنجشیں فراموش کر دو۔"

"یہ تو کہتی ہے!" حسن ترش روئی سے بولا۔ "میں نے تیری تجویز سن لی۔ اب تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ میں جب طرابلس سے چلا تھا تو بظاہر تو میں تاجر تھا لیکن دل میں یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ غرناطہ میں اپنے دشمنوں کو تلاش کر کے ان سے انتقام لوں گا۔ لیکن للیریہ کی پہاڑی پر لیموؤں کے جھنڈ میں تجھ سے ملاقات ہو گئی اور میں پہلی بار اس لذت سے واقف ہوا جسے عشق کہتے ہیں، پھر جب تو غائب ہو گئی تو میں غرناطہ چلا آیا۔ یہاں پھر تجھ سے ملاقات ہو گئی۔ تیری ملاقاتیں، قربتیں اور باہمی چاہتیں میرے اصل ارادے کو چاٹ گئیں اور میں اپنی زندگی کا اصل مقصد بالکل بھول گیا۔" یہ کہتے کہتے اس کی گردن جھک گئی، وہ روتا رہا۔ پھر بھرائی آواز میں بولا۔ "بہادر رو! یہ سچ ہے کہ مردوں کو رونا نہیں چاہیے لیکن جس پر میری جیسی اُفتاد پڑی ہو وہ رونے پر مجبور ہے!" اس کے بعد وہ میرینہ سے مخاطب ہوا۔ "میرینہ! میں اب بھی اپنے عہد پر قائم ہوں لیکن اب تجھے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ تو میری نہیں بن سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے عہد و پیمان مجھ سے واپس لے لے۔ اب میں اپنی قسم اس طرح پوری کرنا چاہتا ہوں کہ تیرا بھائی مجھ سے مقابلہ کرے۔ وہ یا تو مجھے ہلاک کر دے یا میں اسے قتل کر دوں۔ اگر تیرا بھائی مارا جائے تو یہ نواب سانتافی کی اعلیٰ ظرفی ہو گی کہ وہ تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو مجھے کوئی شکایت بھی نہ ہو گی۔"

نواب سانتافی نے کہا۔ "اگر میرے بیٹے اور تیرے درمیان کوئی اس قسم کی شرط طے پا جاتی ہے تو میں اس کا احترام کروں گا!"

حسن نے دان جان کی طرف دیکھا۔ "میرینہ! یہ نوجوان تیری ہمدردی اور محبت کا مستحق ہے۔ اگر میں مارا جاؤں تو میں تجھ سے درخواست کرتا جاؤں گا کہ میرے بعد تو اس کی دلجوئی کر اور اسے اپنے حق میں نعمت سمجھ کر قبول کر لے۔"

میرینہ نے اشکبار نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "میں مجبور ہوں، تیری ہر بات منظور لیکن اس سلسلے میں میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔"

دان جان جو اب تک چپ تھا گویا ہوا۔ "بہادر مورا! میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔ اگر میں تجھے زیر کر سکا

تو میرینہ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنے قدموں میں جگہ عنایت فرما دے۔"
میرینہ کا بھائی باہر جاتا ہوا بولا۔"مور! اب اور وقت نہ ضائع کرو، دریائے ڈارو کا ساحل ہمارا انتظار کر رہا ہے!"

حسن اس کے ساتھ چل دیا۔ دان جان بھی ساتھ ہو لیا۔ میرینہ نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی۔"میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اس کے بعد حسن سے بولی۔"جب میرا بھائی واپس آئے گا اور تمہیں اس کے ساتھ نہیں دیکھوں گی تو تمہارے حسرت ناک انجام کا مجھے خود بخود علم ہو جائے گا۔"

نواب سانتافی انہیں دروازے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ تینوں اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دریائے ڈارو کے اس کنارے پہنچ گئے جہاں عموماً اس قسم کے مقابلے اور فیصلے ہوتے رہتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دو تلواریں فضا میں لہرائیں اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ میرینہ کا بھائی ایک کہنہ مشق سپاہی تھا۔ اس نے پھرتی اور مہارت کا شاندار مظاہرہ کیا۔ اس کا مقابلہ جارحانہ تھا۔ برخلاف اس کے حسن کا یہ پہلا مقابلہ تھا۔ اس میں چالاکی اور ہوشیاری تو البتہ موجود تھی۔ سپاہ گری کے داؤ پیچ بھی آتے تھے لیکن اس کا مقابلہ مدافعانہ تھا۔ کئی بار تلوار اس طرح چمکتی ہوئی حسن کی گردن تک آئی کہ شبہ گزرا حسن مارا گیا لیکن ایسے موقع پر اگر وہ پھرتی سے گردن ہٹا نہ لیتا تو صاف ہو جاتے۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد حسن کا پلا بھاری پڑنے لگا۔ اس نے کا وار دے کر تلوار اٹھائی تو حسن سر کے لیے لیکن جب اس نے سر بچانا چاہا تو حسن نے تلوار کی نوک اس کے پیٹ میں اتار دی۔ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ وہ گھوڑے سے نیچے آ گیا۔ حسن بھی گھوڑے سے اترا۔ اس کی تلوار اپنے قبضے میں کی اور خوش ہوتا ہوا بولا۔"میرے دشمن کے بیٹے! مجھے یہ یقین تو تھا کہ تو مجھے قتل کر دے گا لیکن اس کا شبہ تک نہ تھا کہ میں تجھے زیر کر لوں گا!"

اس کے بعد دان جان سے مخاطب ہوا۔"دوست! مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ اگر تو چاہے تو مجھ سے اپنے بھائی کا بدلہ لے سکتا ہے!"

نواب سانتافی اور میرینہ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار دریائے ڈارو کے کنارے پہنچ گئے۔ انہوں نے جب حسن کے حریف کو زخموں سے کراہتے اور سسکتے دیکھا تو بے چین ہو گئے۔ بوڑھا نواب گھوڑے سے کود کر اس کے سرہانے پہنچ گیا اور چلوؤں میں پانی بھر بھر کر اسے پلانے لگا۔"بابا جان! اس مور نے مجھے شکست دی ہے۔ شرط کے مطابق میرینہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیجیے گا!"

میرینہ کا عجب حال تھا اسے غم بھی تھا اور خوشی بھی۔ بھائی کی موت کا غم اور محبوب کی فتحمندی کی خوشی۔
حسن نے دان جان کو للکارا۔"تو بھی آجا!"

نواب سانتانی نے بھی گھور کر دان جان کو دیکھا گویا کہہ رہا ہو "جا! اس سور سے مقابلہ کر اور اپنے بھائی کا بدلہ لے لے۔"

دان جان کا گھوڑا آگے بڑھا۔ حسن پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

دو تلواریں پھر فضا میں لہرائیں اور یہ سانپ اپنے اپنے حریفوں کو ڈسنے کے لئے ایک دوسرے پر لپکے۔ میریئہ کو یقین تھا کہ حسن نے جب اس کے بھائی کو شکست دے دی ہے تو دان جان بھی مارا جائے گا لیکن یہ مقابلہ کانٹے کا ثابت ہوا۔ دونوں ہی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے حریف کو مار دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پھر دان جان حاوی آنے لگا اور حسن کے ہاتھ کی پھرتی کم ہونے لگی۔ میریئہ نے اپنی سانس روک لی اور دعائیں مانگنے لگی۔

میریئہ کا بھائی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا، اچانک ایک جھٹکے کی آواز گونج گئی۔ حسن کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی اور دان جان نے اسے نہتا دیکھ کر موقع جانے نہیں دیا۔ نہایت چستی اور مہارت سے اپنی تلوار حسن کی گردن میں اتار دی۔ جو گردن کے کنارے سے لہراتی ہوئی دونوں ہنسلیوں کے درمیان تیر گئی۔ حسن چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔

میریئہ چیخ مارتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ دان جان نے حقارت سے حسن کو دیکھا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے بعد چیخا۔ "نواب سانتانی! میں نے تیرے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔ میریئہ! میں نے تیرے بھائی کے قاتل کو ہلاک کر دیا۔"

حسن کی پتلیاں پتھرائی جا رہی تھیں۔ اس نے بمشکل تمام ہاتھ کے اشارے سے میریئہ کو اپنے منہ کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میریئہ نے اپنے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ حسن نے بمشکل تمام کہا: "میریئہ! میں نے یہ سب کچھ تیری خاطر قبول کیا ہے۔ میں نے قصداً تلوار پھینک کر دان جان کے ہاتھوں ہلاک ہو جانا گوارا کر لیا۔ تو اسی طرح کش مکش عشق سے نجات پا سکتی تھی۔" وہ دم لینے کے لیے رُکا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میریئہ بھاگی بھاگی دریا کے کنارے پہنچی اور اپنے رومال کو تر کر کے لے آئی۔ اسے حسن کے حلق میں نچوڑ دیا۔ اس کا رنگ سفید ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ کلمات اور ادا کیے۔ "تو اگر چاہے تو دان جان کو اپنا سکتی ہے۔ میں تجھے اجازت دیتا ہوں۔" اور مرتے مرتے زیر لب نعرہ لگایا۔ "عزت یا موت" "میرا باپ بھی اسی طرح گیا تھا۔"

الحمرا کے سنسان ایوانوں اور غرناطیہ کے محلات میں ایک پاگل سی عورت دیکھی جانے لگی۔

یہ کبھی قصر اللیوث میں جاتی اور پھر دار الاختین سے گزرتی ہوئی بنو سراج کے محلات میں داخل ہو جاتی

گھنٹوں بیٹھی دور تک پھیلے ہوئے سبزوں اور غلام گردشوں اور جالی دار محرابوں کو تکتی رہتی۔ پھر یہاں سے اٹھ کر وہ ایوان اسد میں پہنچ جاتی اور حوض کے اندر خون کے ان دھبوں کو دیکھتی رہتی جہاں چھتیس بنو سراج قتل کئے گئے تھے۔ یہی پاگل عورت المیریہ کے خیران صقلبی کے محلات میں بھی گھومتی دیکھی گئی۔ لیموؤں کے سائے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس راہ کو گھورتی رہتی جس سے پہلے پہل حسن یہاں داخل ہوا تھا۔ پھر وہ سمندر کے مقابل پہاڑی پر پہنچ جاتی اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر پر نظریں گاڑ دیتی۔ وہ جھاگ اڑاتے ہوئے جہازوں کو آتے جاتے دیکھتی اور ان میں کسی کو تلاش کرتی رہتی۔

وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ چپ رہتی۔ ہاں کبھی کبھی زیر لب "عزت یا موت" ضرور دہرا دیتی۔ یہ میرینہ تھی۔ لوگ کہتے اس پر آخری ابن سراج کی روح آسیب بن کر مسلط ہو گئی ہے اور اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرینہ کا دماغی توازن بیکار کر دیا ہے۔ دان جان اگر زندہ ہوتا تو ممکن تھا میرینہ میں کوئی تبدیلی آ جاتی لیکن اس نے تو اسی دن البشرات کی پہاڑی سے گر کر خودکشی کر لی تھی جب میرینہ نے اسے یہ بتایا تھا کہ "بہادر مور نے ازراہ ہمدردی تیری خاطر قصداً تلوار پھینک کر تیرے ہاتھ سے قتل ہو جانا گوارا کر لیا تھا۔"

چھوٹی بیگم صاحبؒ کی داستانِ عشق

مغل شہزادیاں بظاہر جتنی خوش نصیب نظر آتی تھیں اندرونی طور پر اتنی ہی بدقسمت ہوتی تھیں۔ محل کی سنگین چاردیواری میں شہزادیوں کی دبی دبی سسکیاں، شاہی ہنگاموں اور پرشکوہ رسم و رواج میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھیں۔ لیکن اس سنگلاخ زمین میں بھی عشق و محبت کے پھول کھلتے رہے۔ مغل بادشاہ، شاہجہاں کے محل میں جنم لینے والی دل گداز داستان۔ شاہجہاں جب شہنشاہ کے رتبے سے نیچے اترا اور وہ محض کسی کا باپ، کسی کا چچا، کسی کا باپ اور کسی کا دادا رہ گیا تو یہ پرسوز داستان اپنے عروج کو پہنچ گئی۔

عصر کی نماز اس نے پہاڑی کے دامن میں ادا کی اور جلدی جلدی دعا مانگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پانچ ساتھی پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ تقریباً ایک ساتھ ان کے پیر اپنے گھوڑوں کی رکاب میں گئے اور پھر اچھل کر گھوڑوں کی پشت پر پہنچ گئے۔ ان کی نظریں پہاڑی کے پیچھے سے اٹھنے والے بے پناہ دھویں پر جمی ہوئی تھیں' اس دھویں سے ہی انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاہجہانی لشکر پہاڑی کے دوسری طرف فروکش ہے۔ ظفر نے دھویں کے بادلوں سے نظریں ہٹا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گھوڑے کی پشت پر ذرا اٹھ کر اسے ایڑ لگائی اور کہا " دوستو! وقت کم ہے ہمیں دن کے اجالے میں ہی اس لشکر میں داخل ہو جانا چاہیئے "

کسی ساتھی نے سوال کیا " یہ دھواں کس چیز کا ہے ؟ "

ظفر کے شانے نہایت پھرتی اور بے اختیاری سے اوپر نیچے ہو رہے تھے " میرا خیال ہے کہ لشکری اپنے شام کے کھانوں کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے "

لیکن ظفر اس فاصلے کو جتنا کم سمجھتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ نکلا۔ یہ راستہ کم از کم ظفر کے لیئے غیر مانوس اور اجنبی تھا۔ وہ اورنگ زیب اور اس کے تینوں بھائیوں کے حقیقی ماموں شائستہ خان کی پُر زور سفارش پر شاہجہاں سے ملنے جا رہا تھا۔ وہ اودھ کے حکماء کے ایک معروف خاندان کا ہونہار فرد تھا۔ شائستہ خان سے اس کی کس طرح ملاقات ہوئی یہ ایک لمبی داستان ہے۔ لیکن جب شائستہ خان ظفر کی طبابت سے متاثر ہوا تو اس نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے فطری جوہر اور فن طب کی اودھ کے غیر معروف خطے کے بجائے مغل شہنشاہ سے اس کی صحیح قدر و قیمت حاصل کرے۔ ظفر کی یہ خوش نصیبی تھی کہ جب وہ اکبر آباد جا رہا تھا تو اسے راستے میں اچانک یہ اطلاع ملی کہ شاہجہاں سفر میں ہے اور اس کو راستے ہی میں شرف باریابی حاصل ہو سکتا ہے چلا تو وہ تنہا تھا لیکن راستے میں پانچ سوار اور مل گئے۔ یہ سوار شاہجہاں کی سپاہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور دور دراز علاقوں سے چھٹیاں گزار کر اپنے لشکر میں واپس جا رہے تھے۔

ظفر کے لیئے دشوار ترین مرحلہ شاہجہاں کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنا تھا اور ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ شاہی لشکر میں پہنچنے کے بعد اسے کس امیر یا منصب دار کا توسل حاصل کرنا ہے جو اسے مغل شہنشاہ کی بارگاہ تک پہنچا دے۔

جب وہ پہاڑی کی گھاٹی سے گزر رہا تھا تو اسے بہت سی آوازوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دینے لگی اور اس نے دور فضا میں دھویں کے بادلوں کے غٹ کے غٹ پھیلے ہوئے دیکھے جو فضا کی نچلی

سطح پر زیادہ گہرے اور سیاہ تھے لیکن انہوں نے اُوپر کی فضا میں زیادہ پھیل جانے کی وجہ سے ہلکا سرمئی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی، مشرق سے سیاہی کی چادر تیزی سے پھیلتی چلی آرہی تھی اور شام نے ہر شے کو دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ مغرب کی نماز وہ شاہی لشکر کی حدود میں ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ حدود ابھی دُور تھیں یہاں تک کہ اندھیرا گہرا ہونے لگا۔

جب تاریکی گہری ہو گئی اور گھوڑے کو تیز دوڑانا دشوار ہو گیا تو اس نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کر لی، پہاڑی کی بلندی سے رات کی تاریکی میں اس نے دور لشکر میں بہت ساری مشعلوں کو حرکت کرتے دیکھا، لیکن دھواں اتنا گہرا تھا کہ مشعلوں کی تیز روشنی بھی دھندلا گئی پھر انہی مشعلوں کے اوپر انتہائی بلندی پر ایک روشن ستارہ جھلملاتا ہوا دکھائی دیا، ظفر سمجھ گیا کہ یہ روشن جھلملاتا ہوا ستارہ شاہی آکاش دیا ہے جسے چالیس گزی ستون پر ہر شب اس لیے روشن کر دیا جاتا ہے کہ بھولے بھٹکے لوگ اس کی روشنی میں رہنمائی حاصل کریں، اور اپنی منزل پالیں لیکن اس وقت شاہی آکاش دیا بھی دھوئیں کے بادلوں کے آگے بے بس تھا کیونکہ زمین سے کچھ اُوپر کی فضا تک دھوئیں کا قبضہ تھا۔ اور زمین سے چالیس گز اُوپر کی فضا میں آکاش دیئے اور نظر کے درمیان دھواں حائل تھا۔ ظفر کو معلوم تھا کہ یقیناً آکاش دیئے کے قریب ہی شاہی خیمے نصب ہوں گے، اب لوگوں کی آوازیں زیادہ صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لشکر کے شاہی بازار میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے۔

بدقسمتی سے وہ شاہی مستورات کے خیموں کی حدود میں پہنچ گیا۔ دھوئیں اور اندھیرے کی وجہ سے خواصیں اور خواجہ سرا اسے پہچان نہ سکے اور وہ آہستہ روی سے چلتا ہوا ایک ایسے خیمے کے سامنے پہنچ گیا جو مچھلی پٹن کی چھینٹ سے تیار ہوا تھا اور سرخ رنگ کے اس خیمے پر رنگ برنگی بیلوں نے اس کے حسن اور رومانی کیفیت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ خیمے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا۔ ایک حسین ترین لڑکی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اپنی خواص کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ کچھ خواصیں مورچھل ہلا رہی تھیں اور کچھ اس کے پیروں کے پاس بیٹھی آہستہ آہستہ پیر داب رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت غالباً کوئی داستان سنا رہی تھی۔ ظفر نے اتنی حسین شکل پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، اسے سکتہ سا ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر گھوڑے کی لگام کھینچ لی، گھوڑا رک گیا۔ بدقسمتی سے اس نے یہ مثل نہیں سنی تھی کہ انسان کو تین موقعوں سے بچنا چاہیئے۔ اول کوتل گھوڑوں کی دولتیوں سے، دوم شکارگاہ میں داخل ہونے سے اور سوم بیگمات شاہی کی سواری یا خیموں کے قریب جانے سے۔ ظفر اس تیسری خطرناک غلطی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ ابھی وہ جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ لڑکی کی نظریں اس

ہیمے پر پڑ گئیں اور اس نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ایک عمر رسیدہ خواص کے کان میں کچھ کہا۔ وہ خواص کچھ تامل کے بعد اٹھی اور خیمے کے عقبی دروازے سے نکل کر ظفر کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے سرگوشی میں دریافت کیا۔ "تم کون ہو؟ کیا تم اپنے سر کو اپنے جسم پر وبال محسوس کر رہے ہو؟"

ظفر سٹپٹا گیا۔ "میں بارگاہ شاہجہانی میں پہنچنا چاہتا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ اس وقت میں کہاں اور کس سے مخاطب ہوں۔ رات کی تاریکی اور دھوئیں کے بادلوں نے مجھے بھٹکا دیا ہے۔"

"بدقسمت انسان!" وہ عورت بڑبڑائی۔ "تیری موت تجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ جس طرح بھی بن پڑے یہاں سے فرار ہو جا۔ یہ شاہی مستورات اور بیگمات کے خیمے ہیں اگر یہاں کسی کی نظر تجھ پر پڑ گئی تو وہ تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

ظفر کے ہوش و حواس اڑ گئے اور اسے اپنی موت آنکھوں کے سامنے منڈلاتی دکھائی دینے لگی۔ خوفزدہ حالت میں فرار کی راہ مسدود ہوتی محسوس ہوئی۔ خیموں سے ذرا فاصلے پر خواجہ سراؤں اور احدیوں کے پہرے بھوتوں کے سائے کی طرح متحرک تھے۔

بوڑھی خواص کو اس کی حالت زار پر رحم آگیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم گھوڑے سے نیچے آجاؤ میں تمہارے نکلنے کی کوئی ترکیب کرتی ہوں۔"

اسے اس سادہ لوح نوجوان پر رحم آگیا تھا۔ ظفر گھوڑے سے اتر پڑا۔ بوڑھی خواص اسے لئے ہوئے خیمے کی آڑ میں پہنچ گئی۔ ظفر نے جلدی جلدی چلتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ وہ اودھ سے آیا ہے خاندانی طبیب ہے اور دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے حقیقی ماموں شائستہ خان کی سفارش پر بارگاہ شاہجہانی میں رسائی کا خواہش مند ہے۔

بوڑھی خواص نے اسے خیمے کی آڑ میں بٹھا کر اندر کی راہ لی اور لڑکی کے کان میں سب کچھ بتا دیا اس نے بوڑھی خواص کی باتیں اس طرح سنیں گویا کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ چہرے سے کسی قسم کے بھی جذبے کا اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے اپنی جملہ خواصوں کو رخصت کر دیا اور خیمے میں بالکل تخلیہ ہو گیا۔ بوڑھی خواص بدستور موجود رہی۔ لڑکی نے ایک ہوش ربا انگڑائی لی اور آنکھ کے اشارے سے بوڑھی خواص سے کچھ کہا۔ تھوڑی دیر بعد ظفر خیمے کے اس حصے میں داخل ہو چکا تھا جس میں شاہی بیگمات کا سامان رکھا ہوا تھا۔ بوڑھی خواص اس خیمے کی نگراں تھی۔ ظفر کے سامنے توشکوں، ریشمی اور سوتی چادروں اور قالینوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ خیمے کے دوسرے کنارے پر شاہی بیگمات کے ملبوسات سے بھرے ہوئے صندوقوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

بوڑھی خواص نے توشکوں کے انبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا "جاؤ اس کے پیچھے چھپ جاؤ"

ظفر میں انکار کی ہمت نہ تھی، چپ چاپ توشکوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہاں سخت گرمی تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک ہمدردانہ ہے یا کسی سزا کے پیش نظر۔

بوڑھی خواص اسے چھوڑ کر خیمے سے باہر نکل گئی اور خیمے کے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا۔

وہ دیر تک دم سادھے وہیں پڑا رہا لیکن جب وہ پلٹ کر نہ آئی تو بیسیوں وسوسے اسے ڈرانے لگے۔ وہ ہمت کر کے توشکوں کی آڑ سے باہر آگیا اور خیمے کے اندر ادھر اُدھر گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا کہ وہ یہاں سے نکل بھی سکتا ہے یا نہیں، پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ بفرض محال وہ اگر یہاں سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا گھوڑا ابھی تک اپنی جگہ موجود بھی ہو۔ کیا اسے اصطبل میں داخل کر کے نکل بھاگنے سے معذور نہیں کر دیا گیا؟ عجیب خطرات اسے دہشت زدہ کرنے لگے وہ خوفناک شاہی سزائیں جو ایسے مجرموں کو دی جاتی ہیں اس کے تصور میں گھومنے لگیں ایک تو کپڑوں کی گرمی، دوسرے دہشت زدگی، اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔

اچانک اس کے کانوں میں کچھ آوازیں پڑیں۔ چند خواجہ سرا اس کے خیمے کے باہر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

کسی ایک نے کہا۔ "غیر ملکیوں کے لئے یہاں بڑی مشکلات ہیں۔ وہ یہاں کے آداب اور قاعدوں سے تو واقف ہوتے نہیں اور زبان بھی نہیں جانتے اس لئے اکثر مشکلات میں پھنس جاتے ہیں!"

دوسرے نے پوچھا۔ "آخر یہ تھا کون جو شاہی بیگمات کے خیموں کے قریب آ پہنچا؟"

چیلے نے جواب دیا۔ "یہ کوئی ولایتی ہے جو شاید حکیم بھی ہے۔"

"بال بال بچا۔ ورنہ خواجہ سرا یا احدی اسے قتل کر دیتے وہ تو کہئے اس نے فوراً تلوار کھینچ لی تھی اور پہرے داروں نے بھی یہ خیال کیا کہ حکیم ولایتی اور ذرا مقرب بارگاہ سلطانی ہے ورنہ اس کا زنانہ خیموں کی حدود سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔"

ظفر کو یقین ہو چلا کہ یہ گفتگو اسی کے بارے میں ہو رہی ہے لیکن اس کی یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ اس نے پہرے داروں کے مقابلے پر تلوار کب کھینچ لی تھی؟ اور پھر یہ کہ اسے فرار ہو جانے کا موقع کس نے اور کب دیا؟ ابھی وہ کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچا تھا کہ کسی تیسرے شخص کی آواز گونجی۔" اور

پھر سُنا چھوٹی بیگم صاحب کے خیمے کے قریب کوتل گھوڑا پکڑا گیا۔ اس کے سوار کی تلاش جاری ہے۔"
کسی نے سرگوشی میں رائے دی۔ "کسی بیگم نے کہیں چھپا دیا ہوگا۔"
ظفر کا دل ہولنے لگا کیونکہ یہ آخری باتیں بالکل اسی کے متعلق تھیں اور یہ جان کر کہ اس کا خالی گھوڑا پکڑا جا چکا ہے اور بھی دہشت ہونے لگی۔
اسی وقفے میں بوڑھی خواص کی آواز گونجی۔ "یہ تم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ چھوٹی بیگم صاحب برہم ہیں، یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔"
اور پھر ظفر نے ان کے بھاگنے کی آوازیں سنیں اب وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ سہم کر پھر توشکوں کے پیچھے جا چھپا پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خیمے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے۔ اس نے توشکوں کی آڑ سے جھانک کر دیکھا آگے آگے بوڑھی خواص تھی اور اس کے پیچھے ایک حسین شہزادی جو بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ ظفر نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ وہی دوشیزہ ہے جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا خیمے میں چھوٹی سی کافوری شمع روشن تھی۔
شہزادی خیمے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی اور بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ اس بدنصیب اجنبی کو تلاش کر رہی تھی۔ ظفر کو یہ بوٹا سا قد موہنی صورت اور طبیعت میں ہرنیوں جیسی دہشت بڑی بھلی لگی شہزادی نے بوڑھی خواص سے پوچھا۔ "وہ کہاں گیا؟"
بوڑھی خواص توشکوں کے انبار کے پاس پہنچ کر آہستہ سے بولی۔ "ذرا ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے سامنے آنا۔"
ظفر آہستہ آہستہ توشکوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور ناف پر دونوں ہاتھ رکھ کر ذرا جھکا اور شہزادی کی تعظیم بجا لایا۔ شہزادی نے مارے شرم کے ریشمی جالی کے دوپٹے کو نقاب کی طرح چہرے پر ڈال لیا اور خیمے کے دروازے کو دیکھنے لگی۔ بوڑھی خواص شہزادی کا اشارہ سمجھ گئی اور اس نے ایک بار پھر مزید اطمینان کے لیے دروازے کو ہاتھ سے ٹٹول کر اندر سے بند ہونے کا یقین کر لیا۔
شہزادی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شرم وحیا سے زبان نہ کھلتی تھی۔ اس نے بوڑھی خواص کے کان میں کچھ کہا۔ ظفر کی مارے رعب کے گردن نہ اٹھتی تھی۔ یکایک خواص کی آواز سنائی دی۔ "چھوٹی بیگم صاحب شہزادے شجاع کی صاحبزادی نسرین بانو ہیں کہ تو ان کے خیمے کے سامنے چوروں کی طرح کیوں آیا؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اس جرم میں تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔"
ظفر نے ذرا سی گردن اٹھائی اور شہزادی کے ہوش رُبا حسن کی ایک جھلک دیکھی۔ "شہزادی صاحب!

میں ایک اجنبی نووارد ہوں غلطی سے یہاں تک آ گیا معافی کا خواستگار ہوں۔"

اب کے شہزادی کی مترنم آواز سنائی دی۔ "تم ہمارے خیمے کے سامنے تھے اس لیے اگر گرفتار ہوتے تو رسوا ہم ہوتے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤ۔"

اس حکم پر ظفر ایا دل مسوسنے لگا اور اس کی نظر میں اپنی زندگی کی قدر و قیمت پہلی جیسی نہ رہ گئی۔

اس نے ایک عذر پیش کیا۔ "شہزادی کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن سنا ہے کہ غلام کا گھوڑا اصطبل میں داخل کر دیا گیا ہے، میں یہاں سے پیدل کس طرح جا سکتا ہوں۔"

شہزادی نے سوالیہ نظر سے خواص کو دیکھا۔ خواص نے عرض کیا۔ "اجنبی درست کہتا ہے۔"

"اس وقت پہرے پر خواجہ سراؤں کا افسر کون ہے؟" شہزادی نے سوال کیا۔

"دلدار خان!"

اس کو کسی طرح خیمے کے دروازے تک بلاؤ!"

خواص کچھ تامل کے بعد چلی گئی۔ شہزادی کو یہ نوجوان طبیب اچھا لگ رہا تھا لیکن اسے اپنے غلامی دقار کا بھی ـــــ بڑا خیال تھا اور ظفر یہ سوچ رہا تھا کہ اے کاش! یہ وقت ہمیشہ کے لیے یہیں ٹھہر جائے جب تک خواص واپس نہ آئی دونوں ہی خاموش رہے اور ایک دوسرے کو چوری سے دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" شہزادی نے سوال کیا۔

"ظفر!"

"کیا کرتے ہو؟"

"طبابت!"

"خوب!" شہزادی زیرلب مسکرائی۔ "علاج کرتے ہو اگر کچھ لیاقت رکھتے ہو تو دادا حضور کی خدمت میں رسائی حاصل کرو۔ انہیں پچھلے دنوں اختلاج کی شکایت ہو گئی تھی۔ ایک فرانسیسی ڈاکٹر برنیر نے ہمارا علاج کیا تھا!"

"مجھے نواب شائستہ خان نے بھیجا ہے!" ظفر نے جواب دیا۔ "میں آپ کا اختلاج دُور کر سکتا ہوں۔ اس مرض کے میرے پاس چند تیر بہدف نسخے ہیں!"

شہزادی نے افسردگی سے کہا۔ "لیکن افسوس ہے کہ ہم دادا حضور کی مرضی کے بغیر تم سے اپنا علاج نہیں کرا سکتے!"

اسی لیے خواص واپس آئی اور اس نے بتایا کہ دلدار خان خیمے کے در پر شہزادی کے حکم کا منتظر ہے۔

شہزادی نے اپنے گلے سے قیمتی موتیوں کا ہار اتار کر خواص کے حوالے کیا۔ بولی "ہماری طرف سے دلدار خان کو یہ ہار نذر کرو اور اسے معاملے کی نوعیت اور نزاکت سے مطلع کر کے حکم دو کہ وہ اس اجنبی طبیب کو شاہی بازار تک پیدل چھوڑ آئے اور اس کے پیچھے وہیں اس کا گھوڑا بھی پہنچا دیا جائے۔"

خواص نے شہزادی کا نذرانہ اور پیغام دلدار خان کو پہنچا دیا۔ شہزادی کے حکم سے زیادہ اس کے قیمتی ہار نے کام کیا اور رخصت ہوتے ہوتے پہلی بار ان دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ دونوں ہی ایک ساتھ کچھ وقت اور گزارنا چاہتے تھے لیکن یہ بات شہزادی کے وقار اور ظفر کی مصلحت کے خلاف تھی۔

دلدار خان ظفر کو ساتھ لے کر بچتا بچاتا بہت سے خیموں اور پہرے داروں کے درمیان سے گزرتا ہوا راجا جسونت سنگھ کے بازار تک چھوڑ آیا یہاں سے آکاش دیا بہت زیادہ دور نہ تھا۔ دلدار خان نے کہا۔ "تم آکاش دیے تک پہنچو میں تمہارا خالی گھوڑا لے کر وہیں پہنچتا ہوں۔"

چاروں طرف غضب کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ خیموں کے اندر روشن شمعوں کی دھندلی روشنیاں ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھیں کسی کسی طرف سے ہوشیار خبردار کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں بازار بند ہو چکا تھا۔ راستے ویران تھے وہ آکاش دیے کی روشنی پر نظریں جمائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن ہر قدم پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اب وہ گرفتار ہو جائے گا یا پھر کسی اور مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا اس نے سن رکھا تھا کہ شاہی لشکر جہاں فروکش ہو اگر کوئی غیر متعلق آدمی اس میں بدقسمتی سے پھنس جائے تو پھر اس کا خدا ہی نگہبان ہے آج وہ اس میں پھنس چکا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ آخر وہ شام کو لشکر میں داخل ہی کیوں ہوا لیکن اس تردد اور فکر مندی میں جب اسے شہزادی کا خیال آیا تو ہمت عود کر آئی، اور جینے کی خواہش نے پورے جسم میں امنگیں دوڑا دیں۔

بمشکل تمام جب وہ آکاش دیے کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں اور بھی کئی آدمی بیٹھے ہوئے ہیں یہ لوگ اسی لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ لشکر کے کسی دوسرے حصے سے چل کر اپنے اپنے خیموں میں پہنچنا چاہتے تھے کہ رات ہو گئی اور اندھیرے میں اپنے خیموں کی تلاش جب ناممکن ہو گئی تو آکاش دیے کی جڑ میں آکر بیٹھ گئے کیونکہ رات کے اندھیرے میں یہی وہ جگہ تھی جہاں لوگ چور اچکوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

وہ وہاں بیٹھے بیٹھے تھک گیا لیکن دلدار خان واپس نہ آیا جیسے جیسے رات بیتتی جا رہی تھی ہوشیار خبردار کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں یہ لشکری اُمراء اور تجارت پیشہ افراد کے چوکیدار تھے۔ آدھی رات گزر گئی اور دلدار خان واپس نہ آیا۔ ظفر کے دل میں شکوک اور خدشات پیدا ہونے لگے۔ کسی خطرناک صورت حال کے خیال ہی سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بوڑھی خواص اور دلدار خان' دونوں ہی اپنی صورت شکل سے فتین اور عیار معلوم ہوتے تھے۔

فجر کی اذان سے کچھ پہلے دلدار خان پیدل آیا وہ کچھ پریشان سا تھا۔ آکاش دیے کے نیچے بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ اونگھ رہے تھے لیکن ظفر کی نیند اڑی ہوئی تھی اس نے دلدار خان کو تنہا اور پیدل آتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

دلدار خان نے ظفر کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا ظفر اس کے پاس پہنچ گیا وہ اسے لئے ہوئے ذرا دور چلا گیا۔ اس نے بلا کسی تمہید کے کہا۔ "تمہارا گھوڑا نہیں مل سکتا اور تھوڑی دیر بعد تم خود بھی گرفتار کر لئے جاؤ گے۔"

ظفر کا گلا رُندھ گیا' بمشکل تمام دریافت کیا۔ "کیوں؟ کیا ہوا؟ مجھے کون گرفتار کرے گا؟"

"تمہیں میں گرفتار کروں گا!" دلدار خان کی آواز میں ہمدردی یا رحم کی رمق تک نہ تھی۔

"لیکن میرا قصور؟"

"قصور یہ کیا کم ہے کہ تمہارا کوتل گھوڑا بیگمات کے خیموں کے قریب پایا گیا!"

ظفر کو اپنی زندگی ختم ہوتی نظر آئی تو حوصلہ بھی پیدا ہوا۔ "تم لوگ کتنے بے وفا اور نمک حرام ہوتے ہو کیا میری حفاظت کے صلے میں چھوٹی بیگم صاحب نے تمہیں اپنے گلے کا قیمتی ہار نہیں دیا تھا؟"

"دیا تھا' اس سے میں کب انکار کرتا ہوں؟" دلدار خان نے غصے کو ضبط کیا۔ "نوجوان! تم نے مجھے نمک حرام کہہ کر کچھ اچھا نہیں کیا میں نہ تو بے وفا ہوں اور نہ نمکحرام میں تو صرف چھوٹی بیگم صاحب کا ادنیٰ سا نمک خوار ہوں' انہوں نے مجھے جیسا حکم دیا اس کی تعمیل میرا فرض ہے انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے گھوڑے کو ضبط اور تمہیں گرفتار کر کے جہاں پناہ کے سامنے پیش کر دوں!"

اب ظفر کوئی اور سوال نہ کر سکا یہ معاملہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ "یہ نیا حکم تمہیں کب ملا؟" اس نے مردہ سی آواز میں دریافت کیا۔

"تمہیں چھوڑنے کے بعد جب میں پہرے پر واپس گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے دوبارہ چھوٹی بیگم صاحب نے طلب فرمایا ہے جب میں ان کی ڈیوڑھی پر پہنچا تو بوڑھی خواص کے ذریعے یہ نیا حکم

تاکہ میں تمہارے گھوڑے کو ضبط اور تمہیں صحیح ہوتے ہوئے گرفتار کروں۔"

ظفر نے سر جھکا دیا اور دونوں ہاتھ دلدار خان کی طرف بڑھا دیئے۔ "میں حاضر ہوں مجھے گرفتار کرلو!"

"نہیں، ابھی نہیں!" دلدار خان نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر بعد تمہیں تلاش کرتا ہوا آؤں گا اور یہاں سے گرفتار کر کے لے جاؤں گا لیکن اس وقفے میں تم روپوش ہونے کی کوشش مت کرنا!"

"نہیں، میں یہیں ملوں گا!" ظفر نے جواب دیا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دلدار خان نے کہا۔ "تمہاری اور چھوٹی بیگم صاحب کی بہتری اسی میں ہے کہ میں تمہیں گرفتار کر کے دن کو جہاں پناہ کے رُو برو پیش کر دوں۔"

ظفر نے سکوت اختیار کیا اب اس کے پاس بات کرنے کے لئے رہ ہی کیا گیا تھا۔

"اور دیکھو نوجوان!" دلدار خان بولا۔ "تم اگر سر پٹک کے مر بھی جاؤ گے، تب بھی جہاں پناہ کی بارگاہ میں باریابی حاصل نہ کر سکو گے وہاں تک تمہیں اسی طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ چھوٹی بیگم صاحب کی عقل کا جواب نہیں، اور جب تم جہاں پناہ صاحبقران ثانی کے سامنے پہنچ جاؤ تو دلیری سے اس بات پر قائم رہنا کہ میں تو نواب شائستہ خان کا بھیجا ہوا ہوں، لشکر میں آتے آتے رات ہو گئی۔ آکاش دیے کے زیر سایہ آرام کر رہا تھا کہ کسی نے میرا گھوڑا پکڑ لیا اب وہ کہیں بھی ملے مجھے اس کا علم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں پناہ تمہاری اس بات سے مطمئن ہو جائیں گے اور تمہیں کوئی نہ کوئی منصب بھی عطا فرمائیں گے۔"

وہی گرفتاری جو تھوڑی دیر پہلے ظفر کو سراسر ہلاکت اور بربادی محسوس ہو رہی تھی اب نوید جانفزا بن گئی تھی۔

"اور ہاں ایک بات اور یاد رکھو!" دلدار خان نے مزید سمجھایا۔ "جہاں پناہ کو اکثر حبس بول کی شکایت ہوتی رہتی ہے۔ اگر تم اس مرض کو دُور کر سکے تو جہاں پناہ تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے!"

اس کے بعد چھوٹی بیگم صاحب کی تعریفیں کرنے لگا۔ "چھوٹی بیگم صاحب بہت اچھی اور شریف خاتون ہیں، نوجوان! تم خوش قسمت ہو کہ شہزادی تم پر مہربان ہے لیکن افسوس کہ محلسرا کی حدود میں رہنے والی ذیشان بیگمات بڑی بدقسمت ہیں انہیں عزت و احترام اور جاہ و ثروت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں، محلسرا نام کا ایک عظیم الشان قید خانہ ہے جو پانچ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں ہندوستان کی نادر ترین اور منتخب روزگار خواتین قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں!"

خواجہ سرا دلدار خان طبعاً کیسا تھا ظفر کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتا تھا لیکن ایک بات صاف تھی کہ وہ باتونی بہت ہے اور جو دل میں تھا بے تکلف عرض کئے دے رہا تھا اور اس کی باتوں

سے ظفر کو اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ چھوٹی بیگم صاحب اور اس سے متعلق اور غیر متعلق باتوں کا لمبے علم حاصل ہو گیا تھا اور آخر میں یہ نکتہ بھی ہاتھ آ گیا تھا کہ محلسرا کی دم گھوٹ دینے والی فضا میں چھوٹی بیگم صاحب بھی مجبوری اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اگر وہ آزاد ہوتی تو غالباً وہ اس کے اظہار محبت اور قربت خاص سے ضرور لطف اندوز ہو سکتا۔

جب خواجہ سرا دلدار خان ظفر کو سمجھا بجھا کر واپس گیا تو ذرا سی دیر بعد ہی چاروں طرف سے اذان کی آوازیں گونجنے لگیں، اس کے بعد نقاروں پر چوٹ پڑی اور نوبت بجنے لگی اس کے ساتھ ہی شہنائی کی آواز بھی فضا میں پھیل گئی۔ ظفر نے آکاش دیلے کے سائے میں نماز فجر ادا کی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ رہا۔ اب اسے اپنی گرفتاری کا انتظار تھا۔

بالکل منصوبے کے مطابق اسے گرفتار کر لیا گیا خواجہ سراؤں اور احدیوں کی ایک جماعت نے اسے گھیر لیا۔ دلدار خان ان میں پیش پیش تھا۔ اس کو ڈرا دھمکا کر طرح طرح کے سوالات کیے جانے لگے لیکن ظفر کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "میں اجنبی پردیسی، چور اچکوں کے ڈر سے یہاں سو رہا تھا کہ میرا گھوڑا چوری ہو گیا۔ تم لوگ للہ میرا گھوڑا دلادو۔ اس کے بغیر میں سفر کس طرح کروں گا!"

دلدار خان نے اس کے دو طمانچے بھی رسید کر دیئے۔ وہ گال سہلا کر رہ گیا۔ جب اس نے کسی طرح اگل کر ہی نہ دیا تو اسے گرفتار کر کے جہاں پناہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کا منصوبہ بنا پہلے اسے خواجہ سراؤں کے خیمے میں لے جایا گیا۔ یہ خیمے شاہی بیگمات کے خیموں سے ذرا قریب ہی واقع تھے۔ اسے ایک پہر تو یہیں روک کے رکھا گیا اس کے بعد شاہجہانی پروانہ آ گیا کہ "اس عزت و ناموس کے دشمن کو پیش کیا جائے"۔ دلدار خان نے مصنوعی غصے میں کئی ہاتھ اور رسید کر دیئے اور آنکھ مار کر چلتے چلاتے شہنشاہ کا حق نمک یوں ادا کیا کہ کئی ڈنڈے رسید کر کے آخری بار یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ سچ سچ بتا دے کیا وہ خود بھی رات کو شاہی بیگمات کے خیموں کے قریب تھا یا نہیں؟ ظفر نے پھر انکار کیا اور اپنی پہلی بات پر اڑا رہا۔

بیگمات کے خیموں میں یہ چرچا ایسا پھیلا کہ جب اسے شاہجہاں کے پاس لے جایا جا رہا تھا تو بیگمات شاہی اسے اپنے اپنے خیموں سے یا تو دیکھ رہی تھیں یا دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چھوٹی بیگم صاحب بھی ان میں موجود تھی، اس نے ظفر کے چہرے کے اطمینان اور سکون سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ نوجوان شاہجہاں کے سامنے ہراساں یا خوفزدہ نہیں ہو گا اور شاید نواب شائستہ خان کی سفارش کی وجہ سے کوئی اچھا منصب بھی حاصل کر لے۔

شاید پہر دن چڑھا ہوگا کہ اسے شاہجہاں کے رُوبرو پیش کر دیا گیا۔ شہنشاہ کے رُوبرُو درباری اُمرا ادب و احترام کے ساتھ حاضر تھے۔ ان میں گل بچے راجپوت بھی تھے اور بچھو کے ڈنک جیسی مونچھیں رکھنے والے رائے اور راٹھور بھی۔ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ باپ سے تقریباً ایک گز کی دُوری پر موجود تھا۔

جب ظفر کو شاہجہاں کے رُوبرُو پیش کیا گیا اور اس کا جرم آواز بلند سنایا گیا تو درباریوں میں سناٹا طاری ہو گیا لیکن خود شاہجہاں پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔ ظفر کو شہنشاہ ہند نے اجازت دی کہ اپنے جرم کی صفائی اور برات میں اگر کچھ عرض کرنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہے۔

ظفر نے پوری ہوشمندی اور بجا آوری حواس کے ساتھ جو کچھ اسے منصوبے کے مطابق کہنا تھا عرض کر دیا۔ اور جیب سے نواب شائستہ خان کا سفارش نامہ نکال کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شہنشاہ نے اپنے برادرِ نسبتی کی تحریر کو دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ اس کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسے ظفر کی باتوں پر یقین آ گیا۔

شہنشاہ کے اشارے پر شاہی حکیم مومنائی شیرازی آگے بڑھا اور اس نے فنِ طب پر چند سوالات کئے۔ ظفر اس میں بھی کامیاب رہا۔ اسے بے گناہ قرار دے دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ظفر کا گھوڑا اس کے حوالے کیا جائے اس کے ساتھ ہی اسے شاہی اطبا کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ شہنشاہ کے حکم سے ظفر کو ایک خیمہ بھی مرحمت ہوا اور دوسرا حکم کوتوال کے نام جاری کیا گیا کہ وہ اپنے ناقص انتظام کو دُور کرے کیونکہ اس کے زیرِ انتظام آکاش دیئے کے آس پاس سے اگر کسی کا گھوڑا چوری کر لیا جائے تو یہ بڑی شرمناک بات ہے۔

چھوٹی بیگم صاحب کو بھی خبر ہو گئی کہ ظفر شاہی اطبا میں داخل ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں بعد ہی خیمے اکھڑ گئے اور لشکر اکبر آباد روانہ ہو گیا۔ پھر اکبر آباد میں کئی ماہ گزر گئے اور کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ چھوٹی بیگم صاحب کی خبر لے سکتا اور نہ ہی شاہی محلسرا سے کوئی پیام موصول ہوا۔ ظفر مایوس ہو چلا۔ اس نے سوچا کہ گھڑی دو گھڑی کی وہ ملاقات جسے مرا ہے گلے کی بات کہا جا سکتا ہے ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ اس کا اثر اتنی سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے قبول کیا جائے۔ وہ چھوٹی بیگم صاحب کو بالکل بھلا دینا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ کر پاتا تھا۔ اس کے ارادے غیر اختیاری اور بے اختیار یاد کے آگے مسمار ہو جاتے۔

اس نے شہنشاہ کے علم میں یہ بات بھی پہنچا دی کہ اسے حبس بول کا تیر بہدف علاج آتا ہے۔

اور شہنشاہ اس کا بڑا نامریض تھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ رفتہ رفتہ ظفر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ نواب شائستہ خان کی سفارش پر محض پرورش کے لئے اسے شاہی اطبا کے ذمرے میں داخل کر لیا گیا ہے ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی اس خیال نے اس کی پندار خودی کو تکلیف پہنچائی۔
لیکن ایک دن اچانک اسے شاہی حکم موصول ہوا کہ محلسرا میں چھوٹی بیگم صاحب پر دل کے دورے پڑ رہے ہیں اور مزاج شاہی کو معلوم ہوا ہے کہ شاہی اطبا میں نیا حکیم اس مرض کے علاج میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔

خاص انتظام کے ساتھ اسے شاہی محلسرا میں پہنچا دیا گیا۔ دلدار خان سے ایک بار پھر ملاقات ہو گئی اور وہیں اس نے بوڑھی خواص کو بھی دیکھا۔ ان دو کے علاوہ بھی کئی خواصیں چھوٹی بیگم صاحب کی رازداری کا شرف حاصل کر چکی تھیں۔ پردے کی آڑ سے کسی خواص نے چھوٹی بیگم صاحب کے مرض کی کیفیت اور تفصیل عرض کر دی لیکن ظفر تو خود چھوٹی بیگم صاحب کی زبان سے سب کچھ سننا چاہتا تھا۔

اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مریضہ خود اپنی زبان سے اپنے مرض کی کیفیات بیان کر دے۔"

سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ چھوٹی بیگم صاحب اپنی ترجمان خواص کو جواب بتا رہی تھیں۔

خواص نے عرض کیا "طبیب کو آداب شاہی کی حدود میں رہ کر زبان کھولنی چاہیئے۔"

"آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر لیکن جس طرح مرض آداب شاہی کے زیر اثر نہیں ہوتے اسی طرح حکیم کو بھی آزاد ہی رکھنا ضروری ہے!"

"چھوٹی بیگم صاحب فرماتی ہیں۔" خواص نے عرض کیا۔ "دن بھر تو طبیعت بحال رہتی ہے لیکن جیسے جیسے سورج غروب ہونے لگتا ہے دل ڈوبنے لگتا ہے اور پھر جب رات پوری طرح مسلط ہو جاتی ہے تو دل کا مرض ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد کسی کے زیر لب ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

ظفر نے کہا۔ "اب ایک بات اور بتایئے' یہ مرض کب سے ہے؟"

اندر سے آواز آئی "تقریباً تین سال سے مطلب یہ کہ جب سے ہماری چھوٹی بیگم صاحب نے حدود شباب میں قدم رکھا ہے یہ مرض روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا ہے لیکن ابھی چند ماہ قبل جب ہماری بیگم صاحب جہاں پناہ کے ساتھ حالت سفر میں تھیں تو انہیں ایک شب رات کے اندھیرے

میں اپنے خیمے کے سامنے گھوڑے پر سوار ایک آسیب سا نظر آگیا تھا بس اس کے بعد سے تو اس مرض نے قیامت کی شدت اختیار کر لی ہے۔"

ظفر کا دل خوشی سے کچھ اس طرح دھڑکا. گویا پھر کبھی نہ دھڑکے گا۔

ظفر نے کہا۔" افسوس کہ یہ مرض قید و بند کی زندگی میں زیادہ پھیلتا پھولتا ہے اور نسخے میں وہی آسیب لکھا جا سکتا ہے لیکن......."

خواص نے عرض کیا۔" آسیب میں اگر ہمت ہے اور وہ کشتی کے ذریعے محلسرا میں اندر داخلے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اس کا مناسب انتظام کر دیا جائے گا لیکن اس راہ میں سر جانے کا بھی خطرہ ہے!"

ظفر اشارے کی گفتگو سمجھ گیا۔ ہندی مصرعہ عرض کر دیا۔

"لاگی ناہیں چھوٹت چاہے جیا جائے"

اس دن یہ مصیبت رہی کہ چھوٹی بیگم صاحب نے خود کوئی بات نہ کی۔ ترجمان خواص ہی بولتی رہی چلتے چلاتے ظفر نے ایک نسخہ لکھ دیا اور پرہیز میں یہ بتایا کہ موسم برشگال کی ترکیب ہوا میں کالی گھٹائیں رم جھم پھوار اور سیاہ راتوں کی تنہائی میں یہ مرض زیادہ شدت اختیار کر سکتا ہے اس لئے ان دنوں پر دلچسپ کتابوں کے مطالعے اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا سودمند ہے۔"

اس دن کے بعد چوری چھپے محلسرا میں ظفر کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ کشتی اسے کنارے پر اتار دیتی اور محلسرا کے نمک خوار انتہائی احتیاط اور ہوشیاری سے اسے چھوٹی بیگم صاحب کی بارگاہ میں پہنچا دیتے اب ترجمان خواص کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان سے حیا اور شرم کا پردہ بھی معدوم ہو چکا تھا۔ وہ گھنٹوں راز و نیاز میں مصروف رہتے۔ ابتدا میں کئی ملاقاتیں خوف اور دہشت کے عالم میں ہوئیں لیکن پھر یہ ڈر بھی نکل گیا۔

ظفر کہتا۔" چھوٹی بیگم صاحب! آپ اس محلسرا سے نکل چلیں۔"

وہ پوچھتی۔" کہاں؟"

ظفر کہتا۔" کہیں بھی۔ بس اس محلسرا کی حدود سے نکل چلیں۔"

چھوٹی بیگم صاحب حسرت سے کہتی۔" دادا حضور کی حدود سلطنت اتنی وسیع ہیں کہ ہم ان سے نکل نہیں سکتے۔"

"ہم ایران نکل چلیں گے۔"

"ایران دادا حضور کا دوست ملک ہے۔ سفرا برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"تب پھر ترکی نکل چلیں گے۔" ظفر کہتا۔

"لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم مغلیہ خاندان کی ایک شہزادی ہیں اور ایک شہزادی کا اس طرح فرار ہو جانا کتنا شرمناک فعل ہے!"

ظفر مایوس ہو کر کہتا۔ "تب پھر ان پتھر کی دیواروں سے سر مارتی رہیے۔ یہ دیواریں آپ کی خواہشات، ارمان اور آزادی کی قدغنیں ہیں۔ آپ ان میں گرفتار ہیں، ان سے نکل نہیں سکتیں۔"

"بے شک!" وہ کہنے لگی۔ "تم سچ کہتے ہو بلکہ تم انہیں قید خانہ کی دیواریں نہ کہو۔ یہ محلسرا تو ایک شاہی قبرستان ہے جس میں ہم جیسی بہت سی لڑکیاں اور عورتیں جیتے جی دفن کر دی گئی ہیں۔"

ظفر اداس ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ عشق تو بہر حال ناقص اور ناتمام رہے گا اور شاید ایسا کبھی بھی ممکن نہ ہو کہ چھوٹی بیگم صاحب کو اس سے منسوب کر دیا جائے پھر ایسے عشق کا فائدہ؟ لیکن عشق کرنے والے اس کے نفع نقصان پر غور ہی کب کرتے ہیں جو ظفر کرتا۔ اس کے لیے یہی کیا کم تھا کہ چھوٹی بیگم صاحب اسے پسند کرتی تھی اس نے سوچا بس جب تک یہ دو چار گھڑی کے خوشگوار اور پر لطف لمحات میسر آتے رہیں گے۔ یہ لطف اندوز ملاقاتیں کیوں ضائع کی جائیں۔

ایک دن سہ پہر کو وہ باتوں میں مشغول تھا کہ بوڑھی خواص گھبرائی ہوئی آئی اور یہ بری خبر سنائی کہ "حضور جہاں پناہ بس آیا ہی چاہتے ہیں۔" چھوٹی بیگم صاحب زرد پڑ گئی اور ظفر کے اوسان جاتے رہے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح فرار یا روپوش ہو۔

چھوٹی بیگم صاحب نے بوڑھی خواص کو جلدی جلدی سمجھایا کہ وہ ظفر کو لے جا کر دلدار خان کے حوالے کر دے اور وہ جس طرح بھی ممکن ہو اسے محلسرا سے نکلوا دے اور اس درخواست کے ساتھ ہی کچھ اشرفیاں اور ہار تحفے یا نذرانے میں بھیجے۔

بوڑھی خواص نے اسے فوراً چھوٹی بیگم صاحب کے پاس سے ہٹا کر دلدار خان کے پاس پہنچانا چاہا لیکن دلدار خان موجود نہ تھا یہ اور زیادہ پریشان کرنے والی بات تھی۔ بوڑھی خواص نے ہمت کر کے اسے قلعے کی فصیل کے نیچے پہنچا دیا اور بولی۔ "اب محلسرا کی حدود سے تم با آسانی نکل سکتے ہو۔ لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ تمہاری ذرا سی بدحواسی یا بوکھلاہٹ کئے کرائے پر پانی پھیر دے گی!"

"باادب باملاحظہ ہوشیار" کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ظفر بھاگا اور بچتا بچاتا چھپتا چھپاتا فصیل کی طرف بڑھا۔ بوڑھی خواص اسے تنہا چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ ظفر کو اپنی موت آنکھوں کے سامنے ناچتی

دکھائی دینے لگی۔ سارا جسم ایک عجیب سی سنسناہٹ کا شکار ہو چکا تھا۔
خواجہ سراؤں نے جو ایک اجنبی کو ادھر ادھر بھٹکتے دیکھا تو گرفتار کر لیا۔ اس وقت شاہجہان چھوٹی بیگم صاحب کے پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ تعظیماً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تسلیمات بجا لائی۔ شاہجہان نے اسے دعائیں دیں اور ارشاد فرمایا "ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری بیٹی کچھ اداس اداس ہے!"
چھوٹی بیگم صاحب نے اپنے چہرے پر زبردستی خوشی کے تاثرات نمایاں کئے "نہیں تو قبلہ عالم کو دیکھنے کے بعد تو ممکن ہی نہیں کہ چہرہ بشاشت اور خوشی سے گلنار نہ ہو جائے۔"
باہر ظفر کی گرفتاری سے ہلکی سی ہلچل مچی۔ شاہجہان نے بوڑھی خواص کو حکم دیا کہ دریافت حال کر کے اس ہلچل کا سبب معلوم کرے۔ بوڑھی خواص چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ کر صاف صاف بتلا دیا کہ ایک اجنبی نوجوان کو محلسرا کی حدود میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شاہجہان کے چہرے کا رنگ بدل گیا "یہ کون ہے بدبخت؟"
"جہاں پناہ! دیکھا تو میں نے بھی نہیں اس بدبخت کو" بوڑھی خواص نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
"اسے یہیں حاضر کیا جائے، اسی وقت اسی جگہ!" شاہجہان نے جیسے ہی حکم دیا خواصیں بے تحاشہ دوڑ پڑیں اور پلک جھپکتے ہی ظفر کو شاہجہان کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ چھوٹی بیگم صاحب اندر چلی گئی۔
شاہجہان نے جیسے ہی اسے دیکھا حیرت سے منہ سے نکلا "ہیں، یہ تم؟"
"ہاں جہاں پناہ یہ میں ہوں!" ظفر نے گردن جھکا کر جواب دیا "میں نے محلسرا کی بڑی تعریفیں سنی تھیں اور بدقسمتی کہ اسے اندر سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ آج میں کسی نہ کسی طرح اس میں داخل ہو گیا اور جب میں واپس جانے لگا تو مجھے یہاں کے خواجہ سراؤں نے گرفتار کر لیا۔"
"خوب!" شاہجہان مسکرایا "تم واقعی بدقسمت انسان ہو جس کے ساتھ نازک لیکن خطرناک مواقع پیش آتے رہتے ہیں۔"
پھر شاہجہان نے موضوع بدل دیا "کیا یہ صحیح ہے کہ تمہیں حبس بول کا تیر بہدف علاج کرنا آتا ہے؟"
اب ظفر کی جان میں جان آئی "جہاں پناہ! ایک بار اس خادم کو علاج کا موقع عطا فرمائیں اگر اس بارے میں منہ سے کچھ کہوں گا تو بے جا خود ستائی اور بڑائی سمجھی جائے گی۔ یہ میری خوش قسمتی ہو گی کہ جہاں پناہ عملاً مجھ سے خدمت لے کر میرے دعوے کی تصدیق فرما لیں۔"
شاہجہان نے کنکھیوں سے کچھ دیکھنا چاہا۔ پھر سوال کیا "تم اودھ کے کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

"قالین اودھ کے خاندانی اطبا میں میرا خاندان سب سے زیادہ معزز اور مشہور ہے۔"

"ہوں!" شاہجہان نے ہنکاری بھری۔ وہ اس وقت بیش قیمت قالین کے ایک ریشے کو پیر سے مار رہا تھا اس نے آنکھ کے اشارے سے تخلیے کا حکم دیا اور پھر ظفر اور شاہجہان کے سوا تیسرا کوئی آدمی بھی وہاں موجود نہ رہا۔ "تم شریف آدمی نظر آتے ہو!" شاہجہان کی آواز ابھری۔

ظفر کا دل مارے خوشی کے بلیوں اچھلنے لگا۔

"تم ہمارے خطرناک مرض کا علاج کر سکتے ہو لیکن حکیم مومنائی شیرازی تو یہ کہتا ہے کہ اس مرض کو دابا تو جا سکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جا سکتا!"

"غلام سلطنت مغلیہ کے بہت بڑے حکیم کو جھٹلا تو نہیں سکتا لیکن اپنے فن اور علم کا اپنے قول کی صداقت میں مظاہرہ ضرور کرنا چاہتا ہے!"

"بہتر!" شاہجہان نے کہا۔ "ہم تمہیں عنقریب طلب کریں گے اور اگر تم ہمارے علاج میں کامیاب رہے تو تمہیں تمہاری توقعات سے زیادہ نوازا جائے گا۔"

ظفر نے غیر معمولی حوصلے کا اظہار کیا۔ "اگر غلام جہاں پناہ کے موذی مرض کو اپنے علاج سے دفع کر سکا تو یہ درخواست کرے گا کہ اسے اس کی خواہش کے مطابق انعام و اکرام عطا فرمایا جائے۔"

شاہ جہاں ایک دم تلملا گیا۔ "ابھی تم آداب شاہی سے بھی واقف نہیں ہو۔ بادولت جو کچھ تمہیں عطا فرمائیں گے اسے تم بلا چون و چرا قبول کرو گے۔ اپنا انعام تم خود مقرر نہیں کر سکتے۔"

شاہجہان کا لہجہ ایسا تھا کہ ظفر کو مارے خوف کے پسینہ آ گیا۔

"دلدار خان تمہیں محلسرا کی حدود سے باہر نکال دے گا!" شاہجہان نے نرمی سے کہا۔ "تم کسی شریف خاندان کے فرد ہو۔ تمہیں مزید ایسی غلطیوں سے بچنا چاہئے اور ہاں دیکھو تم محلسرا سے نکل کر یہاں کا کوئی ذکر نہیں کرو گے۔"

بوڑھی خواص نے تھوڑی دیر بعد ظفر کو محلسرا کے باہر پہنچا دیا۔ ظفر کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ شاہجہان کا اس کے لئے آئندہ کیا اقدام ہو گا۔ بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ وہ ظفر سے اپنے مرض حبس بول کا علاج کرائے گا اور جو اس کے علاج سے شفا پا جائے گا تو اسے توقع سے کہیں زیادہ نواز دیا جائے گا۔

اب شاہجہان چھوٹی بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوا۔ "تم شاہجہان شہنشاہِ ہند کی پوتی ہو۔ کیا نواب جہاں آرا بیگم اور روشن آرا بیگم کے کردار تمہارے لئے مشعلِ راہ نہیں ہیں۔ یہ تمہاری پھوپھیاں ہیں، انہیں ان کے باپ کی طرف سے شاندار محلسرا اور اعلیٰ و ارفع عزت ملی ہے۔ یہ درست ہے کہ

خواہشات بھی تم میں ودیعت کی گئی ہیں لیکن یہ سفلی خواہشات تمہاری اعلیٰ وارفع حیثیت کے مقابلے میں حقیر اور کمتر ہیں۔ تمہیں اپنے داداجان اور مغلیہ خاندان کی ناموس کا سختی سے خیال رکھنا چاہیے۔"

چھوٹی بیگم صاحب مارے خوف اور دہشت کے سمٹ کر گڑیا بن کر رہ گئی۔ اس نے اپنے عظیم المرتبت دادا کو ایسی نظر سے دیکھا جس میں شاہجہان کے خدشات یا وسوسوں کا انکار پایا جاتا تھا۔

"یہ دوسری غلطی ہے!" شاہ جہاں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹی بیگم صاحب کا وہ ہار نکال لیا جو اس نے کبھی دلدار خان کو ظفر کی حفاظت اور اخفائے راز کے صلے میں عطا فرمایا تھا۔ ہار پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی حرکت رکنے لگی۔ "تو اسے حفاظت سے رکھو اور خبردار جو یہ یا اس قسم کی کوئی اور چیز کہیں اور دیکھی گئی۔ دلدار خان قابلِ اعتبار نہیں رہا۔ اس کی اسے سزا ملے گی۔"

چھوٹی بیگم صاحب میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ شاہجہاں سے اپنا ہار وصول کرے۔ شاہجہاں چلا گیا اور چھوٹی بیگم صاحب اپنی بدقسمتی، بے بسی اور ذلت اور شرمندگی پر اوندھے منہ لیٹ کر آنسو بہانے لگی۔

واپسی پر ظفر بیک وقت دو متضاد کیفیتوں کا شکار ہو گیا۔ کبھی دل کہتا کہ شاہجہاں اس پر مہربان ہو گیا ہے اور کبھی یہ سوچتا کہ یہ سب کچھ ریاکاری سے تو نہیں ہوا لیکن امید اور خوشی کا پلہ بھاری رہا۔ نصف رات کے بعد اسے بیدار کیا گیا شائستہ خان اس کا منتظر تھا وہی شائستہ خان جس کی سفارش پر اسے شاہجہان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تھی۔ ظفر دھڑکتے دل سے جب شائستہ خان سے ملا تو اس کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی نہیں محسوس ہوئی۔

شائستہ خان تنہا تھا اور اس کا گھوڑا بار بار دم ہلا کر پچھلی ٹانگیں پٹک رہا تھا۔ نواب نے اس کی لگام پکڑ رکھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی مسکرائے "تم اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ کل تمہیں جہاں پناہ کے دربار میں حاضری دینی ہے۔ تمہیں یاد فرمایا گیا ہے۔"

ظفر کا ماتھا ٹھنکا۔ "کوئی خاص بات تو نہیں؟"

نواب نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "جب تک ہم موجود ہیں تمہیں پریشان یا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تمہارے ضامن بھی تو ہیں۔"

ظفر نے اپنے مکان کو تالا لگایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شائستہ خان کے ساتھ ہو لیا۔ نواب کا قیام محل سرا ہی کے ایک حصے میں تھا۔ اس وقت ظفر ضرورت سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ نواب

کی نیند اڑی ہوئی تھی اور اپنی قیام گاہ پر آجانے کے بعد اچانک اس کی طبیعت میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو گئی پھر ظفر کی نیند بھی اڑ گئی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نواب اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور کہنے کی تمہید یا اسلوب سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بالآخر نواب نے زبان کھولی۔ "ظفر! تم نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم لیکن شبہ ہے کہ تم سے جہاں پناہ کو سخت تکلیف پہنچی ہے۔"

ظفر نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ نواب کے پھندے میں پھنس چکا ہے اور اس کے محسن نے کسی خاص منصوبے کے ماتحت یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس نے جواب دینے کے بجائے دریافت کیا۔ "کیا اس وقت میں نواب کا قیدی ہوں؟"

"نہیں!" نواب شائستہ خان نے ایک خاص تمکنت سے جواب دیا۔ "تم ایک معمولی بے حیثیت انسان، تم ہمیں اتنا گیا گزرا کیوں سمجھ بیٹھے تم اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہو اور اپنی جملہ ہوشیاریاں اور احتیاطیں اپنی حفاظت کے سلسلے میں روبعمل لا سکتے ہو۔ ہم پھر بھی تمہیں گرفتار کر لیں گے سلطنت مغلیہ کی حدود نہایت وسیع ہیں تم انہیں بآسانی عبور نہیں کر سکتے۔ تم جہاں جاؤ گے۔ ہمارا ہاتھ دراز ہوتا جائے گا۔"

ظفر کو سکتہ لگ گیا۔ نواب اپنی پشت پر ہاتھ رکھے بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

"تم کہیں نہیں جا سکتے۔ بس کل تمہیں جہاں پناہ کے روبرو پیش ہونا ہے۔ وہ تم سے کچھ خاص باتیں کریں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یا تو تم کوئی غیر معمولی مرتبہ حاصل کر چکے ہو گے یا پھر کچھ بھی نہ رہو گے۔"

اس کے بعد آہستہ سے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "تم نے کیا بہت برا۔ اب مغل شہزادیاں اتنی ہیٹی بھی نہیں کہ تم لوگ بے تکلفانہ ان کی عزت و آبرو پر ہاتھ صاف کر جاؤ۔ آخر تمہارے اندر اتنی جرأت پیدا کیسے ہوئی کہ تم شہزادیوں سے عشق کرو۔"

ظفر سہم گیا کہ معاملہ کچھ خطرناک ہی معلوم ہوتا ہے۔

شائستہ خان نے اسے بڑی تسلیاں دیں اور اسے یقین دلایا کہ جب تک وہ موجود ہے۔ اسے فکر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ شاہجہاں کا کوئی اعتبار نہیں، تمہارے خلاف بھی وہ کچھ کر سکتا ہے اور موافق بھی۔

دوسرے دن صبح اول پہر جب دربار برخاست ہوا اور امرا اور معززین چلے گئے تو ایک خصوصی دربار منعقد ہوا اور اسی دربار میں شائستہ خان نے ظفر کو پیش کر دیا۔ یہاں اس کی ضرورت سے زیادہ

اور توقع سے بڑھ کر عزت افزائی ہوئی۔ شاہجہاں نے اسے خود سے تقریباً دو گز دور بٹھایا اور یہ وہ عزت افزائی تھی جو صرف شہزادگان کے لئے مخصوص تھی۔ ظفر کو یقین ہو گیا کہ شاہجہاں یقیناً اپنی پوتی کو اس سے منسوب کر دے گا۔ رعب شاہی سے اس کی نظریں نہ اٹھتی تھیں۔

ظفر کے پیچھے تقریباً پانچ گز کی دوری پہ نواب شائستہ خان مودب کھڑا تھا۔

شاہجہاں نے نواب پر طنز کیا "نواب شائستہ خان! ہمیں تمہاری مردم شناسی کی داد دینی چاہیئے۔ تمہاری سفارش پر ہمارے دربار میں رسائی حاصل کرنے والا نوجوان ضرورت سے زیادہ حوصلہ مند واقع ہوا ہے"۔

نواب شائستہ خان نے گردن کو قدرے خم دے کر جواب دیا "خادم جہاں پناہ کی کسی بات کی تردید کی جرأت نہیں کر سکتا"۔

اب شاہجہاں ظفر کی طرف مخاطب ہوا۔ طنز کا انتہائی زہریلا تیر چھوڑا۔ "جرأت مند نوجوان! ہمیں تمہاری ہمت کی بھی داد دینی چاہیئے۔ شاہی بیگمات کے خیموں میں تم پہنچ چکے۔ محلسرا کو اندر سے دیکھنے کا شوق تم نے پورا کر لیا اب صرف یہ دربار ہی باقی رہ گیا تھا جس میں حاضری دینے کا ارمان تمہیں ضرور بے چین کرتا رہا ہوگا اور بجائے اس کے کہ تم ایک بار پھر چوروں کی طرح دربار میں داخلے کا منصوبہ بناؤ ہم نے خود ہی تمہاری اس خواہش کو پورا کر دیا۔ بتاؤ کیا اس کے بعد بھی کوئی خواہش باقی رہتی ہے"؟

شاہجہاں کے تیور ہی کچھ اور تھے ظفر کا دم کھنچنے لگا۔

انتہائی قیمتی منقش اور مطلا خاصدان شاہجہاں کے سامنے تھا۔ اس نے اس میں سے پان کا ایک بیڑا اٹھایا اور ظفر کی طرف بڑھا دیا۔ "نوجوان! یہ تیری مزید عزت افزائی ہے آگے بڑھ اور دست شاہی سے پان کا بیڑا وصول کر"۔

ظفر امید و بیم کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور پان کا بیڑا وصول کر کے تین بار کورنش و تسلیمات بجا لایا اور الٹے پیروں چل کر اپنی جگہ پر واپس پہنچ گیا۔

شاہجہاں نے پان کے نوش فرمانے کا اشارہ کیا اور ظفر نے اسے منہ میں رکھ لیا اور ابھی چند ہی بار منہ چلایا تھا کہ اس کی زبان اینٹھنے لگی۔ اعصاب جواب دینے لگے۔ بصارت زائل اور سماعت رخصت ہونے لگی اور رگیں کھنچنے لگیں اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔ دربار گھومتا ہوا محسوس ہوا اور اس وقت وہاں کی ہر شے گویا ناچ رہی تھی۔ جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ "چھوٹی بیگم صاحب!"

اسی عالم مدہوشی میں شاہجہاں کی آواز سنائی دی "نواب شائستہ خان! اسے جمنا کے سب سے زیادہ گہرے حصے میں وزنی پتھروں سے باندھ کر ڈبو دیا جائے۔"

نواب شائستہ خان کے اشارے پر دو جلاد مہیب صورت خدمتگار آگے بڑھے اور ظفر کو سمیٹ کر اس کا منہ داب دیا اور اسے خالی بوری میں ڈال کر اوپر سے اسے سی دیا اور یہ سارا کام نواب شائستہ خان کی نگرانی میں انجام پایا۔

اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد شاہجہاں کا دوسرا حکم سنائی دیا "چھوٹی بیگم صاحب کی بوڑھی خدمتگار خواص اور محلسرا کے خواجہ سرا دلدار خان کو بھی یہی سزا دی جائے۔"

نواب شائستہ خان دو آدمیوں کی نگرانی میں ظفر کو لے کر دربار سے نکل گیا۔

ظفر، دلدار خان اور بوڑھی تینوں اس طرح ناپید ہوئے گویا ان کا کبھی کوئی وجود نہ تھا۔ چھوٹی بیگم صاحب کو سب کچھ کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ گھنٹوں تکیے میں منہ چھپائے آنسو بہاتی رہتی۔ یہ سب کچھ دلدار خان کے جذبۂ وفاداری کے طفیل ہوا تھا۔ وہ چھوٹی بیگم صاحب اور ظفر کے راز عشق کو شاہجہاں پر افشا کر کے سرخروئی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے کی ایک ایک بات شہنشاہ کو بتادی تھی یہاں تک کہ چھوٹی بیگم صاحب کا نذرانے میں دیا ہوا ہار تک شاہجہاں کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن اس کا اسے صلہ کیا ملا؟ محلسرا کا یہ راز کسی اور پر نہ ظاہر ہو جائے اس ڈر سے جملہ رازداروں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔

چھوٹی بیگم صاحب کا محلسرا کی چاردیواری میں دل گھبرانے لگا۔ اس کا باپ شجاع بنگال اور اڑیسہ کا حاکم تھا وہ اپنے باپ کے پاس چلی جانا چاہتی تھی لیکن ملک کے حالات یکایک بہت زیادہ بگڑنے لگے۔ اور اس عالم میں جو جہاں تھا وہیں رہ گیا کیونکہ حرکت میں ناقابل تلافی نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ تھا۔

چھوٹی بیگم صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب زندگی بھر اسے یکہ و تنہا خشک اور ویران زندگی گزارنی ہے۔ پھوپھی جہاں آرا اور روشن آرا کی مثالیں سامنے تھیں۔ اپنے مستقبل کو سوچ سوچ کر اس کا دل ہول اٹھتا تھا۔ شاہی خاندان میں پیدا ہونا بھی کتنی بدقسمتی کی بات ہے۔ جب زندگی ویران اور اداس ہی گزارنی ہے تو پھر باپ کے پاس کیوں نہ گزاری جائے لیکن وہ اپنی اس خواہش کا اظہار دادا شاہجہاں پر نہ کر سکتی تھی۔

لیکن اچانک اس کی یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر آئی اور دبے قدموں ایک بار پھر بہار لوٹ آئی۔

محلسرا میں ایک اور ہی انقلاب رونما ہونے لگا۔ شہنشاہ کا سب سے بڑا شہزادہ دارا شکوہ باپ کی زندگی ہی میں شہنشاہیت کے خواب دیکھنے لگا۔ شاہجہاں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دارا شکوہ کو بے حد چاہتا تھا۔ ان دنوں دارا شکوہ کا چھوٹا بھائی اور چھوٹی بیگم صاحب کا باپ شجاع بنگال میں تھا۔ اورنگ زیب دکن میں اور شہزادہ مراد گجرات میں۔ یہ چاروں بھائی آپس میں سخت رقابت رکھتے تھے۔ اورنگ زیب دُور بین، معاملہ فہم اور سیاس تھا۔ دارا شکوہ مغرور، جاہ پسند اور پیری مُریدی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ شجاع معاملہ فہم نہ تھا جلد باز تھا اور مراد بہادر تھا لیکن جلدی میں بڑے بڑے نقصانات کر بیٹھتا تھا۔ معاملہ فہمی اس میں بھی نہ تھی۔

پھر محلسرا میں ایک افواہ گرم ہوئی کہ شاہجہاں نے اپنی کسی بیٹی کے محبوب کو نہانے کے پانی کی دیگ میں زندہ جلا دیا ہے۔ چھوٹی بیگم صاحب پر خوف کی جھرجھری طاری ہوئی لیکن اس کے پاس اب خوف کیلئے کوئی چیز تھی بھی کہاں۔ اسی دوران شجاع کی طرف سے چھوٹی بیگم صاحب کے بلاوے کا رقعہ آ گیا۔ عام حالات میں شاید شاہجہاں اسے نہ بھیجتا لیکن محلسرا اور ملک کے مخدوش حالات کے پیش نظر اس نے چھوٹی بیگم صاحب کو بنگال بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا اور عشق کی آگ میں جلتی ہوئی چھوٹی بیگم صاحب نے اسی میں عافیت جانی۔

چھوٹی بیگم صاحب کا لشکر متھرا کی سمت روانہ ہوا۔ کیونکہ سیدھے راستے میں خطرہ تھا۔ متھرا کے قریب پہنچنے پر مندروں کے کلس پتی دھوپ میں چمکتے نظر آئے۔ بعض مندروں پر سفید اور ہلکے زرد رنگ کے پرچم بھی لہرا رہے تھے۔ یہاں کے پجاری شاہی لشکر کی پیشوائی کو آگے بڑھے اور شاہجہاں کی پوتی کو کچھ نذرانے پیش کرنا چاہے۔ اداس چھوٹی بیگم صاحب کا دنیاداری اور شاہی رسوم و رواج سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا دل خوش نہ تھا اس لئے یہ ساری باتیں بے معنی اور فضول معلوم دیتی تھیں۔ اس نے انہیں ٹالنا چاہا لیکن ایک پجاری بضد رہا کہ وہ بادشاہ کی پوتی کو کچھ نذرانہ پیش کئے بغیر واپس نہ جائے گا۔ یہ ننگ دھڑنگ محض ایک دھوتی میں ملبوس پجاری جو اپنی پیشانی پر ترشول بنائے ہوئے تھا بہت اداس اور مضمحل تھا۔ بڑی مشکل سے چھوٹی بیگم صاحب نے اسے حاضری کی اجازت دی۔ جب یہ پجاری چھوٹی بیگم صاحب کے خیمے کے دروازے پر پہنچا اور پردے کی آڑ سے اس نے پجاری کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا یہ پریشان حال، حواس باختہ اور افسردہ مزاج پجاری ظفر کی شکل و صورت سے بہت مشابہ تھا۔

اس نے اپنی خواص سے کہا کہ "معلوم کرو اس شخص کو کیا تکلیف ہے اور نذر نذرانوں کی پیش کش

کے علاوہ کیا کچھ کہنا بھی چاہتا ہے؟"

جب خواص نے پجاری سے یہی سوال کیا تو پجاری نے عرض کیا کہ "میں زمانے کا ستایا ایک غریب الوطن پجاری ہوں، بنارس سے آیا ہوں اور بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حضور شہزادی صاحب بھی اسے ملاحظہ فرمالیں اور پھر جس طرح بھی ممکن سمجھیں اپنے دادا جان کی خدمت میں بھجوا دیں۔"

اور آخر میں عرض کیا۔ "اور میں شہزادی سے یہ درخواست بھی کروں گا کہ میری درخواست کے مفہوم کو مشہور نہ کیا جائے ورنہ مجھے نقصان پہنچ جائے گا۔"

پجاری نے نذرانے میں پچاس اشرفیاں، عطر کی چند شیشیاں اور مچھلی پٹن کی بنی ہوئی خوبصورت چھینٹوں کے چند تھان پیش کئے۔ انہی میں اس کی درخواست بھی تھی۔

چھوٹی بیگم صاحب نے درخواست کے سوا سارا سامان خواص کے حوالے کیا کہ اسے اس کی جگہ پر پہنچا دیا جائے۔ جب خواص چلی گئی اور اس نے درخواست کی تہہ کھولی تو اس کا شبہ درست نکلا۔ یہ ظفر کا خط تھا۔

"عُلیا چھوٹی بیگم صاحب! نواب شائستہ خان کی مہربانی سے میں زندہ ہوں، نواب نے پانوں میں زہر کے بجائے کوئی غشی آور چیز رکھوا دی تھی جب بے ہوشی کے بعد آپ کے دادا جان نے میری عزتِ آبلی کی خدمت نواب موصوف کے سپرد کی تو انہوں نے دونوں خدمت گاروں کو لمبی رشوتیں دے کر مجھے چھڑا لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو انہوں نے مجھے اکبر آباد سے چلے جانے کا حکم دیا لیکن میں آپ کی قربت کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ میں متھرا میں پجاری بن کر اس وقت تک پڑا رہوں گا جب تک کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ جاؤں۔ چھوٹی بیگم صاحب! میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ یہ دن میں نے کس طرح گزارے ہیں۔

پھر مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ ادھر سے گزر رہی ہیں اب میرے لئے برداشت دشوار تھی اور میں ایک ستم رسیدہ اور فریادی پجاری کے روپ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں اب آپ جیسا حکم دیں۔ میری التجا ہے کہ اپنی صورت دکھا دیجئے۔"

چھوٹی بیگم صاحب خط پڑھ کر شادی مرگ کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی اور کچھ دیر تک اس لائق بھی نہ رہی کہ ہوش و حواس پر قابو رکھ سکے لیکن پھر جلدی سے ظفر کے خط کو چھپا لیا خیمے کے باہر ظفر اب بھی موجود تھا وہ اس سے ہمکلام ہونا چاہتی تھی لیکن ابھی موقع نہ تھا

جب خواص واپس آئی تو اس نے کہا "پجاری ہے کہ دوپہر کسی وقت حاضر ہو۔ اس کی درخواست جہاں پناہ کی خدمت میں بھجوا دی جائے گی۔"

خواص نے عرض کر دیا۔ ظفر جانے کے ارادے سے مڑا اور جاتے جاتے بولا "میں شہزادی کا معمولی خادم ہوں، وہ سامنے جس مندر پر سفید جھنڈا لہرا رہا ہے اس میں رہتا ہوں۔ خدا دارو اور زندگی کی کوئی بھی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔"

چھوٹی بیگم صاحب بہت زیادہ پریشان ہو گئی سویا ہوا عشق پھر جاگ گیا اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور دل کسی نامعلوم جذبے سے دھڑکنے لگا۔ عشق بھی کتنی عجیب چیز ہوتی ہے۔

لشکر روانہ ہو جانے پر آمادہ تھا لیکن چھوٹی بیگم صاحب کے پیر پکڑ لئے گئے تھے، گرمی کی شدت کو بہانہ بنا کر وہ ایک ہفتے تک وہیں مقیم رہی اور پھر اس کی طبیعت خراب ہو گئی، سر کا درد مصیبت بن گیا اور اختلاج کے دورے بھی پڑنے لگے، پہلے تو یہ صلاح ٹھہری کہ اکبر آباد بھی زیادہ دور نہیں ہے شاہی طبیب کو بلایا جا سکتا ہے لیکن چھوٹی بیگم صاحب نے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا اور اسی دوران ستم رسیدہ پجاری نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس نے چھوٹی بیگم صاحب کا حال پوچھ کر دوائیں تجویز کر دیں جس سے اسے حیرت انگیز فائدہ پہنچا۔ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن ان دونوں کی ملاقات نہ ہو سکتی تھی۔ دونوں آمنے سامنے نہ بیٹھ سکتے تھے۔ دونوں راز دنیا سے محروم تھے اور دونوں اس صورتِ حال سے تنگ آ گئے تھے۔

ظفر نے بدقت تمام ایک چھوٹا سا پرزہ چھوٹی بیگم صاحب کو پہنچایا۔

"شہزادی! مجھ سے کم از کم ایک ملاقات تو کسی طرح کر لیجئے ورنہ یہ راز بری طرح افشا ہو گا اور اس میں آپ کی عزت اور میری جان جائے گی۔ ملاقات کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں دواؤں میں آپ کو سفوف بھیجوں گا۔ آپ اس سفوف کو پانی میں ملا کر خواص کو پلا دیں وہ بے ہوش ہو جائے گی پھر آپ اس کے کپڑے پہن لیں اور اپنے اسے پہنا دیں اور اسے اپنی جگہ سلا کر خواص کے بھیس میں مجھ سے ملنے چلی آئیں۔ میں ضروری باتیں کر کے فوراً واپس بھیج دوں گا۔"

چھوٹی بیگم صاحب نے جب اس منصوبے کے ہر پہلو کو جانچا تو اس کا ایک پہلو بہت کمزور محسوس ہوا۔ وہ خواص بن کر اتنی آسانی سے تو نہیں جا سکتی تھی۔ دوسرے واپسی اس سے بھی دشوار تھی اور پھر کیا ضمانت تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں یہ منصوبہ راز ہی میں رہے گا۔ اس نے مجوزہ منصوبے پر عمل

کرنے کے بجائے خواص کو اپنا رازدار بنالینا زیادہ مناسب جانا۔ خواص جلد میں پھنس گئی اور اپنا لباس اس کے حوالے کر کے خود اس کا لباس پہن لیا اور یہ طے ہوا کہ کم از کم دو گھڑی کے اندر شہزادی واپس آجائے گی۔

مغرب کے بعد اندھیرے میں جب اسے خواص کی شکل میں لشکر سے گزرتے دیکھا گیا تو اسے کسی جگہ ٹوکا گیا لیکن بچاری کا نسخہ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ شہزادی کے کسی پیچیدہ اور ناگفتنی مرض کا حال کہنے وید بچاری کے پاس جا رہی تھی۔ سیاہ رات میں اس کا حسین جمیل چہرہ دمک رہا تھا وہ خواص کے لباس میں تھی مگر اس میں شہزادیوں کی تمکنت تھی۔ شہزادیوں کا حسن اور ان کا انداز۔

ظفر اسے راستے ہی میں مل گیا وہ چھوٹی بیگم صاحب ایک جلیل المرتبت مغل شہزادی کو خود سے اتنا قریب دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ شہزادی واقعی آگئی ہے۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"چھوٹی بیگم صاحب! یہ آپ ہیں؟ واقعی کیا یہ آپ ہیں؟"

"ہاں یہ ہم ہیں کہو تمہیں کیا بات کہنی ہے!"

"باتیں یہاں نہیں ہوں گی، مندر کے اس پار نرکلوں کے جھنڈ میں دو گھوڑے کئی دن سے تیار کھڑے ہیں، ہم دونوں ان پر بیٹھ کر یہاں سے نکل چلیں گے اور کسی ویران اور سنسان جگہ بیٹھ کر آزادی سے گفتگو کریں گے۔"

شہزادی نے الجھ کر کہا۔ "لیکن ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟"

ظفر نے کہا۔ "میں بہت جلد آپ کو واپس بھیج دوں گا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے نرکلوں کے جھنڈ میں پہنچے۔ دونوں گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ شہزادی نے دیکھا ایک گھوڑے پر کچھ پوٹلیاں بھی لٹک رہی تھیں۔

ظفر نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر ایک گھوڑے کی لگام تھام لی۔ "کیا آپ گھڑ سواری کر لیتی ہیں؟"

"ہاں گھڑ سواری ہر شہزادی کو آتی ہے!"

"یہ خالی گھوڑا آپ کا ہے، آپ اس پر سوار ہو جائیے!" وہ شہزادی کے قریب پہنچا اور اسے سوار ہونے میں مدد دی۔ شہزادی بالکل بے بس تھی، ظفر جو کہتا تھا عمل کرتی جا رہی تھی۔

دونوں اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے متھرا سے بہت دور نکل گئے۔ چھوٹی بیگم صاحب نے کئی جگہ اپنے گھوڑے کو روکنا چاہا لیکن ظفر "بس تھوڑی دور اور بس تھوڑی دور اور" کہتا ہوا بہت دور

نکال لے گیا۔ شہزادی کو یہ سوچ کر شدید ذہنی جھٹکا لگا کہ اب وہ اپنے لشکر واپس نہیں جا سکتی وہ جانتی تھی کہ اس کی گمشدگی سے ذلت، رسوائی، خواری اور بدنامی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ ظفر پر جنون سوار تھا وہ پاگل ہو رہا تھا اسے خود معلوم نہ تھا اسے اپنی منزل کا کوئی علم نہ تھا۔

چھوٹی بیگم صاحب کو سخت ندامت تھی۔ اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے پیچھے عزیب خاص پر کیا گزر رہی ہوگی اور یہ بھی جانتی تھی کہ لشکر والوں کو اس کا علم ہو چکا ہوگا اور اس کی تلاش شد و مد سے شروع ہو چکی ہوگی۔

"ظفر" وہ تھک گئی تھی۔ "اب ہم گر جائیں گے۔ تم ہمیں کب تک یوں ہی دوڑاتے رہو گے۔"

ظفر نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "بس تھوڑی دور اور۔"

اندھیرے میں ان کے گھوڑوں کے سامنے سیاہ دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ گھوڑے اچانک رک گئے چھوٹی بیگم صاحب کا گھوڑا اگلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور وہ پیچھے کی طرف گر گئی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ظفر گھوڑے سے کود گیا اور چھوٹی بیگم صاحب کو اٹھا لیا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟"

"تم نے ہمیں بہت ستایا ہے!" وہ روہانسی ہو گئی۔ "اب ہم واپس بھی نہیں جا سکتے۔"

ظفر نے سامنے کی سیاہ دیوار کو غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی شکستہ ویران قلعہ ہے۔ کھنڈرات کا ڈھیر، وہ چھوٹی بیگم صاحب کو ساتھ لے کر قلعے کا دروازہ تلاش کرنے لگا۔ معلوم نہیں یہ کون سی جگہ تھی اسے دونوں گھوڑوں کی طرف سے اطمینان تھا کہ انہیں یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا۔

کچھ دیر بعد قلعے میں داخلے کا راستہ بھی مل گیا وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا ہاتھ میں موم شمع پہلے سے پکڑ رکھی تھی اسے بدقت تمام روشن کیا اور قلعے کے اندر داخل ہو گیا اندر ہو کا عالم تھا۔ سونے سونے بام و در اور جا بجا بکھرے شکستہ چھت کمرے۔ چھوٹی بیگم صاحب کو ڈر لگنے لگا۔

ایک کمرے کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر وہ بیٹھ گیا اور اپنے قریب ہی چھوٹی بیگم صاحب کو بھی بٹھا لیا مچھر بھی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔

"چھوٹی بیگم صاحب! آپ کے دادا جان نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا لیکن آپ کی یاد نے مجھے زندہ رکھا۔"

"ہاں!" وہ کہنے لگی۔ "ہم لوگ تیمور گورگان کی اولاد ہیں ہمیں اپنی عزت و ناموس کا بڑا پاس رہتا ہے۔ صرف ایک چیز، وقار اور عزت ہم اس معاملے میں کوئی سودا نہیں کرتے ہیں۔"

"ریاکاری!" ظفر بڑبڑایا۔ "کچھ معلوم ہے کہ میں یہاں آپ کو کیوں لایا ہوں!"

"چند باتیں کرنے"۔ شہزادی نے سادہ لہجے سے جواب دیا۔

"نہیں!" اب اس کی آواز میں بلا کی خود اعتمادی اور آزادی پائی جاتی تھی۔ "میں نے انتظام کر لیا ہے۔ آپ یہاں سے نکل چلیں ہم دونوں ایران چلے جائیں گے جہاں مغل بادشاہوں کا انسانوں پر یہ ظلم و ستم نہ ہوگا۔"

چھوٹی بیگم صاحب نے پس و پیش سے جواب دیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم اس طرح نہیں جا سکتے۔"

ظفر بے بسی سے چلایا۔ "وہ لوگ محلسرا نام کی سنگین چہاردیواری میں آپ کو قید کر کے ہلاک کر دیں گے بے سکا سکا کر مار دیں گے کیا آپ کو اپنے عشق کا بھی پاس نہیں ہے۔ شاید میرے جذبوں ہی میں کوئی خامی ہے۔"

چھوٹی بیگم صاحب کے اندر شہزادی اب بیدار ہو چکی تھی۔ وہ شہزادی جسے اپنی عزت و ناموس کا شدت سے احساس ہو۔ ظفر اسے لے کر فرار ہو جانا چاہتا ہے یہ خیال ہی کتنا شرمناک تھا۔ اس نے تمکنت سے جواب دیا۔ "وہ پتھروں کی چہاردیواری ہی نہیں محلسرا بھی ہے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے وہ ہماری عادت اور عزت ہے۔"

ظفر گڑگڑایا۔ "شہزادی! میں نے صرف آپ کی خاطر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم میں نے آپ کے لیے کس قدر کرب کا عرصہ گزارا ہے۔"

چھوٹی بیگم صاحب نے اسی پُر وقار لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن ہم اپنے شاہی وقار کو اس طرح ہرگز رسوا نہ ہونے دیں گے۔ ہم رسوائی نہیں پسند کریں گے موت پسند کریں گے۔"

"شہزادی! آپ بہت پچھتائیں گی۔ آپ شہزادی ہو کر کیوں سوچتی ہیں۔ آپ ایک عورت بھی تو ہیں۔"

"ہم عورت ہیں مگر ایک شہزادی بھی۔ شہزادیاں عورت کم شہزادیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ بادشاہوں کا مزاج عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔"

"میں اگر آپ کو واپس چلا جانے دوں تو مجھے یقین نہیں کہ زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکوں گا۔" ظفر نے مایوسی سے جواب دیا۔ "اور اگر میں مر گیا تو میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا آپ اتنی بے رحم کیوں ہیں؟"

چھوٹی بیگم صاحب کا جسم کانپنے لگا۔ "تمہیں اس طرح ایک ایسے ذلیل منصوبے کے ساتھ ہمیں یہاں نہیں لانا چاہیئے تھا۔ ہماری بیوسیاں ہم سے زیادہ کربناک زندگیاں گزار رہی ہیں۔ انہوں نے

شاہی اور تیموری عزت و ناموس کو رسوا نہیں ہونے دیا۔ ہماری جیسی سینکڑوں ہی لڑکیاں محسری حدود میں قید سسک رہی ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سب کی سب مغل شاہی رواج پر اس کی آن کی خاطر جان تو دے دیں گی لیکن تمہارے جیسے انسان کے کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا ہرگز گوارا نہ کریں گی۔ ہم بے رحم نہیں لیکن عزت ہمارا ایمان ہے۔"

ظفر کا دل ٹوٹ گیا۔ "اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"کوئی حکم نہیں تم اپنی مرضی اور خواہش کے غلام ہو اپنے لئے جو مناسب سمجھو قدم اٹھاؤ تم سمجھے کیوں نہیں ہم تمہارے لئے رو سکتے ہیں تمہیں یاد کر سکتے ہیں مگر ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"چھوٹی بیگم صاحب!" ظفر کی آواز میں رعشہ تھا۔ "کیا میں اب تک فریب میں تھا؟"

"نہیں!" چھوٹی بیگم صاحب نے جواب دیا "جو کچھ ہوا سب کچھ حقیقت تھا یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی حقیقت ہے لیکن ہم دادا حضور کی عزت و آبرو کا سودا تمہارے ہاتھوں نہیں کر سکتے ہم مغل شہزادیوں کو رسوا ہرگز نہ ہونے دیں گے ہمیں اپنی آرزوؤں کا خون کرنا آتا ہے۔"

"میں نواب شائستہ خان کے پاس لئے چلتا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں باعزت طور پر آپس میں وابستہ کرا دیں گے۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے!" چھوٹی بیگم صاحب نے کہا۔ "نواب ہم دونوں کو ہلاک کرا دیں گے۔"

اس کے بعد وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ "اب ہم واپس کس طرح جائیں گے؟؟"

"چھوٹی بیگم صاحب!" وہ خورشد سے بولا "آپ مجھ سے جیسی قسم چاہیں لے لیں میں آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ پنجاب یا سرحد میں ہم دونوں یہیں کہیں روپوش ہو سکتے ہیں۔"

"تم احمق ہو، وہ چچا دارا شکوہ کی عملداری میں ہے!"

"گجرات نکل چلیں گے!"

"وہاں چچا مراد کی حکومت ہے!"

"اور دکن؟"

"وہاں چچا اورنگ زیب کا دخل ہے!"

"پھر بنگال کیسا ہے؟"

"وہاں میرے بابا جان کی حکومت ہے!"

"تب پھر جہاں کا آپ حکم دیں، میں تیار ہوں۔"

"تم احمق ہو اور یہ بھول جاتے ہو کہ مغلیہ سلطنت کی حدود نہایت وسیع ہیں انہیں عبور کرنا بہت دشوار ہے اور پھر اس طرح ہم تمہارے ساتھ کیوں جانے لگے۔"

اس دوران فضا میں کچھ روشنی سی پھیلنے لگی۔ تاریکی چھٹنے لگی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

چھوٹی بیگم صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "وہ آ گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ لوگ آ کر رہیں گے۔"

ظفر بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور بے تکلفی سے چھوٹی بیگم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"ہم اب بھی فرار ہو سکتے ہیں! چھوٹی بیگم صاحب مان جائیے میرے حال پر رحم کیجئے مجھے زندہ درگور نہ کیجئے۔ میرے ساتھ فرار ہو جائیے۔"

"فرار۔" اس نے جھٹک کر ہاتھ چھڑا لیا "ان کی مشعلوں نے ویرانے کو دن بنا دیا ہے۔ اور پھر اب تو ہم اپنے گھوڑوں تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔"

اب ٹاپوں کی آوازیں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ دونوں آپس میں ہم کلام ہو کر ایک دوسرے کی بات بھی نہ سن سکتے تھے۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازوں سے پورا ویرانہ گونج اٹھا۔

ظفر نے چھوٹی بیگم صاحب کو وہیں چھوڑا اور بے تحاشہ اپنے گھوڑے کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بالکل نہتا تھا اس کے ہتھیار گھوڑے پر رکھے ہوئے سامان کے ساتھ تھے۔

یہ چھوٹی بیگم صاحب کے لشکری تھے جو اس کی گمشدگی پر اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ظفر کے گھوڑوں نے ظفر کی موجودگی کی نشاندہی کر دی تھی۔ انہوں نے آتے ہی شکستہ قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ ظفر جب اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا تو لشکری اسے دیکھ چکے تھے ایک ناقابل فہم شور بلند ہوا۔ اور کئی سپاہی اس کی طرف لپکے۔ ظفر پلٹا اور شکستہ قلعے میں بچوں کی طرح چھپنا چاہا۔ چھوٹی بیگم صاحب کے لئے یہ لمحات ایسے تھے کہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ گئی تھی۔ اگر کسی طرح وہ قلعے کی چھت پہ پہنچ سکتی تو تعلی خودکشی کر لیتی۔

ظفر نے معمولی سی مزاحمت کی اس نے ایک سپاہی سے اس کی تلوار چھیننا چاہی لیکن ناکام رہا۔ غلطی سے دو سپاہی آپس میں لڑ گئے اور ایک نے دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ظفر نے زخمی کی تلوار اس سے چھین لی لیکن کسی وار سے پہلے ہی وہ خود زخمی ہو گیا۔

چھوٹی بیگم صاحب کی ایما پر لشکر نے اپنے سفر کا رخ بدل دیا اور یہ لوگ ایک بار پھر اکبرآباد واپس

ہوتے۔ چھوٹی بیگم صاحب زندگی سے عاجز آچکی تھی اور یہ آخری ذلت تو ایسی تھی کہ وہ خود اپنے دادا کے سامنے پہنچ کر اپنی سزا کی درخواست کرنے والی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس جرم ذلت و رسوائی میں زیادہ سے زیادہ اسے ہلاک کیا جا سکتا تھا اور وہ اس کے لئے بالکل تیار تھی۔

اس وقت اکبر آباد کی عجیب حالت تھی۔ شاہجہان کا ستارہ گردش میں تھا اور اقبالمندی اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اس کا چہیتا بیٹا دارا شکوہ اورنگ زیب سے شکست کھا جانے کے بعد پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اور شجاع کا میر جملہ تعاقب کر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور اس کا چھوٹا بھائی مُراد مل جل کر اکبر آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عملاً ابھی شہنشاہِ ہند شاہجہان عملاً قید ہو چکا تھا۔ اس کی حکومت قلعہ کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ محلسرا کی بیگمات شاہجہان کے پاس جاتیں اور اس کی دلجوئی کرتی رہتیں۔

جب انہیں شاہجہان کے رُو برُو پیش کیا گیا تو شاہجہان کے مزاج میں بڑی تبدیلی آچکی تھی، پوتی کے لئے شفقت اور ظفر کے لئے حیرت اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اپنی پوتی کی داستان سُنی، اس نے سب کچھ اپنے دادا کو سچ سچ بتا دیا تھا اور لطف یہ کہ شاہجہان نے اس پر یقین بھی کر لیا۔

اس نے ظفر سے دریافت کیا "تو تو ہلاک ہو چکا تھا، زندہ کس طرح بچا؟"

ظفر نے جواب دیا۔ "ہاں شہنشاہ نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا۔ لیکن خدا نے مجھے زندہ رکھا" شاہجہان ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا جو شہنشاہ کی حکم عدولی اور دغا فریب کے مرتکب ہوئے تھے۔ لیکن ظفر نے کسی کا نام نہیں بتلایا۔

شاہجہان نے لمحوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اسے پوست نوشی کی سزا دی جائے!"

مسلح تاتاری عورتوں کی نگرانی میں جب ظفر شاہجہان کے سامنے سے جا رہا تھا تو اس نے جاتے جاتے شہنشاہِ ہند کو نہایت اطمینان سے مخاطب کیا: "غالباً میں آخری شخص ہوں جسے جہاں پناہ بحیثیت شہنشاہِ ہند کسی سزا کا حکم دے رہے ہیں، اب میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

شاہجہان کچھ سہم گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ظفر کے الفاظ میں تائیدِ غیبی بھی شامل ہو۔

شاہجہان نے اپنی پوتی کو کوئی سزا نہ دی۔ اب وہ تھک چکا تھا۔ ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور اورنگ زیب نے میدانِ جنگ اور میدانِ سیاست میں اپنے جملہ حریفوں کو شکست دے دی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنے سالے نواب شائستہ خان کو ضرور کوئی سزا دیتا جس نے

ظفر کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔
اس نے اپنی پوتی کی باتوں کا یقین کر لیا۔ اس کی آغوش آہستہ آہستہ وا ہوئی اور چھوٹی بیگم صاحب پہلی بار اپنے دادا کی آغوش میں سما گئی۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ شاہجہاں محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ مجبور شہنشاہ کی رندھی ہوئی آواز بلند ہوئی "مت رو چھوٹی بیگم صاحب! ہمیں تم پر فخر ہے ہم سمجھتے ہیں تم نے شاہجہاں کی پوتی ہونے کا شاندار ثبوت دیا ہے۔ ہم تم سے خوش ہیں، بہت خوش، خاندان مغلیہ کی لڑکیاں اپنے سرکش اور طوفان خیز جذبات پر اسی طرح قابو پاتی رہی ہیں وہ ہمیشہ عظیم رہتی ہیں۔"
چھوٹی بیگم صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا "دادا حضور! ہمیں عزت اور حکومت کے سوا ملا ہی کیا ہے۔ بس یہی دو چیزیں تو ہیں جن کی ہم سب ہر قیمت پر حفاظت کر رہے ہیں۔"
"تو سچ کہتی ہے" شاہجہاں نے کہا "ان کی حفاظت ہم سب کا خاندانی اور ذاتی فرض ہے۔"
اور اس طرح ایک بار پھر چھوٹی بیگم صاحب کی بے آب دگیاہ جوانی کے صحرا میں تنہائی اور محرومیت کی باد صرصر چلنے لگی۔
محاذ کے بارے میں بڑی تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔
داراشکوہ گرفتار ہو گیا۔
چھوٹی بیگم صاحب کا باپ شجاع ڈھاکہ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اورنگ زیب کا میر جملہ اس کے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔
پھر خبر آئی مراد سے بھی ان بن ہو گئی اور دھوکے سے مراد بھی گرفتار ہو گیا۔
اور پھر یہ خبر بھی آئی کہ اس کا باپ شجاع اپنے اہل و عیال سمیت لاپتا ہو چکا ہے۔ چھوٹی بیگم صاحب کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ اب وہ انہیں شاید کبھی بھی نہ دیکھ سکے گی۔ انہی غم کے پہاڑوں میں کہیں ظفر کا غم بھی موجود تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ ظفر کا کیا حشر ہوا؟
ایک دن چھوٹی بیگم صاحب بھی اپنے دادا کی خدمت میں حاضر تھی۔ اس نے دیکھا شاہجہاں میں وہ پہلے جیسا دم خم نہیں ہے بادشاہ مضمحل اداس مایوس اور دل گرفتہ سا ہے۔ اس نے اپنی پوتی کو دیکھا اور کوئی خاص توجہ دیے بغیر سامنے پھیلے ہوئے کاغذات دیکھتا رہا۔ بادشاہ سے کچھ دور اس کی بڑی بیٹی جہاں آرا سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ دوسرے کمرے سے اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ محمد سلطان

نمودار ہوا۔ وہ مسلح تھا، تلوار کمر سے لٹک رہی تھی۔ اور خود سر پر تھا۔ کپڑوں کے نیچے زرہ بکتر تھی۔ وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہِ غلط انداز سے چھوٹی بیگم صاحب کو دیکھا اور شاہجہاں سے مخاطب ہوا۔ "کیا شہنشاہ نے اس فہرست کو ملاحظہ فرما لیا جس کی رُو سے ہمیں اپنے پدر بزرگوار اورنگزیب کے حق میں قلعے کے سازو سامان کو اپنی تحویل میں لینا ہے؟"

شاہجہاں نے خوف و ہراس سے اپنے پوتے کو دیکھا اس وقت اس کا اضطراب اور بے بسی قابل رحم تھی۔ شاہجہاں نے نہایت دردمندی سے شہزادے محمد سلطان سے مخاطب کرنا چاہا۔

"عزیزم! تم میرے پوتے ہو اور میری شہنشاہی نظریں تم میں وہ سارے اوصاف دیکھ رہی ہیں جو ایک عظیم القدر فرماں رواں میں ہونی چاہئیں، میں تمہیں شہنشاہ ہند بننے کی پیش کش کرتا ہوں۔"

شہزادہ محمد سلطان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے شاہجہاں کے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور قبلہ دادا جان ان کاغذات پر دستخط فرما کر مجھے مرحمت فرما دیں۔ مستقبل کا شہنشاہ ہند (اورنگ زیب) میرا منتظر ہے۔"

شاہجہاں نے ہمت نہیں ہاری، پورے اعتماد سے اپنی پیش کش کی مزید وضاحت کی۔

"شہزادے!" اس کی آواز میں بلا کا استحکام تھا۔ "میں تم سے تخت کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قرآن پاک میرے اور تمہارے درمیان ہے اگر تم اس وقت مجھ سے ایمانداری برتو، تو میں تمہیں بادشاہ بنا دیتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے شہزادہ محمد سلطان کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ شہزادہ کس حد تک مسخر ہو چکا ہے۔ کچھ سکوت کے بعد شاہجہاں کی آواز پھر سنائی دی۔ "شہزادے! اس موقعے کو غنیمت جانو اور ہاتھ سے مت جانے دو۔ یہاں سے باہر جاؤ اور اپنے دادا کو قلعے کی حدود سے باہر نکل جانے دو۔ شہزادے! یاد رکھو اس سے تمہیں دو فائدے حاصل ہوں گے۔ دنیا میں ہمیشہ کے لئے نیک نامی اور ہندوستان کی شہنشاہیت اور آخرت کا ثواب۔"

لیکن نوجوان شہزادہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے اس بوڑھے شہنشاہ کو قلعے کے باہر نکل جانے دیا تو وہ فوراً اورنگ زیب کے مقابلے میں لشکر لے کر آ جائے گا اور اگر اس نے اورنگزیب پر قابو پا لیا تو اسے قتل اور شہزادے کو زندگی بھر کے لئے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے گا۔

شہزادے نے سادہ سا جواب دیا۔ "مجھے والد بزرگوار کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے قلعے کے جملہ سازو سامان کی فہرست اور کنجیاں لے کر فوراً ان کی خدمت میں واپس جاؤں کیونکہ والد

بزرگوار خود بھی دادا حضور کی قدم بوسی کے از حد مشتاق ہیں۔"

شاہجہاں نے بدرجۂ مجبوری جملہ خزینیں شہزادے کے حوالے کر دیں اور کنجیوں کی سپردگی کے معاملے کو دو دن بعد پر ٹال دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے جب شہزادہ اس کی پیش کش پر سنجیدگی سے غور کرے گا تو اس کی طبیعت اس کو مان لینے پر مائل ہو جائے گی۔

اور اس دن جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹی بیگم صاحب نے شاید زندگی میں پہلی بار بوڑھے شہنشاہ کو رو دینے کی حد تک مغموم اور افسردہ دیکھا۔ اس نے ایک نظر اپنی پوتی پر ڈالی اور پھر ایک خواص کو حکم دیا "ہمارے تمام قیدیوں اور نمک حرام ظفر کو ہمارے روبرو حاضر کیا جائے۔" اس حکم پر چھوٹی بیگم صاحب کا دل دھڑکنے لگا۔

خواص باہر چلی گئی۔ شاہجہاں نے زیر لب بڑبڑانا شروع کیا۔ "ہمیں اطمینان نہیں ہے کہ اورنگ زیب میرے قیدیوں سے کیسا سلوک کرے گا۔ اور ہم اپنا اقتدار اس کے حوالے کر دینے پر مجبور ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم بعض اہم قیدیوں کی زندگی کے فیصلے خود ہی کر دیں۔"

شاہجہاں نے اپنی مغموم اور اداس پوتی کو دیکھا اس کے سینے میں اب بھی ایک شہنشاہ کا پتھر صفت دل دھڑک رہا تھا وہ اب بھی ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔

"کیا تم رو رہی ہو؟ تم اداس کیوں ہو شہزادیاں روتی نہیں۔"

"کچھ نہیں دادا حضور!" چھوٹی بیگم صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔

شاہجہاں کا گویا دماغی توازن جاتا رہا۔ اس نے سرزنش کی "ہم محض تمہارے دادا ہی نہیں، ہندوستان کے شہنشاہ بھی ہیں۔ اور ہمارے زوال کے بعد بھی تم ایک عظیم شہزادی رہو گی۔ تمہاری رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا ہے۔"

چھوٹی بیگم صاحب نے بے بسی سے عرض کیا۔ "جہاں پناہ، قبلۂ عالم!"

شاہجہاں نے دریافت کیا۔ "کیا تم اب بھی اس نمک حرام سے متاثر ہو؟"

چھوٹی بیگم صاحب نے جبر یہ نفی میں گردن ہلا دی۔ "نہیں۔"

"ہاں تم مغل شہزادی ہو، خانوادہ تیمور کی معزز ترین شہزادی، تم ایک نمک حرام معمولی طبیب سے کس طرح متاثر ہو سکتی ہو۔ تم ایک شہزادی ہو، شہزادیاں غالب آتی ہیں، مغلوب نہیں ہوتیں۔"

پھر اسے اطلاع دی گئی کہ ظفر حاضر ہے۔ شہنشاہ کے اشارے پر اسے چھوٹی بیگم صاحب کے سامنے لایا گیا وہ گھبرا گئی اور خوف و دہشت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک

نحیف ولاغر اور ماؤف الدماغ ڈھانچا کھڑا تھا۔ چھوٹی بیگم صاحب سمجھ گئی کہ اس کا یہ حال صبح دوپہر شام پوست کے بڑے بڑے پیالوں کے پلائے جانے سے ہوا ہوگا۔ اور یہ ایک بدترین سزا تھی جو عملسرا کے قیدیوں کو دی جاتی تھی کھانا کم پوست کا پانی زیادہ۔

چھوٹی بیگم صاحب کو گھن سی آگئی اور ظفر میں اب اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ چھوٹی بیگم صاحب کو ایک نظر دیکھ ہی سکتا۔ شہزادی کا عشق اس کے سامنے تھا۔

پھر اس نے حکم دیا: "اس نمک حرام، دشمن عزت و ناموس کو کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے۔"

اور غالباً بحیثیت شہنشاہِ ہندوستان شاہجہاں کا یہ آخری حکم تھا۔

قلعے کی کنجیاں شہزادے محمد سلطان کے حوالے کر دی گئیں اور اورنگ زیب کے معتمد خواجہ سرا اعتبار خان کو قلعہ دار بنا دیا گیا جس نے شاہجہاں، جہاں آرا اور دوسری بیگمات کو ان کے کمروں میں نظر بند کر دیا۔ قلعے کا پرانا عملہ ہٹا دیا گیا۔ نیا متعین کیا گیا۔ قلعے کے بعض دروازے چن دیئے گئے اور پورے ہندوستان پر اورنگ زیب کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔

داراشکوہ کو سزائے موت دے دی گئی۔ مراد بھی ہلاک ہوا۔ شجاع کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے کنبے سمیت کہاں روپوش ہو گیا۔

شاہجہاں قلعے کے جس حصے میں نظر بندی کی زندگی گزار رہا تھا اس کے دریچے سے سامنے جمنا کے دوسرے کنارے پر تاج محل کھڑا حسرت وہاں سے اسے دیکھتا رہتا۔ تاج محل اس کا منتظر تھا۔ جہاں آرا بیگم دن رات بوڑھے باپ کی خدمت میں موجود خدمت گزاری میں لگی رہتی۔

ان واقعات کو کئی برس گزر گئے اور شہنشاہ کا پرانا مرض حبس بول پھر عود کر آیا۔ اورنگ زیب کے حکم پر شاہی اطباء نے اس کا علاج شروع کیا لیکن مرض روز بروز بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ جب زندگی کی کوئی آس نہ رہی تو عیادت کرنے والے آنے جانے لگے۔ اب شاہجہاں شہنشاہِ ہند نہیں کسی کا باپ کسی کا چچا کسی کا ماموں اور کسی کا دادا تھا اور کنبے کے سارے ہی لوگ اس کے اس پاس آتے جاتے رہتے۔

بارش کا زوردار چھینٹا پڑ چکا تھا اور ہوائیں شراب میں ڈوبی ہوئی چل رہی تھیں۔ شاہجہاں کو بخار آ گیا۔ عیادت کرنے والوں میں چھوٹی بیگم صاحب بھی شامل تھی وہ اپنے دادا کی پائنتی سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھی اور دریافت کیا۔ "دادا حضور کیسی طبیعت ہے؟"

شاہجہاں نے اس مظلوم عورت کو دیکھا جو کبھی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ اب وہ ایک اداس عورت

تھی شاہجہاں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔

"یہاں آؤ چھوٹی بیگم صاحب! ہمارے قریب ہمارے سینے سے لگ جاؤ، تم دُور کیوں بیٹھی ہو"

چھوٹی بیگم صاحب اپنے دادا جان کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا بوڑھے شاہجہاں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"بیٹی چھوٹی بیگم صاحب! تم کیسی ہو! اچھی تو ہو!"

چھوٹی بیگم صاحب نے گلوگرفتہ آواز میں کہا: "اچھی ہوں دادا جان!"

"خوش تو ہو؟"

"ہاں دادا جان! میں بہت خوش ہوں" یہ کہتے کہتے اس کا حلق خشک ہو گیا اور بولنے کا یارا نہ رہا شاہجہاں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو تم خوش بالکل نہیں ہو" پھر اس نے جہاں آرا کی طرف دیکھا "یہاں خوش کوئی نہیں ہے۔ کیوں کہ بادشاہ دوسروں کی خوشی کی کبھی پروا نہیں کرتے۔ ہم بادشاہ تھے تو تم لوگ ہماری رعایا تھیں، اس وقت ہم صرف بادشاہ تھے۔ شہنشاہ ہند اور شہنشاہ صرف شہنشاہ ہوتا ہے وہ کسی کا باپ دادا ماموں یا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہم بھی پہلے صرف بادشاہ تھے!"

اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چھوٹی بیگم صاحب کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

"دادا جان! پچھلی باتیں نہ دہرایئے!" چھوٹی بیگم صاحب نے آہستہ سے عرض کیا۔

"تو سچ ہی کہتی ہے لیکن آج ہم سوچتے ہیں کہ اگر ظفر زندہ ہوتا تو وہ شاید ہمارے جان لیوا مرض حبس بول کا کوئی علاج کر سکتا۔ ہمیں کسی دانا کا قول یاد آرہا ہے، غربت عشق کو راس نہیں آتی غربت عشق کی ہلاکت ہے اور ظفر شاید کوئی بُرا آدمی نہ تھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

اور چھوٹی بیگم صاحب نے محسوس کیا کہ شہنشاہ کی خودغرضی اب بھی اس میں موجود ہے۔

چھوٹی بیگم صاحب نے افسردگی سے کہا: "دادا جان! مرے ہوؤں کا ذکر نہ کیجیے"

شاہجہاں نے اسے اپنے سینے سے الگ کیا۔ "تو ٹھیک ہی کہتی ہے۔ مرے ہوؤں کا ذکر ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ جب ہم مر جائیں گے تو لوگ ہمارا ذکر بھی نہ کریں گے!"

اس کے بعد اس کی نظریں خودبخود تاج محل کی طرف اٹھ گئیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تاج محل کے مینار اشارے کر کر کے اسے اپنے پاس بلا رہے ہوں۔

کشمیر کی کلی

سرزمینِ لکھنؤ کی رومان پرور فضا میں کشمیر کی ایک کلی جا پھنسی، اور پھر دلچسپ کہانیوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اس عہد کے نواب کی داستانِ ہوس و عشرت، محلاتی رنگینیوں کا حسین مرقع، نوابی فطرت اور اس کے عہد کی ایک ایسی کہانی، جس میں کیف و سرور کے ساتھ ہی زوال اور دھ کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

شازی

کو لکھنؤ بالکل پسند نہ آیا۔ اس نے یہی خیال کشمیر سے مہینوں سفر کی صعوبتیں اور دشواریاں اس توقع میں جھیلی تھیں کہ اس کے خیال میں پورب بھی اس کے وطن کشمیر کی طرح حسین اور دلکش ہوگی لیکن جب وہ دریائے راوی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گنگا جمنا کے دوآبے میں داخل ہوئی تو اسے یہاں کی ہر چیز اپنے وطن سے مختلف اور تکلیف دہ محسوس ہوئی۔ یہاں نہ تو پہاڑ تھے، نہ دو رنگی گھاٹیاں نہ سرسبز وادیاں، گنگناتے چشمے، نہ خنک ہوائیں اور پر دور بلندی پر دھوپ میں چمکتے ہوئے برف کے گلیشیر انواع و اقسام کے پھلوں سے لدے جھکتے درخت، طرح طرح کے پھولوں سے آراستہ قطعات جنت کی ساری نشانیاں تو وہ اپنے وطن میں چھوڑ آئی تھی، اودھ میں ان کے بدلے اسے کیا ملا؟ خاک دھول، وضع لوگ، سانولے کالے گورے، گندمی کون سا رنگ تھا جو یہاں والوں میں نہ تھا۔ یہاں کی ہر چیز میں انتشار اور بدنظمی پائی جاتی تھی، یہاں چنار کی جگہ املی، پیپل، جامن اور آم کے بڑے بڑے درخت ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، شازی کی طبیعت میں لالچ نہ ہوتا تو وہ ایک پل بھی لکھنؤ میں نہ ٹھہرتی۔

اسے اس کا استاد میر فدو بڑے سبز باغ دکھا کے لکھنؤ لایا تھا۔ میر فدو اس کا استاد بھی تھا اور ایک طرح سے باپ بھی، کیونکہ شازی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا میر فدو ہی اس کا سب کچھ تھا، حالانکہ بعض لوگوں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میر فدو اسے بچپنے ہی میں کہیں سے اغوا کر لایا تھا اور نہایت محنت اور توجہ سے اس کی پرورش کی تھی۔ میر فدو ناچ گانے کا بے مثل استاد تھا چنانچہ شازی نے یہ دونوں فن اسی سے حاصل کیے تھے۔ طبیعت میں فطری طور پر فنون لطیفہ کا مذاق موجود تھا اس لیے وہ رقص و موسیقی میں بڑی جلدی بہت اچھی رقاصہ اور مغنیہ بن گئی۔ جب وہ گاتی تو طبیعت میں ایک لہر سی اٹھتی اور اس لہر میں ایک نشہ سا ہوتا جس کی سرخوشی اس کے سارے وجود کو سرشار اور پرخمار کر دیتی۔ اسی طرح جب وہ محو رقص ہوتی تو اس کا ہر ہر عضو تھرکنے پھڑکنے لگتا۔ گھنگھروؤں کی آواز پہ پیروں میں حرکت، دل میں ولولے، طبیعت میں جوش و سرور اور خون میں تیزی اور گرمی پیدا ہو جاتی۔ ان دونوں کمالوں کے سوا اسے حسن بھی ایسا عطا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑا سرکش بھی اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اپنی گردن جھکا دینے پر مجبور ہو جاتا۔

میر فدو نے جب یہ دیکھا کہ کشمیر میں شازی کے صحیح قدردان کا ملنا ناممکن ہے تو اس نے ایک دور دراز خطے اودھ کا رخ کیا۔ اودھ کے نوابوں کی رنگینی طبع، عیش پرستی اور داد و دہش کا دور دور شہرہ تھا اس نے سن رکھا تھا کہ یہاں کا نواب عقل کا اندھا لیکن گانٹھ کا پورا ہوتا ہے۔ بخشش اور انعام میں جتنی کشادہ دلی یہاں پائی جاتی تھی، پورے ہندوستان میں اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی تھی۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد دربار اودھ میں رسائی ایک دشوار مسئلہ تھا۔ ہم پیشہ حضرات میں ایک قسم کی جلن

پائی جاتی تھی اور حسد اور رقابت میں وہ ایسی تدبیریں کرتے رہتے کہ شازی نواب نصیر الدین حیدر تک نہ پہنچ سکے لیکن میر فدو ہار ماننے والا کب تھا۔ شازی کے حسن اور رقص و موسیقی کا شہرہ خود بخود ہو رہا تھا ایک دن شہر کوتوال بختاور سنگھ کے کانوں میں بھی یہ بات پہنچی۔ رات کے اندھیرے میں لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا بختاور سنگھ شازی کے در پر پہنچ گیا۔ اگر لکھنؤ کی جگہ یہ کوئی اور شہر ہوتا تو بختاور سنگھ ذرا بھی خوف نہ کھاتا اور بے دھڑک دندناتے ہوئے شازی کے پاس پہنچ جاتا لیکن یہ لکھنؤ تھا۔ اودھ کا دارالخلافہ۔ اودھ کا شوقین مزاج اور حسن پرست نواب نصیر الدین حیدر اسی شہر میں رہتا تھا اور یہ بات نواب کے لئے بے حد ہتک آمیز اور افسوسناک تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے شازی جیسی حسین اور باکمال رقاصہ اور مغنیہ کسی دوسرے شخص کی آغوش کی زینت بنے۔ ریاست کے ہر شخص کی ذمہ داری تھی کہ وہ جب اور جہاں کہیں بھی کوئی حسین اور باکمال عورت کو دیکھے تو اس کی اطلاع نواب تک ضرور پہنچائے ورنہ خیانت مجرمانہ کا مجرم ٹھہرتا اور کسی خوفناک سزا کا مستحق قرار پاتا۔

شازی جس مکان میں ٹھہری تھی وہ کچھ زیادہ شاندار نہ تھا اس کے اوپری حصے میں صاحب خانہ کا خاندان رہتا تھا جو انگریزی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھا اور اس کی زیادہ تر رہائش کانپور میں رہتی تھی کبھی کبھار ایک آدھ ماہ کے لئے آتا اور پھر واپس چلا جاتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کمپنی اور نواب اودھ کے مابین یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ نواب اودھ فوج نہیں رکھ سکے گا۔

معمولی قسم کے جھاڑ فانوس روشن تھے ان کی روشنی میں جب بختاور سنگھ اپنے مخصوص لباس میں پستول لگائے میر فدو کی اجازت سے اندر داخل ہوا تو شازی خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی بچھو کے ڈنک کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں کچھ زیادہ ہی خوف زدہ کر رہی تھیں۔ موقع شناس میر فدو ذرا بھی خائف نہ تھا اسے خوب اندازہ تھا کہ خوش قسمتی سے خدا نے خود ہی ایک ایسے آدمی کو اس کے پاس بھیج دیا ہے جو اس کی شازی کو بآسانی نواب اودھ کی خدمت میں پہنچا سکتا تھا۔ بختاور سنگھ کو میر فدو کی ذہانت یا چالاکی کا کوئی علم نہ تھا۔

جب وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے نوابوں کی طرح شازی کے روبرو بیٹھا اور فانوس کی روشنی میں اس نے شازی کے قیامت خیز حسن پر نظر ڈالی تو وہ کہیں کا بھی نہ رہا بس دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا شازی کے کالے کالے گھونگریالے بالوں کی موٹی چوٹی جس میں سرخ موباف پڑا ہوا تھا۔ پشت پر پڑی ہوئی تھی آب رواں کا باریک دوپٹہ سر پر پڑا تھا اور اس نے دونوں شانوں کو کچھ اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ بازو پھر بھی کھلے رہتے تھے اور یہ بذات خود اتنا باریک تھا کہ اندر سے نظر آنے والی ہر شے دلکشی اور حسن میں دوبالا ہو گئی تھی۔ زرد چمکدار ریشمی اطلس کا پاجامہ اس کے سڈول کولہے پر ایسی بہار دکھا رہا تھا کہ بختاور سنگھ کی کوتوالی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ یہاں داخل ہوا تھا تو اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے عہدے کے دھونس پٹّے سے کام نکال کے اپنی راہ لے گا

لیکن جب شازی کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ معاملہ صرف چند لمحوں کا ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس کا مستقل اسیر ہو چکا ہے
بجاور سنگھ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح شازی کو مستقل ہی اپنے گھر میں ڈال لے لیکن مصیبت
یہ تھی کہ شازی مسلمان تھی اور بجاور سنگھ ہندو۔

میر فدو نے نہایت ادب سے اس کے سامنے مجرا ادا کیا اور شازی خاموش میں گھڑیاں لگا لائی۔
بجاور سنگھ حقے کا کش لے کر دھواں کو چھوڑتا ہوا میر فدو سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں کشمیر سے یہاں آئے
کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

میر فدو نے ہاتھ باندھ کے عرض کیا۔ "بندہ پرور! صرف ایک ہفتہ!"

"یہ مکان کرائے کا ہے؟"

"جی بندہ پرور!"

بجاور سنگھ نے شازی کو لگاوٹ کی نظروں سے دیکھا اور میر فدو سے مخاطب ہوا۔ "اب کیا ارادے ہیں؟"

"میر فدو نے دعا کا تیر چلایا۔ "غریب پرور! کیا غریب اور کیا غریب کا ارادہ، فدوی نے دربار اودھ کی
بڑی تعریفیں سن رکھی تھیں، معلوم ہوا تھا کہ اودھ کا نواب حسن، فن اور ہنر کا سچا قدردان ہے اور ان چیزوں کی صحیح
قیمت لگاتا ہے بس اسی خوش خیالی اور خوش فہمی میں بندہ لکھنؤ وارد ہوا تھا سو اب یہ فکر کھاتے جا رہی ہے کہ نواب
اودھ کی پابوسی کس طرح حاصل ہو؟"

بجاور سنگھ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر مردہ سی آواز میں بولا۔ "نواب اودھ کی سرکار
بہت بڑی چیز ہے وہاں تک ہر کس و ناکس کی رسائی بڑی دشوار بات ہے ظاہر ہے کہ تمہارے فن اور ہنر کی جو قیمت
قبلہ نواب صاحب ادا کریں گے ہم تابعداروں کی کیا حیثیت جو اس کا تصور بھی اپنے دل میں لائیں۔ لیکن یہ ضرور ہے
کہ ہم بھی چونکہ اسی دربار سے وابستہ ہیں اس لئے حسن، فن اور ہنر کی پرکھ ہمیں بھی آتی ہے اور ان کی صحیح قدر و قیمت
سے ہم ہندوستان دربار بھی کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں گو کہ ہم کسی شے کی وہ قیمت نہیں ادا کر سکتے جس کی نواب اودھ
سے توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی قریب قریب کچھ کمی کے ساتھ تو قیمت ادا ہی کر سکتے ہیں!"

میر فدو ایک ہی کائیاں تھا، کہنے لگا۔ "قبلہ! اگر راگ رنگ سے دل بہلانا مقصود ہے تو شازی کو حکم دیجئے۔
آپ کی طبیعت خوش کر دے گی، رہا اس کے حسن، ہنر اور فن کی قیمت کا معاملہ تو غریب پرور! بندہ اپنے طور پر یہ چاہتا
ہے کہ یہ ڈیرے مثال قبلہ نواب نصیر الدین حیدر تک پہنچ جاتے بس وہ شرفِ باریابی ہی اگر بخش دیں گے تو میں سمجھوں
گا کہ میری محنتوں اور شازی کے بے مثل حسن و ہنر کی قیمت مل گئی!"

بجاور سنگھ چکرا رہا تھا، یہ لکھنؤ، خاص لکھنؤ کا معاملہ تھا اگر کسی طرح یہ خبر نواب تک پہنچ جائے تو اس کی زندگی

محال ہو جائے گی۔ بمشکل صبر و ضبط کے گھونٹ اتار لئے۔ شازی معصومیت سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

بختاور سنگھ نے افسر لیگا سے حکم دیا۔ "موسیقی چھیڑی جائے!"

میر فدو ذرا سی دیر کے لئے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ سنگت والوں کو بلانے گیا تھا جو مکان کی باہری کوٹھری میں ٹھہرے ہوتے تھے۔ ذرا تخلیہ جو ملا تو بختاور سنگھ نے معصوم صورت بھولی بھالی شازی پر پہلا جال پھینکا۔ "تمہارا نام کیا ہے بچہ؟"

"شازی!"

"نام تو بڑا پیارا ہے!"

"شکریہ۔ نوازش!"

"سنو، کیا تم کو اپنی اس زندگی سے گھن نہیں آتی؟"

"کیسی گھن؟" شازی نے بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھ کر بھولپن سے سوال کیا۔

"یہی کہ تمہیں مالِ تجارت کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔" بختاور سنگھ نے ابھی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ میر فدو کے ساتھ کئی آدمیوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ بختاور سنگھ نے جلدی جلدی لیکن آہستہ سے کہا۔ "شازی، میں تم سے پھر ملوں گا اور تفصیل سے باتیں کروں گا۔"

شازی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میر فدو کے ساتھ سنگت کے کئی آدمی مختلف سازوں کو سنبھالے ہوئے شازی کے اردگرد آ کر بیٹھ گئے۔ میر فدو نے بختاور سنگھ کا ان سے تعارف کرایا۔ کوتوال صاحب کو جھک جھک کر کورنش و تسلیمات بجا لائی گئی۔

سازوں پر انگلیاں، انگوٹھے اور نغمے کی چوٹیں پڑیں، شازی نے آہستہ سے منہ کھولا اور ذرا سی دیر میں ایک سماں بندھ گیا۔ کوتوال صاحب کے قلب و جگر میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہوش و خرد ساز و آواز کے نثار ہو گئے۔ ایک ایک مصرعے اور ایک ایک شعر پر بختاور سنگھ کی وہ کیفیت ہوئی جو محفلِ سماع میں اللہ والوں کی ہوا کرتی ہے۔

یہ محفل ایک گھنٹے جمی رہی اور ساز و آواز کے جادو جگاتے جاتے رہے اور سے صاحبِ خانہ کے بیوی بچے بھی مزہ لے رہے تھے وہ اپنی چھت کے کناروں پر جھکے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اختتام پر خوش ہو کے بختاور سنگھ نے شازی کو بیس اشرفیاں پیش کیں۔ ان اشرفیاں وصول کر کے میر فدو کی طرف بڑھا دیں اور مسکراتے ہوتے شکریے کے طور پر کئی تسلیمات بجا لائی۔

اس محفل سے اُٹھنے کو جی تو نہ چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ یہ خبر کہیں کسی طرح نواب صاحب تک نہ پہنچ جائے اٹھا اور

اور اس طرح اٹھا۔ گویا اپنا سب کچھ اسی محفل میں شازی کے پاس چھوڑ کے اٹھ رہا ہو، جاتے جاتے کئی بار مڑ کر اور شازی کو دیکھا۔ شازی نے یہ ستم کیا کہ جب بھی نظریں ملیں مسکرادی اور پھر اس طرح دیکھا گویا کہہ رہی ہو، "کوتوال صاحب! پھر تشریف ضرور لائیے گا!"

اور کوتوال جیسا جہاں دیدہ اور تجربے کار بھی اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ اس کی جسمانی وجاہت، اعلیٰ منصب، شاندار مونچھیں اور بیس اشرفیوں کی بخشش نے ضرور شازی کے دل کو جیت لیا ہے۔ دل میں سوچا کہ "چلو جی اگر میر فدو مخالفت بھی کرے گا تو ہمارا کیا لے گا۔ اگر شازی کے دل کو جیت لیا جائے تو پھر شہر کا مسئلہ ہی کیا رہ جائے گا۔" اور شازی کی لگاوٹ کی مسکراہٹ اور نظروں سے ٹپکنے والا دوبارہ بلانے کا پیغام، یہ دونوں ایسے اشارے تھے کہ بجاور سنگھ نے اپنی دانست میں بازی جیت لی تھی۔

بجاور سنگھ کے چلے جانے کے بعد میر فدو کا موڈ ہی بگڑ گیا۔ خوش اخلاقی اور تری کے وہ آثار جو اس کے چہرے اور اس کی ذرا ذرا سی حرکت سے ظاہر ہو رہے تھے ایک دم زائل ہو گئے اور اس کے چہرے پر درشتی اور نفرت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے سازندوں کو واپس جانے کا حکم دیا جو فوراً ہی چلے گئے۔ شازی اپنی چوٹی سے کھیل رہی تھی، پہلے بالوں پر انگلیاں پھیرتی رہی، پھر چوٹی کے موباف کی ڈھیلی بندش کو سخت کرنے لگی، وہ سوچ رہی تھی کہ بجاور سنگھ آدمی کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن چند دنوں تک کے لئے اس کی قربت اور رفاقت بری نہیں ہو سکتی، اس نے صرف ایک گھنٹے کی تفریح کی قیمت بیس اشرفیوں سے ادا کر دی تھی، شازی سمجھتی تھی کہ اس کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے، اسے بجاور سنگھ کی بچھو کی دم جیسی مونچھ بڑی دلچسپ لگی تھی اس میں اگر کوئی عیب شازی کے نزدیک تھا تو یہ تھا کہ وہ ہندو تھا بس یہی بات اس کے لئے تکلیف دہ یا ناقابلِ برداشت تھی۔

وہ انہی خیالات میں گم تھی اور میر فدو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور غور و فکر سے اس کے دل میں اترا چلا جا رہا تھا۔ یکایک اس کی اشرفیوں والی مٹھی اوپر اٹھی اور اس نے پوری قوت سے غصے کے ساتھ انہیں گاؤ تکیے پر دے مارا، تیز جھناکے کی آواز پر شازی بھی چونک پڑی۔

میر فدو غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ "قدر ناشناس! ہندو، مشرک کی اولاد، کوتوالی کے نشے میں بیس اشرفیاں دے کر احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس نے میری شازی کی آواز اور فن کی بڑی بھاری قیمت ادا کر دی ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اگر یہی ایک گھنٹہ نواب نصیر الدین حیدر کی خدمت عالی میں صرف کیا جاتا تو وہاں سے کم از کم ایک ہزار اشرفیاں ضرور ملتیں۔" اس کے بعد اچانک شازی کی طرف گھوم گیا۔ "او شازی! میری بات سن، یہ کل پھر آئے گا جیسے ہی آئے چپ چاپ اندر چلی جانا اور سر میں رومال باندھ کر لیٹ رہنا، گویا تیرے سر میں

سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بنیا پھر کبھی بھی یہاں آئے۔"
شازی نے دبے لفظوں میں کرتار کی وکالت کی اور بولی۔" ایک گھنٹے کی بیس اشرفیاں، یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے۔"
میر فدو اور سیاگ ہو گیا، وہ گرجا۔" تجربہ میرا زیادہ ہے یا تیرا؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تیری قیمت کیا ہے یہ بنیے کی اولاد کیا تیری قیمت لگائے گا۔"
شازی چپ ہو رہی۔ میر فدو کچھ دم لے کر بولا۔" اور پھر تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ تو مسلمان ہے اور بجادر سنگھ ہندو، آخر قومی غیرت بھی تو کوئی چیز ہے!"
شازی کو اس کی باتیں سخت ناگوار گزر رہی تھیں جل کر بولی۔" گستاخی معاف! اگر ہم دکان کھول کے تاجر بن کے بیٹھے ہیں تو ہمیں اس کی فکر بھی نہیں کرنی چاہیے کہ گاہک ہندو ہے یا مسلمان۔ دکانداری میں تو ہر مذہب و ملت کے گاہک آئیں گے۔"
میر فدو نے مشتعل ہو کے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اوپر صاحب خانہ کی بیوی بچے بھی ان کی باتیں سن اور دیکھ رہے ہیں بغیر مارے ہی ہاتھ نیچے گرا دیا اور دانت کٹکٹا کر بولا۔
"بہتر ہے اگر تو یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ تیرے لیے یہ کرتار بہت اچھا آدمی ہے تو اب جب آئے تو اس کا دامن پکڑ کے اس کے گھر چلی جائیو، جہاں اس کی ایک بیوی، بہت سارے بچے اور کئی داشتائیں تیرا شاندار استقبال کریں گی۔"
شازی روہانسی ہو گئی، کہنے لگی۔" آپ تو خواہ مخواہ مشتعل ہو رہے ہیں، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کرتار کے بچے سے میں ذرا بھی متاثر نہیں۔ مجھے تو اس کے سراپے اور مونچھوں پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔"
میر فدو کی طبیعت ذرا ٹھکانے آئی۔" شازی! ہم تیرے دشمن نہیں ہیں!" وہ دھیرے دھیرے سمجھانے کے انداز میں بولا۔" ہم نے تیری تعلیم و تربیت پر کیسی کچھ محنت کی ہے اور کتنا پیسہ خرچ کیا ہے۔ ہم نے اپنے اس پیشے میں ایک دنیا دیکھی ہے اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تیرے حسن اور ہنر کی اصل قیمت کیا ہے؟ اگر تو نے ہمارا کہا مانا اور ہمارے مشوروں پر عمل کیا تو میں تجھے یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس شہر لکھنؤ میں کثیر نقدی اور جیار ساز و سامان کے علاوہ کئی شاندار حویلیاں تیری ملکیت میں ہوں گی اور کوئی عجب نہیں کہ تو شازی سے کوئی "بیگم" یا "محل" بن جائے اس وقت ہم، محنتوں کا کچھ صلہ پا لیں گے اور تیرے زیر سایہ رہ کے زندگی کے آخری دن گزار دیں گے۔"
میر فدو کی باتوں کا اس پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے سوچا اب کچھ بھی ہو، بجادر سنگھ کیسے ہی سبز باغ

کیوں نہ دکھائے، وہ اس کی باتوں میں نہیں آئے گی اور بے مہری اور کج روی کا اظہار کرے گی لیکن جب وہ یہ سب سوچ رہی تھی اسی عالم میں میر فدو کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا: "لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تو بجاور سنگھ کو بالکل نظر انداز ہی کر دے۔ میرا ان تمام باتوں سے مقصد یہ تھا کہ کہیں تو اس چالاک اور عیار آدمی کی باتوں میں نہ آ جائے۔ اگر تو میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے تو اب جب بھی بجاور سنگھ آئے تو خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرنا، بات بات پہ ناز و ادا سے لگاوٹ کا اظہار کرنا اور اپنی ان باتوں کی اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کرنا۔" پھر گاؤ تکیے کی طرف بڑھا اور اشرفیاں سمیٹتا ہوا بولا: "میرا خیال ہے کہ تو میری بات کو اب اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی جیسا کہ تو نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ ہم لوگ تو ناچنے گانے والے لوگ ہیں ہمیں اپنے نفع سے کام ہے کون کیا کرتا ہے، ہندو ہے یا مسلمان ہمیں واقعی ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

اس نے ساری ہی اشرفیاں چن لیں، اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کے نہایت شفقت سے شازی کے سر پہ ہاتھ پھیرا، وہ میر فدو کے سینے سے لگ گئی وہ اس کی پشت آہستہ آہستہ تھپتھپاتا رہا۔

کئی دن گزر گئے لیکن بجاور سنگھ پھر نہ آیا۔ شازی اور میر فدو دونوں ہی اس کے منتظر تھے ان کا خیال تھا جب تک نواب اودھ کے دربار میں رسائی نہیں ہوتی، اس قسم کے قدردان بہت ضروری ہیں میر فدو کو شبہ گزرا کہ ضرور بجاور سنگھ کو یہاں کی کوئی بات گراں گزری ہے جس سے وہ کھنچ گیا ہے اس نے شازی سے دریافت کیا: "بیٹی شازی! ذرا اپنے ذہن پر زور دے کر سوچ کے یہ بتا کہ اس رات تجھ سے کوئی ایسی حرکت تو نہیں سرزد ہوگئی تھی جس کا بجاور سنگھ برا مان گیا ہو؟"

شازی کچھ سوچتی ہوئی سنجیدگی سے بولی: "جہاں تک مجھے یاد آتا ہے مجھ سے تو کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی جس کا کہ ٹھاکر صاحب برا مانتے لیکن سوچتی ہوں کہ آپ کی اشرفیاں پھینکنے والی بات ان کے کانوں تک کسی طرح ضرور پہنچ گئی ہے۔"

میر فدو فکرمند ہو گیا: "یہ بات اس کے کانوں تک کس طرح پہنچی؟ اسے تو میرے اور تیرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ ہی کا خیال درست ہو۔" وہ کہنے لگی۔ "لیکن مجھے کچھ شبہ گزرتا ہے کہ ہمارے لوگوں میں سے کسی ایک نے آپ کی یہ حرکت دیکھ لی تھی اور شاید چھپ کر ہماری باتیں بھی سن لی تھیں، ممکن ہے بجاور سنگھ کسی وقت آیا ہو اور باہر ہی اسے ہماری ساری باتیں معلوم ہو گئی ہوں اور وہ ناراض ہو کے واپس چلا گیا ہو۔"

"بہت برا ہوا۔" میر فدو اور زیادہ فکر مند ہو گیا۔ "ہمیں کوشش کر کے اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہیے ورنہ

یہ یاد رکھو کہ وہ شہر کوتوال ہے ہمارے خلاف کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے"

اسی دوران ایک دس گیارہ سال کا لڑکا اندر داخل ہو گیا۔ ڈھیلے ڈھالے پاجامے اور تن زیب کے کُرتے میں ملبوس۔ آستینیں کہنیوں سے نیچے تک چڑھی ہوئی۔ کرتے میں سوتی کے بٹن ٹنکے ہوتے۔ سر پہ دو پلی ٹوپی، پیروں میں سلیپر، رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ اس نے ایک نظر شازی پر ڈالی اور پھر جیسے ہی میر فدو سے نظریں چار ہوئیں الٹے پیروں واپس ہوا اور یہ جا وہ جا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ میر فدو تو پہلے ہی خوف زدہ ہو رہا تھا لڑکے کے پیچھے باہر آیا اور ادھر ادھر اس لڑکے کو تلاش کرنے لگا۔ سازندے نے سامنے کی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ گھر سے نکل کر اسی گلی میں داخل ہوا تھا پھر آگے جا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑ گیا۔

میر فدو تیز تیز قدم اٹھاتا اس طرف چل پڑا اور جلدی ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسی لیے معلوم نہیں کہ جیسے ہی وہ لڑکا پھر اندر داخل ہو گیا۔ تیر کی طرح شازی کے پاس پہنچا اور اس کے ایک ہاتھ میں لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلی تھما دی اور فوراً واپس ہوتا ہوا بولا: "میں شام تک کسی بھی وقت دوبارہ آؤں گا اس کا جواب تیار رکھیے گا۔ میں اسے لے جاؤں گا۔"

اور وہ اسی وقت واپس چلا گیا۔

شازی نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اس پر خطِ شکست میں تحریر تھا: "اپنی جان شازی کے لیے۔" اس کے بعد اس نے تھیلی کو ٹٹولا، اس کا منہ کھول کر الٹ دیا۔ کھنکھناتی ہوئی بہت ساری اشرفیاں باہر نکل پڑیں۔ اس نے انہیں گنا۔ پوری سو تھیں۔ اس کے بعد اس نے لفافے کو چاک کیا اور اس میں سے خط کا پرزہ نکال کر پڑھنے لگی:۔ اس میں لکھا تھا:۔

شازیے! میری جان تم یقیناً یہ سوچ رہی ہو گی کہ میں تم سے دوبارہ کیوں نہیں ملا؟ لیکن تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ میں شہر کوتوال ہوں۔ مجھے اپنے منصب کے وقار کا بڑا پاس رہتا ہے اور پھر یہ کہ تم جس مکان میں رہتی ہو اس کا مالک انگریزی فوج میں ملازم ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ انگریزی فوج کا معمولی سپاہی نوابِ اودھ کے شہر کوتوال سے زیادہ بااثر ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے صاحبِ خانہ اور مجھ میں کسی قسم کی رقابت کا سلسلہ شروع ہو۔ یہاں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ صاحبِ خانہ لکھنؤ میں موجود ہی کہاں ہے جس سے رقابت کا ڈر ہو۔ یہ درست ہے لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ صاحبِ خانہ کا برادرِ نسبتی ناظر اکثر اپنی بہن کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ ناظر نہ صرف بہترین شاعر ہے بلکہ عاشق مزاج بھی ہے اور اس کی نواب نصیر الدین حیدر تک رسائی ہے۔ تم نہیں جانتیں لیکن میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ناظر عنقریب تم سے راہ و رسم استوار کرنے کی کوشش

کریگا۔ ان حالات میں میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس مکان کو چھوڑ دو۔ اگر کہو تو میں کسی دوسری جگہ تمہاری رہائش کا بندوبست کر سکتا ہوں۔

شازی! میری روح! اب سب سے آخری بات یہ کہ اس دن میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکا تھا۔ شازی! خدا نے تمہیں لاجواب حسن دیا ہے اور بے مثال ستھرا مذاق عطا فرمایا ہے۔ ان اوصاف پر بھی اگر درباروں کی ناصیہ فرسائی پر تمہیں مجبور کیا جاتے تو یہ تمہارے حسن خداداد اور بے مثل مذاق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔ تم خود اس لائق ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے، تمہیں پوجا جائے۔ میں بیوی بچوں والا آدمی ہوں لیکن اگر مجھے تم یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے تاحیات پیمان وفا باندھنے پر آمادہ ہو تو میں اپنی زندگی کے ہر سابق رشتے کو یک لخت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ دینے کو تیار ہوں، میں تمہیں اشرفیوں میں تول دوں گا، زیورات میں غرق کر دوں گا، حریر و پرنیاں میں چھپا دوں گا، اور تمہیں اپنے گھر میں اس طرح رکھوں گا جس طرح پجاری مندر میں بھگوتی کی مورتی رکھتا ہے۔ شازی! یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے تمہارے لیے لکھا ہے۔ تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے اپنی ذاتی مرضی اور رائے سے کرنا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میر فدو کو ہمارے اس خط کا کوئی علم نہ ہو۔

سو اشرفیاں حقیر نذرانے میں پیش کر رہا ہوں۔ جواب ملنے پر اور نذر کر دوں گا۔"

نیچے بختاور سنگھ کے دستخط نہیں تھے، جو از راہ احتیاط نہیں کیے گئے تھے۔ شازی نے اس خط کو کئی بار پڑھا، وہ چکرا گئی۔ وہ بہکنے لگی۔ اس کے جی میں آئی کہ اس خط اور اشرفیوں کو چھپا لے اور چپ چاپ بختاور سنگھ سے معاملہ کر کے عزت آبرو کی زندگی اختیار کر لے لیکن یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اس کی خاطر بختاور سنگھ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ دے گا اور اس کا گناہ شازی کی گردن پر ہوگا۔ وہ چپکے سے اٹھی۔ خط کو گاؤ تکیے کے اندر چھپا دیا اور اشرفیاں بکس میں رکھ آئی۔ وہ دوبارہ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ خط میں جو سبز باغ دکھائے گئے تھے ان سے طبیعت میں ترنگ اور جولانی آ گئی تھی۔ آنکھیں بند کیے ان کے حسین تصور سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اسی عالم میں اسے صاحب خانہ کے برادر نسبتی ناظر کا خیال آ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ اگر یہ شخص اوپری منزل میں رہتا ہے تو اب تک اسے دکھائی کیوں نہ دیا۔ بختاور سنگھ نے یہ بھی تو لکھا تھا کہ ناظر شاعر بھی ہے اور عاشق مزاج نکما بھی۔ جس کی نواب اودھ کے دربار تک رسائی بھی ہے۔ نجانے کیوں وہ اس شاعر کو دیکھنا چاہتی تھی۔

اسی لمحے کسی کی بو سونگھتا ہوا میر فدو اندر داخل ہوا۔ اسے باہر ہی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ دولت کا دوبارہ

پھر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دریافت کیا۔ "کیا وہ لڑکا یہاں دوبارہ آیا تھا؟"

"ہاں آیا تو تھا!"

میر فدو سراپا سوال بن گیا۔ "کیوں، جو کیا کہتا تھا؟"

شازی کے انجانے پن نے کر بے سارے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پیچ خود بخود منہ سے نکل گیا۔ "بجاور سنگھ کا خط دے کر گیا تھا!"

میر فدو تلملا بھبھوکا ہو گیا۔ مشتعل ہو کر بولا۔ "آخر یہ کوتوال کا بچہ چاہتا کیا ہے؟ کہاں ہے وہ خط، ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ کیا لکھا ہے؟"

شازی نے بلا چون و چرا تکیے سے خط نکال کے میر فدو کے حوالے کر دیا۔ اس نے عجلت اور اضطراب میں خط کی تہیں کھولیں اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے خط پڑھتا جاتا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا اور چہرے کی نرمی پر سختی غالب آتی گئی۔ جب پورا خط پڑھ چکا تو صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ بجاور سنگھ کو گالیاں دیتا ہوا بولا۔ "اس لیے تم اس گھر میں آتے تھے کہ میرے گھر کو اجاڑ دو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کوتوال ہو اور نا تجربہ کار بھولی بھالی شازی کو پھسلا لو گے تو سخت بھول میں ہو، شازی میری شاگرد ہے میری بچی ہے وہ خوب اچھی طرح جانتی ہے کہ تمہارے عشق کا انت کے گھری کا ہے؟" اس کے بعد ایکدم شازی سے مخاطب ہوا۔ پوچھا۔ "تم نے اس کا جواب لکھا ہے؟"

شازی نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس نے حکم دیا۔ "تم اسی وقت اس کا جواب لکھ دو!" لیکن پھر کچھ سوچ کے نرمی سے بولا۔ "ہاں تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس خط کا تم نے کیا اثر لیا ہے؟"

شازی پان کھا رہی تھی، اسے میر فدو کی تلملاہٹ میں بڑا مزہ آ رہا تھا، اس نے جواب میں ہلکا سا تبسم بکھیر دیا اور بدستور منہ چلاتی رہی۔ میر فدو تڑپ گیا، جل کر بولا۔ "یہ معاملہ ہنس کر ٹال دینے کا نہیں ہے، بجاور سنگھ شہر کوتوال ہے، وہ اپنے معاملے میں سنجیدہ ہے تو تم غیر سنجیدہ رہ کر اسے کس طرح مطمئن کر دیں گے؟"

شازی نے جواب دیا۔ "میرے دل اور دماغ تو آپ ہیں جو آپ سوچیں گے وہی میرا جواب ہو گا۔"

میر فدو شازی کی سعادت مندی پر باغ باغ ہو گیا۔ فرط محبت میں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، کہنے لگا۔ "شازی! تیری خوشی میں میری خوشی ہے اگر تو خوش ہو گی تو میں بھی خوش ہوں گا۔ اگر تجھے کچھ پہنچے گا تو میں بھی دکھی ہو جاؤں گا یہ کم بخت کوتوال، جو تجھے عیش و عشرت کے سبز باغ دکھا رہا ہے تجھ سے دو دن لطف و لذت حاصل کر کے اس طرح بھلا دے گا جس طرح باسی پھولوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے میں تجھے نواب نصیر الدین حیدر کی

بارگاہ تک پہنچانا چاہتا ہوں تیرا مجھ قدر دان بھی ثابت ہوگا۔"

شازی نے کروٹ بدلی، دوسری طرف منہ کرتی ہوئی بولی" لیکن نواب کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کے حرم میں بھی لاتعداد عورتیں موجود ہیں اور حسین ترین عورت بھی انہیں چند دنوں سے زیادہ متاثر نہیں کرسکتی۔"

میر فدو کا موڈ بگڑنے لگا "لیکن پھر بھی نواب نواب ہی ہے اس کا کسی اور سے کیا مقابلہ۔ اگر نواب نے تجھے چند ہی دنوں کے لیے کوئی اعلیٰ عزت بخش دی تو صلے میں اتنا کچھ بخش دیں گے کہ تو کئی پشتیں عزت و آرام سے گزار دے گی۔"

شازی نے مزید بک جھک میں دماغ کھپانا فضول سمجھا چپ ہو رہی۔

میر فدو دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہوا بولا "تیری طرف سے بختاور سنگھ کو میں جواب لکھتا ہوں تو اسے نقل کر کے دے دینا۔ ایسا جواب دوں گا کہ جیالیا گئے سے کٹ جائیں گے۔"

میر فدو نے جواب میں لکھ دیا کہ "آپ کی ذرہ نوازی اور کرم فرمائی کا شکریہ، بندی بھی آپ کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ ہم دونوں اگر چاہیں تو ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر گھڑی دو گھڑی کا لطف اٹھا لیں لیکن ہم دونوں کی بود و باش اور معاشرت کا باہمی فرق ایسا نہیں ہے کہ ہماری محبت پائیدار ثابت ہو۔ ہم نے آزاد پنچھی کی طرح پرورش پائی ہے ہم بازار کی چیز ہیں اور آپ کی حیثیت گاہک جیسی ہے۔ آپ نے ہمیں بازار میں پایا ہے کل اسی بازار میں کوئی ہم سے بھی اچھی چیز پا سکتے ہیں اور آپ کی گاہکانہ ذہنیت اس کے مول تول پر مائل ہو جائے گی ایسی صورت میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان موجود رشتہ ہی زیادہ اچھا ہے ہم جنسِ تجارت ہیں اور آپ خریدار، آپ بشوق غریب خانے میں قدم رنجہ فرمائیں، ہم اپنے ناز و انداز اور رقص و موسیقی سے آپ کے لئے سامانِ دل بستگی پیدا کریں گے۔"

لڑکا سہ پہر کو چھپتا چھپاتا آیا، میر فدو اس کی جھلک پاتے ہی کمرے میں چھپ گیا۔ لڑکے نے جواب لیا اور فوراً واپس چلا گیا۔

بعد میں جب میر فدو شازی کے سامنے آیا تو اس نے شکایتاً کہا "آپ نے خط میں سو اشرفیوں کا شکریہ ادا نہیں کیا اور میرے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی۔"

میر فدو ہنستا ہوا بولا "لیکن وہ اشرفیاں ہیں کہاں، مجھے تو تو نے دی نہیں، پھر میں شکریہ کیوں ادا کرتا۔" اور پھر زور سے قہقہہ مار کے ہنس دیا کہنے لگا "خیر یہ تو محض گستاخانہ بات تھی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے خط لکھنے کے دوران ان اشرفیوں کا خیال تھا اور میں نے قصداً ان کا شکریہ نہیں ادا کیا، جو چیز ہم نے اپنے حق کے طور پر وصول کی ہو اس کا شکریہ ادا کرنا کیا معنی؟" اور وہ ایک بار پھر بے ہنگم ہنسی ہنسنے لگا۔

مغرب کے فوراً بعد ہی بختاور سنگھ کی دیوانگی و آشفتہ سری نے زور کیا اور وہ پندار اور مصلحتوں کا خون کر کے ایک بار پھر نیاز مندانہ شازی کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ میر فدو نے بظاہر خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے لیکن اندر ہی اندر مشتعل مزاجی سے کوتوال کا استقبال کیا۔ شازی آرائش و زیبائش کے کمرے میں بن سنور رہی تھی۔ میر فدو نے بختاور سنگھ کو ان کی مخصوص نشست پر بٹھایا اور زور سے شازی کو مخاطب کیا۔ "شازی بیٹی! اپنے کوتوال صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اگر طبیعت سنبھل گئی ہو تو ذرا سی دیر کے لئے باہر آ جاؤ۔" اس کے بعد کوتوال صاحب سے کہا۔ "معلوم نہیں کیا بات ہے کہ آج دوپہر سے اسے چکر آ رہے ہیں۔ سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی۔ دیکھو میں بلا کر لاتا ہوں باہر۔" اس کے بعد وہ شازی کے پاس پہنچ گیا اسے سمجھاتا ہوا بولا۔ "شازی وہ کمبخت پھر آ گیا ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تجھے دوپہر سے چکر آ رہے ہیں اور تو سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی ہے چنانچہ تو فوراً اپنے سر سے رومال باندھ لے اور اپنے چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لے جس سے واقعی یہ محسوس ہونے لگے کہ تو بیمار ہے۔ اس طرح تو اس وقت تو ناچ گانے کی خواہ مخواہ کی مشقت سے بچ جائے گی اور اس سے چھٹکارا بھی جلدی ہی مل جائے گا۔"

شازی نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور سر سے رومال باندھ لیا۔ جب وہ اس حلیے میں منہ لٹکاتے افسردہ افسردہ، بجھی بجھی اور تھکی تھکی بختاور سنگھ کے سامنے پہنچی تو کوتوال کا گھائل دل کچھ اور گھائل ہو گیا۔ سر کے گرد بندھے ہوئے رومال نے اس کے حسن میں کچھ زیادہ ہی اضافہ کر دیا تھا۔ بختاور سنگھ کے دل سے آہ نکلی اور دل ہی میں ڈوب گئی۔ اس نے شازی کے احترام میں کھڑا ہو جانا چاہا لیکن شازی نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔

اس نے پریشانی سے سوال کیا۔ "کسی حکیم کو دکھایا یا نہیں؟"

شازی نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا تو بختاور سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "میں ابھی لاتا ہوں حکیم صاحب کو بلا کر۔ تم ذرا توقف کرو۔"

میر فدو نے سوچا کہ اگر حکیم آیا تو جھوٹ پکڑا بھی جا سکتا ہے اس لئے بات رفع دفع کرتا ہوا بولا۔ "کوتوال صاحب! اصل میں بات یہ ہے کہ ہم لوگ کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ لکھنؤ کی گرمی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے جیسے جیسے رات گزرے گی، گرمی کم ہوتی جائے گی اور شازی کی طبیعت بھی بحال ہوتی جائے گی اس لئے حکیم وغیرہ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

بختاور سنگھ بھی اس تاک میں تھا کہ کاش وہ شازی کی کوئی خدمت انجام دے سکتا۔ کچھ دیر تک کشمیر اور اودھ کے موسموں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد علاقوں کے لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کی باتیں

چل نکلیں اور گفتگو عشق و عاشقی اور شعر و شاعری تک جا پہنچی آج چونکہ شازی کے رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونا محال تھا اس لئے یہ طے پایا کہ شعر و شاعری کا ذکر چھیڑے بہادر سنگھ میر فدو کی موجودگی میں ایسے اشعار زبان پر لانے سے جھجک رہا تھا جن میں عشق و محبت کا بلا کا درد و سوز پایا جاتا ہے اور جن کے ذریعے کھل کے اظہارِ عشق کیا جا سکتا تھا۔ میر فدو کی ذات کوتوال کے دل میں گھٹن پیدا کر رہی تھی میر فدو کو شازی پر اعتماد تھا۔ کوتوال کو مزید بیوقوف بنانے کے لئے اس نے دونوں کو تنہا چھوڑ دیا اور کسی کام کا عذر کر کے باہر چلا گیا جب بہادر سنگھ کو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اس کے آس پاس میر فدو نہیں ہے تو اس نے شازی سے دریافت کیا۔ "شازی! تم نے میرا خط میر فدو کو دکھایا تو نہیں تھا؟"

شازی نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں! آپ نے منع جو کیا تھا۔"

بہادر سنگھ نے فرطِ محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہنے لگا۔ "شازی میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے تمہاری بے مثال محبت کا سپاسنامہ پیش کیا جائے۔"

شازی بس مسکراتی رہی۔ کوتوال آہستہ آہستہ پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ "میں نے تمہارا خط پڑھا بلاشبہ وہ ادب کا ایک بے مثل نمونہ ہے تم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے لیکن تم نہیں جانتیں کہ میں نے تمہیں مالِ تجارت کبھی بھی نہیں سمجھا اور نہ ہی میں اپنے تئیں تمہارا گاہک سمجھتا ہوں۔"

شازی نے شوخ نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔ "ہم مالِ تجارت ہیں اور آپ ہمارے گاہک اگر آپ کا دل یہ باتیں نہیں مانتا تو نہ مانئے اس کے نہ ماننے سے معاملے کی صداقت تھوڑی بدل جائے گی۔"

بہادر سنگھ کی کوتوالی لاجواب ہو گئی۔ "شازی!" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ "میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ میرا دل ایک ایسی آگ میں جل رہا ہے شازی جس میں تمہاری محبت کے سوا ہر شے جل کر راکھ ہو گئی ہے تم میری بات کیوں نہیں سمجھتیں۔"

شازی نے دکھتا ہوا سوال کیا۔ "آپ کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"دو۔" بہادر نے جواب دیا۔

"اور داشتائیں؟"

"پانچ!"

"خانگیاں؟"

"دو صرف دو۔"

"ان سے ایسی اولادیں کتنی ہیں جو کل آپ کے بعد آپ کی جائداد اور املاک کی وارث قرار دی جا سکتی ہیں۔"

"صرف چند"

شازی نے پھر پر وار کیا۔ "اگر ہم آپ کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو معلوم ہے کہ اس صلے میں ہم آپ سے کیا کچھ چاہیں گے؟"

"جانتا ہوں!" بختاور سنگھ نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کر سکتی ہو کہ میں یک لخت تمہاری خاطر ان سب سے پیچھا چھڑا لوں۔" پھر ذرا چپ رہ کر پوچھا۔ "کیوں شازی یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔" شازی نے جوشِ مسرت میں کہا۔ "بالکل یہی بات لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اتنی بڑی قربانی آپ کے لئے اتنی آسان نہیں ہے جتنا آپ ہماری محبت کے وقتی جذبے کے تحت محسوس کر رہے ہیں۔"

بختاور سنگھ نے علی الاعلان کہا۔ "یہ تمہاری خام خیالی ہے شازی! میرے لئے تمہاری محبت کی یہ قربانی دینا اتنا ہی آسان ہے جتنا تمہارے لئے میری خاطر رقص و موسیقی پر آمادہ ہونا۔"

شازی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ دوسری مشکل پیش کی۔ "چلئے میں نے یہ مان لیا کہ آپ ہماری خاطر یہ ساری قربانیاں دے ڈالیں گے۔ لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ آپ ہندو ہیں اور میں مسلمان پھر ہم کس طرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں؟"

بختاور سنگھ نے جواب دیا۔ "عشق کی کوئی ذات نہیں ہوتی تم اپنے مذہب پر رہو۔ میں اپنے دھرم پر قائم ہوں۔"

شازی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ بات اتنی آسان نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ ہم بہرحال یہ پسند نہیں کریں گے کہ ایک ہندو کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔"

بختاور سنگھ بھی کھڑا ہو گیا۔ بے بسی سے بولا۔ "تم اگر مجھے یہ یقین دلا دو کہ تا زیست ساتھ نہ چھوڑو گی تو میں تمہارے لئے اپنے ہندو دھرم کو بھی خیرباد کہہ سکتا ہوں۔"

شازی نے طنز سے کہا۔ "آپ ہماری ہر بات نہایت آسانی سے مانتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ اپنے رشتے داروں اور دھرم کے معاملے میں اگر ایسے ہی بودے واقع ہوتے ہیں اور یہ سارے بندھن اتنی آسانی سے توڑ سکتے ہیں تو پھر آپ ہمارے نزدیک بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ٹھہرتے ہیں۔"

بختاور سنگھ نے نہایت بیچارگی سے عرض کیا۔ "شازی! تم ایسا سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم نے میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح قبضہ جما لیا ہے کہ اپنے حق میں جیسا فیصلہ چاہو بآسانی کرا لو۔"

شازی اندر جانے لگی تو بختاور سنگھ نے اسے روکنا چاہا۔ پوچھا۔ "تم اب کہاں جا رہی ہو؟"

شازی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا ہم ذرا آرام کرنا چاہتے ہیں!"
بختاور سنگھ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ "شازی! وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "میں یہاں بیٹھ دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ ذرا دیر بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی بھی بے رخی کس کام کی۔"
شازی نے سنگدلی سے جواب دیا۔ "اللہ قسم آپ کی محبت میں ہم تکلیف کے باوجود آپ کے پاس چلے آتے تھے۔ لیکن اب مزید بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے پھر کسی دن تشریف لائیے گا تو دیر تک بیٹھیں گے اور آپ کا جی خوش کر دیں گے۔"
بختاور سنگھ سراپا التجا بن گیا۔ "اچھا، اب ایک سوال اسے پورا کر دو اس کے بعد چلی جانا۔"
"وہ کیا؟" شازی نے دز دیدہ نگاہوں کا زہریلا تیر چلا دیا۔
بختاور سنگھ کی نظریں اس کے سرخ و سپید سیبوں جیسے رخساروں پر جم گئیں۔ "بس دو بوسے۔"
"اوں ہوں!" وہ ایسی لجا گئی جیسے پہلی رات کی دلہن۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"
بختاور سنگھ نے اپنی دونوں جیبوں سے مٹھیاں بھر بھر کے اشرفیاں نکالیں اور انھیں شازی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "میں اپنے ان دو بوسوں کی یہ قیمت پیشگی ادا کر دینا چاہتا ہوں۔"
شازی نے اندازہ لگایا کہ یہ اشرفیاں کسی بھی طرح پچاس ساٹھ سے کم نہ تھیں۔ سودا بآسانی طے پا گیا۔ اشرفیاں شازی کے قبضے میں چلی گئیں اور دو پُرجوش بوسے بختاور سنگھ کے حصے میں آئے۔ جب حساب کتاب چکایا جا چکا تو شازی نے تڑپ کر بختاور سنگھ کو مخاطب کیا۔
"کوتوال صاحب! کہاں گئے آپ کے وہ مقدس احساسات اور خیالات جو ہماری پاک محبت کے روپ میں آپ کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم مالِ تجارت ہیں، اور آپ گاہک۔ اور ہمارے اور آپ کے درمیان یہی رشتہ وجہ ربط و ارتباط ہے لیکن آپ اس حقیقت کو نہیں مان رہے تھے بالآخر آپ نے بوسوں کی قیمت ادا کر کے عملاً اس تلخ حقیقت کا اعتراف کر لیا۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔
بختاور سنگھ کھسیا گیا۔ یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ یہ منظر ابھی اپنے اختتام کو پہنچا تھا کہ میر فدو ایک اجنبی کو لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ان صاحب کا حلیہ کچھ عجیب و غریب تھا۔ پشت پر بھینسے کی کھال کی ڈھال لٹکی ہوئی جس پر پیتل کے پھول جڑے ہوئے تھے۔ چلغوزوں کی جوڑی داہنے بائیں لٹکی ہوئی۔ تلوار بائیں طرف نیام میں پھنسی ہوئی، سر پر دو پلی ٹوپی، ٹوپی کے باہر گدی پر بالوں کے پٹے نمایاں، رنگ کھلتا ہوا، قد و قامت میں بلا کی وجاہت، چہرے پر ہلکی سی داڑھی، سیاہ گھنیری مونچھیں، ململ کا کرتہ اور ڈھیلی موریوں کا پاجامہ۔ یہ صاحب اس حلیے میں اکڑتے ہوئے میر فدو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ایک چھوٹی سی کتاب ان کے

اتنے میں میر فدو نے دور ہی سے شور کرنا شروع کر دیا "اے لڑکے مرگئی شازی! دیکھ یہ تجھ سے کون ملنے آیا ہے"
پھر قوال صاحب کو مخاطب کیا "قوال صاحب! وہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں آپ ادھر تشریف لائیے۔
دیکھئے میں کتنے بڑے آدمی سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں"۔

شازی اور بختاور سنگھ پھر اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔ اجنبی مہمان کے لئے ایک گاؤ تکیہ اور لایا گیا۔
وہ اس کے سہارے ڈھال اور تلوار کو الگ رکھ کے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بختاور سنگھ
اپنی جگہ بیٹھ گیا اور شازی نے اپنی جگہ سنبھالی۔

میر فدو نے درمیان میں کھڑے ہو کے ہر ایک کا تعارف کرانا شروع کیا "جناب قوال صاحب! یہ
ہیں اپنے مالک مکان کے برادر نسبتی جناب ناظر۔ استاد ہے کہ یہ شعر بڑے بانکے کہتے ہیں اودھ کے بہترین
شاعر ہیں"۔ اس کے بعد اس نے بختاور سنگھ اور شازی کا تعارف ناظر سے کرایا۔ شازی نے کنکھیوں سے
اس تیکھے نوجوان کو دیکھا اس نے سوچا کہ یہ شاعر خوب ہے جو شاعر سے زیادہ اونچی ہے۔

میر فدو نے مزید کہا "جناب والا! یہ کسی طرح یہاں آنے کے خواہشمند تھے یہ مکان جس میں ہم رہتے
ہیں ان کے بہنوئی کا ہے۔ یہ خود یہاں نہیں رہتے لیکن آتے جاتے رہتے ہیں میں خود بھی ان کے چکر میں
کئی دن سے تھا۔ آج بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں"۔

بختاور سنگھ ناظر کو خوب پہچانتا تھا کیونکہ وہ اس شخص سے نواب کے دربار میں اکثر ملتا رہتا تھا اور
وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نواب صاحب اس کی شاعری کو پسند بھی کرتے ہیں۔ بختاور سنگھ کو اپنی محبت کا قلعہ مسمار
ہوتا محسوس ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میر فدو ناظر کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہاں لایا ہے چونکہ وہ
شازی کو نواب کی بارگاہ تک پہنچانا چاہتا تھا اس لئے جب سے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ناظر جو صاحب خانہ
کا برادر نسبتی ہے ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نواب کی مصاحبت بھی رکھتا ہے تو اس نے ناظر کو
بحیثیت ایک ذریعہ کے استعمال کرنے کی ٹھانی ہوگی۔ اب ان حالات میں شازی سے ربط ضبط بڑھانا اور
تعلقات محبت استوار کرنے کی کوشش کرنا ایک نہایت خطرناک عمل ثابت ہوگا۔ کیونکہ اب یہ یقینی ہو گیا تھا کہ شازی
نواب تک پہنچ کے رہے گی اور جب نواب کو یہ معلوم ہوگا کہ شازی ان کے پاس پہنچنے سے پہلے بختاور سنگھ کی نظر
التفات کی شکار رہ چکی ہے تو اس وقت معلوم نہیں نواب کے کیا احساسات ہوں اور وہ اس کے بارے میں معلوم نہیں
کیسا فیصلہ صادر کر دیں۔ کیونکہ نواب صاحب نو عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے ساتھ ہی مغلوب الغضب بھی ہیں۔

ناظر نے شاعرانہ بے نیازی اور فنکارانہ انا سے بختاور سنگھ کو دیکھا اور طنزیہ دریافت کیا "تو کیوں قوال
صاحب آپ شہر کا انتظام اس گوشے میں بیٹھ کر فرماتے ہیں"۔

بختاور سنگھ اس چوٹ سے کچھ زیادہ ہی بوکھلا گیا۔ فوراً جانے کے لئے کھڑا ہو گیا، بولا "ناظر صاحب! میں یہاں مستقلاً نہیں آتا شاید دوسری مرتبہ آیا ہوں بس کبھی کبھی جب زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں تو یہاں غم غلط کرنے چلا آتا ہوں۔" ناظر مسکرانے لگا۔ "جناب شہر کے ہنگاموں سے گھبرا کے چل دیجئے تو یہاں آ جاتے ہیں لیکن اگر یہاں سے آگے نکل کے گئے تو کہاں جائیں گے؟" شاعر کی اس بات پر بھی مسکرا دیتے اور بختاور سنگھ بدحواس ہو کے ایسا بھاگا کہ پلٹ کے بھی نہ دیکھا۔ اس کے جاتے ہی میر فدو نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنستا ہوا بولا "جناب ناظر صاحب! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں ورنہ یہ کوتوال تو میرے لئے مصیبت بن گیا تھا آپ میرے لئے فرشتہ غیبی سے کسی طرح بھی کم نہیں۔"

اب ناظر نے شازی کے سراپا کا بغور جائزہ لیا اور وہی روگ خود لگا بیٹھا جس کا بختاور سنگھ پہلے ہی شکار ہو چکا تھا۔ اتنے متناسب اعضاء کے صحت مند اور متناسب حسن کا شاہکار ناظر نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اسے اپنے اشعار پھیکے اور بے مزہ محسوس ہونے لگے وہ تا دیر نہایت انہماک سے شازی کو دیکھتا رہا۔ اس محویت کو میر فدو نے بھی محسوس کیا لیکن اسے اس شاعر کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ زر، زور اور عمل سے محروم شاعر سے ڈرنا کیسا۔

ناظر کو دنیا داری نہیں آتی تھی۔ کیسی زمانہ سازی اور کہاں کا تکلف اور لحاظ، کہنے لگا "خوب ہمیں آپ کی موجودگی کا کوئی علم نہ تھا ہم خواہ مخواہ ادھر ادھر کی خاک چھانتے پھرتے تھے ہمیں پتہ ہی نہ تھا کہ بہار گھر میں آ چکی ہے۔" اس کے بعد میر فدو سے پوچھا "کیوں قبلہ! اگر ہم گھڑی دو گھڑی کو دل بہلانے کے لئے یہاں آ جایا کریں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

میر فدو کو ناظر سے کچھ اہم کام لینا تھے۔ اس لئے خندہ پیشانی سے آنے جانے کی اجازت دے دی۔

ناظر دیر تک بیٹھا ان دونوں سے باتیں کرتا رہا۔ اسے شازی کی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ اس کی آواز میں شہد کی مٹھاس اور سازوں کی کھنک تھی جب وہ مسکرا کر کسی بات کا جواب دیتی تو ناظر کو ایسا لگتا جیسے اس کے دل کی حرکت رک گئی ہے زور سے ہنستی تو ایک بجلی سی کوند جاتی اسے اپنی شاعری کے لئے ایک جیتا جاگتا شاہکار محبوب میسر آ گیا تھا۔

شازی کو بھی اس نوجوان میں کچھ انفرادیت نظر آتی تھی۔ یہ دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ گفتگو میں ایک خاص سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا اس کا مذاق ستھرا اور معنی خیز تھا اس مہذب اور شائستہ انسان پہ ڈھال، طمنچوں کی جوڑی اور تلوار کچھ عجیب سی لگتی تھی۔ شازی نے سوچا کیا یہ شخص بھی صاحب سیف ہو سکتا ہے۔ کیا یہ شخص بھی کسی سپاہیانہ انداز میں نبرد آزما ہو سکتا ہے کیا یہ شخص بھی کسی کو

کر قتل کر سکتا ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے جن کا اس کے پاس کم از کم اثبات میں کوئی جواب نہ تھا۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچی کہ کم ہی ہو، اس دلچسپ اور پرکشش انسان کے ساتھ گفتگو کر کے اور اس کی صحبت میں کچھ وقت گزار کر لطف اندوز ضرور ہوا جا سکتا ہے۔

ناظر اور شازی کچھ ہی عرصے میں اتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے کہ میر قدرو کی دوررس نظریں خطرے کا احساس کر کے بہت زیادہ خوفزدہ ہونے لگیں۔ شازی اب ناظر ہی کی غزلیں گانے لگی تھی اور اب ناظر کی غزل میں بھی بلا کا درد و سوز پیدا ہو گیا تھا۔ غزلوں میں درد و سوز کی بات شاہی محلات اور دربار تک پہنچ چکی تھی۔ خود نواب نصیر الدین حیدر نے کئی بار اس کا اعتراف کرتے ہوئے ناظر سے کہا تھا "بھئی ناظر ان دنوں تمہاری شاعری اپنے جوبن پر آئی ہوئی ہے۔ آخر کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

ناظر سہم گیا کہ کہیں شازی کے حسن و خوبصورتی کی خبر نواب تک تو نہیں پہنچ گئی۔ کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خبر کے بعد شازی لمحوں کے اندر نوابی حرم میں داخل کر لی جائے گی۔ ناظر نے نواب کی بات کا کوئی معقول جواب تو نہ دیا لیکن قریب ہی موجود بختاور سنگھ کو ناظر کی پریشانی پر بڑا مزہ آیا۔ اس نے مزید لطف لینے کے لئے مودبانہ عرض کیا "اگر قبلہ نواب صاحب اس غلام کو شرفِ ہمکلامی مرحمت فرمائیں تو بندہ جناب ناظر کے اشعار میں پلنے والے درد و سوز کی بابت کچھ نقاب کشائی کر سکتا ہے۔"

ناظر کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے بختاور سنگھ کو دیکھا اور گردن جھکا لی۔

نواب صاحب نے حکم دیا "اجازت۔ بختاور سنگھ اجازت ہے۔"

بختاور سنگھ نے ہاتھ باندھ کے عرض کیا "حضور تو غلام کے فرائضِ منصبی سے واقف ہی ہیں۔ چنانچہ اس دوران شہر میں امن اور نظم و نسق کے پیشِ نظر یہ غلام جب مختلف اوقات اور ایام میں حسن فروش مہوشوں اور نگر خانوں میں پہنچا تو وہاں اپنے ناظر صاحب بھی نظر آئے۔ ہو سکتا ہے وہیں سے کسی آتشِ گل نے اپنے دل میں آگ لگا لی ہو اور اسی کے زیرِ اثر ان کے اشعار میں درد و سوز پیدا ہو گیا ہو۔"

نواب اس طرح ہنسے جیسے کسی مٹکے سے پانی انڈیلا جا رہا ہو، تیز تیز نظروں سے ناظر کو گھورا اور ارشاد فرمایا "کیوں بھئی! تو یہ معاملے ہیں؟ بھئی خوب! یعنی آپ زنانِ بازاری سے عشق فرمانے لگے ہیں لیکن خاطرِ عاطر میں ہماری یہ بات ضرور ڈال لیں کہ یہ شوق غرباء کے بس کا نہیں ہے۔ آپ کو ہماری اتباع سے بچنا چاہیے۔" اس کے بعد بختاور سنگھ سے کہا: "بختاور سنگھ! ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اس نوجوان شاعر کا خیال رکھو اور اب جب کبھی یہ ایسی ویسی جگہ پر نظر آئے تو تم ہمیں اس سے مطلع کرو۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ نوجوان اور شریف شاعر ان چالاک اور عیار حسن فروشوں کے چکر میں پھنس کر تباہ و برباد ہو جائے۔ قسم ہے اللہ کی کہ اپنے درباری شرفاء کی عزت و آبرو

کا تحفظ ہمارا فرض ہے اور ہم انھیں اس سے بچا لیں گے۔"

بختاور سنگھ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ اب ناظر پوری طرح اس کے قابو میں آچکا تھا اب وہ بختاور سنگھ کے رحم و کرم پر تھا جب سے شازی کے یہاں ناظر کی آمد و رفت بڑھی تھی، بختاور سنگھ نے وہاں جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ لیکن آج کے بعد ناظر بالکل بے بس ہو گیا تھا بلکہ نواب کے حکم نے اس کے پر کھینچ دیئے تھے۔ اس نے سوچا۔ اب بختاور سنگھ ایک بار پھر آزادی کے ساتھ شازی کے گھر آنے جانے لگے گا۔

ناظر جب دربار سے واپس ہوا تو اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ شازی نے قطع تعلق بہت دشوار تھا اور نواب صاحب کی حکم عدولی خطرناک۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ ان حالات میں آخر کیا کیا جائے۔ وہ سیدھا ہی گھر پہنچا اور منہ لپیٹ کے پڑ رہا۔ بہن نے کچھ پوچھا تو کہہ دیا طبیعت خراب ہے اس پریشانی میں بھی اس کے کان شازی کی آواز ہی پر لگے ہوئے تھے لیکن نیچے تو بالکل سناٹا تھا۔ شازی تو شازی، میر فدو تک کی آواز نہ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نیچے کوئی موجود ہی نہ ہو اس کے درد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

مغرب کے بعد اچانک میر فدو کی آواز گونجی "آئیے آئیے کوتوال صاحب تشریف لائیے کئی دنوں بعد تشریف لائے۔ خیریت تو ہے۔"

اور پھر بختاور سنگھ کی آواز سنائی دی "ہاں خیریت سے ہوں۔ آج اپنے ناظر صاحب نظر نہیں آتے۔"

اس کا کوتوال کو کیا جواب ملا۔ آواز صاف نہیں سنائی دی۔ لیکن میر فدو کی بے ربط آواز کانوں میں پڑی تو ناظر تلملا کر رہ گیا۔ بار بار اس کا یہی جی چاہتا کہ وہ اٹھ کر اسی وقت نیچے جائے۔ لیکن پھر اس کے انجام سے ڈر جاتا۔

کافی رات گئے شازی کی آواز بھی سنائی دی۔ مختلف سازوں کے ساتھ اس کی آواز اس طرح ابھری کہ ناظر کا دل مچلنے لگا اور اس محفل میں پہنچنے کے لیے تڑپنے لگا۔ شازی جو غزل گا رہی تھی وہ فراقیہ تھی اور اس کی دھن بھی ایسی تھی۔ اس نے سوچا یہ ضرور بختاور سنگھ کو خوش کرنے کے لئے محفل سجی ہے اسے شازی پر غصہ آیا کہ آخر اس نے کیوں موسیقی چھیڑی اسے میر فدو پر بھی غصہ آیا کہ وہاں جو بھی پہنچتا ہے اس کا اس طرح خوش اخلاقی سے استقبال کرتا ہے گویا وہی اس گھر کا سب سے معزز مہمان ہے۔

پھر گھنگرو بھی کھنکنے لگے۔ شازی ناچ رہی تھی۔ بختاور سنگھ کو خوش کرنے کے لئے ناظر انگاروں پر لوٹنے لگا۔

دوسری طرف بختاور سنگھ اتنا خوش تھا کہ اس نے شازی، میر فدو اور سازندوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینے کے لیے ایسی داد و دہش کی کہ شازی اور میر فدو کے سوا سازندے تو اس کے دل کے گن گانے لگے۔

میر فدو حیران تھا کہ آج بختاور سنگھ اتنا خوش کیوں ہے اور ناظر کیوں نہیں آیا۔ آج تو کوتوال صاحب کی

جسارت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کسی کا پاس و لحاظ بھی نہ کیا اور نہایت ڈھٹائی سے شازی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اس کے رخسار کو مسل کے سرخ کر دیا۔ شازی کی بری شکل ہو گئی۔

میر فدو نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں ناظر موجود ہوتا تو بجادر سنگھ کی اتنی ہمت نہ پڑتی۔ اس نے کوتوال کی جسارتوں کو نفسیاتی حملے سے روکنے کی کوشش کی۔ بولا ”ناظر صاحب اب تک معلوم نہیں کیوں غائب ہیں، شاید اب ضرور آتے ہوں گے۔“

بجادر سنگھ نے اس کا مذاق اڑایا۔ بولا ”اب وہ یہاں کبھی بھی نہ آئے گا۔ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے اگر آئے تو مجھے بتانا، پھر جو کبھی آئے تو میرا ذمہ۔“

شازی نے بے چینی سے پوچھا ”کیوں اب ناظر صاحب یہاں کیوں نہ آئیں گے؟ انہیں یہاں آنے سے کس نے منع کیا ہے؟“

بجادر سنگھ سب کچھ صاف صاف بتانا بھی نہ چاہتا تھا۔ بات ٹال گیا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد شازی بہت پریشان ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا گیا۔

ساری رات کی فکرمندی اور غور و فکر کے بعد ناظر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر کسی طرح شازی اس سے شادی کر لے تو وہ نہ صرف یہ کہ فراق و جدائی کی آگ سے بچ جائے گا بلکہ نواب صاحب کو شازی کے بے پناہ حسن کا علم بھی ہو گیا تو وہ اخلاقاً ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی تباہ کرنے سے باز رہیں گے لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل تھا کیونکہ میر فدو اس پر کبھی تیار نہ ہو گا۔ یہاں تک کہ اگر کسی طرح شازی ناظر سے شادی کرنے پر آمادہ بھی ہو جاتی تب بھی میر فدو دونوں کی اس کوشش کو ناکام بنا دے گا پھر بھی اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے اس معاملے میں شازی سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔ مشورے کے لیے شازی کی قیام گاہ بالکل نامناسب تھی۔ چنانچہ اس نے شازی اور میر فدو کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا منصوبہ بنایا اور اس دعوت میں شازی سے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس تجویز پر جلد از جلد عملدرآمد کے لیے وہ صبح سویرے ہی شازی کے پاس پہنچ گیا اس وقت تک وہ اپنے بستر پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ میر فدو اس کی شکل دیکھتے ہی استقبال کو آگے بڑھا اور خیریت پوچھنے لگا۔ ناظر کی نظریں شازی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میر فدو اس کا مطلب سمجھ گیا۔ منہ بنا کر کہنے لگا ”جناب کیا عرض کروں، رات کوتوال صاحب آ گئے تھے رات گئے تک ہلکان کرتے رہے“ ان کے جاتے ہی شازی اس طرح بستر پر گری کہ رات کا کھانا بھی اس سے نہ کھایا گیا، سچ کہتا ہوں ایسا ڈھیٹ ایسا بے شرم آدمی بھی نہیں دیکھا۔“

ناظر نے ناگواری سے جواب دیا۔ "جناب صبح صبح کس منحوس کا ذکر لے بیٹھے۔ کچھ اور باتیں کیجیے۔"
موقع غنیمت تھا۔ شازی بھی موجود تھی۔ اس نے نہایت عزت و احترام سے ناظر کو بٹھایا اور ناشتے کی بابت پوچھنے لگا۔ ناظر نے کہا۔ "ناشتہ کرکے آتے ہیں۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میر فدو نے کہا۔ "حضور! اگر اجازت دیں تو ایک درخواست کروں۔"

"کہیئے!" ناظر سراپا سوال بن گیا۔ "بشوق عرض کیجیے۔"

میر فدو نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس آسرے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے معاملے میں اگر میں اپنے ہم پیشہ حضرات سے اعانت چاہوں گا تو مثل مشہور ہے کہ ہم پیشہ دشمن ہمیشہ ہیں اس کے حسد اور جلن سے نقصان ہی پہنچ جانے کا خطرہ ہی رہے گا۔ ہم بہت دنوں سے آپ جیسے سہارے کی تلاش میں تھے۔ بندے کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی نواب صاحب کے دربار میں بڑی عزت ہے۔ اگر ہم آپ کی وساطت سے وہاں تک رسائی حاصل کر لیں گے تو ہماری سات پشتیں آپ کے اور آپ کے خاندان کے حق میں دعاگو رہیں گی۔"

ناظر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا کہنے لگا۔ "بہتر ہے جناب آپ کے لئے ضرور کچھ کریں گے لیکن اس سلسلے میں ہم بھی کچھ عرض کریں گے۔"

"ضرور ارشاد!" میر فدو نے جواب دیا۔ "اور ارشاد بھی کیا حکم دیجیے۔ تعمیل ہوگی۔"

ناظر نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہم آئندہ یہاں آجا نہیں سکیں گے اور اگر کبھی آئے بھی تو آپ اس کا بطور خاص خیال رکھیں گے کہ ہماری آمد کی اطلاع بختاور سنگھ کو ہرگز نہ ہو۔"

"اس کا خیال رکھوں گا، اور کچھ؟"

"دوسری بات یہ کہ ہم شازی اور آپ کی اپنے گھر دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ وہاں تشریف لائیں۔ وہیں اس موضوع پر کھل کے بات ہوگی۔"

میر فدو نے یہ بات بھی مان لی اور ناظر نے دونوں کو دوسرے دن شام کو اپنے گھر بلا لیا۔
اس دن ناظر کی طبیعت بہت ہلکی رہی۔ دربار میں بختاور سنگھ اسے دیکھ دیکھ کے مسکراتا رہا۔ لیکن آج ناظر بھی نرزدہ نہ تھا۔ جب وہ دونوں دربار سے باہر نکلے تو ناظر نے بختاور سنگھ کو متنبہ کیا اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "بختاور سنگھ! تم جو کچھ کر رہے ہو، اچھا نہیں۔ ہم بھی زبان رکھتے ہیں۔ یہ جب چلے گی تو تمہیں پناہ بھی نہ ملے گی۔" بختاور سنگھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، بولا۔ "یہ ارمان بھی نکال لو۔ ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔ جب یہ دیکھیں گے کہ پرندہ جال میں نہیں پھنس رہا ہے تو اپنا جال کھینچ لیں گے اور نواب کا جال لگے

بڑھادیں گے۔ جس کا ہیں کم ازکم یہ فائدہ تو ضرور پہنچے گا کہ نواب کے مزاج میں کچھ زیادہ رسوخ حاصل کر لیں گے۔ اور شازی بھی ہماری احسان مند رہے گی۔"

ناظر نے سوچا یہ اور برا ہے۔ بختاور اس کے مقابلے میں زیادہ شاطر تھا۔ ناظر کو ایک بار پھر خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو جانا پڑا۔

ناظر نے ان دونوں کی شاندار دعوت کی تھی۔ مکان سے ملحقہ باغیچے میں اس دعوت کا اہتمام ہوا تھا یہاں کا سبزہ اور پھولدار درختوں کی روشیں عجب بہار دے رہی تھیں۔ بیچ میں فوارہ تھا۔ ناظر نے فوارے کے پاس ہی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت کی مختصر حیثیت یہ تھی کہ اس میں کئی قسم کے کھانوں اور پھلوں کے ساتھ ہی کئی طرح کے ساز بھی رکھے ہوئے تھے۔ میر قدو اور شازی انہیں ایک میز پہ سلیقے سے رکھے ہوا دیکھ کر ذرا حیران ہوئے۔ انہیں خیال گزرا کہ شاید یہاں ان کے سوا کسی اور کو بھی بلایا گیا ہے۔ سازوں کے قریب ہی ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ کئی نوکر بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔

شازی نے پوچھا۔ "یہاں ہمارے علاوہ بھی کسی کو مدعو کیا گیا ہے؟"

ناظر نے سر کو نفی میں ہلکی سی جنبش دی۔ "نہیں۔"

میر قدو نے سراپا عجز و نیاز بن کے عرض کیا۔ "خدا حضور کو سلامت رکھے۔ کیا پُر فضا مقام ہے! واہ وا، واہ وا!" ناظر خاموش رہا۔

کھانے کا دور چلا، پھر پھل کھائے گئے۔ خشک میوے چابے گئے۔

آخر میں میر قدو نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟"

ناظر نے جواب دیا۔ "صرف والدہ صاحبہ، جو بوڑھی ہو چکی ہیں۔" پھر اپنے حویلی نما مکان کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "اتنا بڑا مکان اور صرف دو نفر، تنہائی سے جی اکتا گیا ہے۔ اگر یہ ملازم نہ ہوتے تو ہمیں وحشت ہو جاتی۔"

میر قدو نے اور ٹٹولا۔ "بندہ پرور! اور کتنی املاک ہے حضور کے تصرف میں؟"

ناظر نے جواب دیا۔ "گومتی کے اس پار تین گاؤں ہیں۔ شہر کے مختلف علاقوں میں پانچ بڑے بڑے مکانات ہیں جن کا کرایہ اچھا خاصا آجاتا ہے۔ نواب صاحب خاندانی نجابت، ذاتی شرافت اور شعری کمال کے بڑے قدر دان ہیں اور وقتاً فوقتاً ہمیں انعام و اکرام سے نوازتے رہتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے ایک ملازم کو آواز دی۔ "میرن! انہیں مکان کی سیر کرا دو!" پھر میر قدو

سے کہا: "جانیے میر ن ہمارے مکان کو ابھی طرح دکھا دے گا۔"
میر فدو کو جانے میں تامل ہوا لیکن جانا ہی پڑ گیا۔ ناظر نے شازی سے مفصل بات کرنے کے لیے یہ منصوبہ پہلے ہی سے بنا رکھا تھا۔ میر فدو بھی ناظر کی چال سمجھ گیا تھا لیکن اسے شازی پر بڑا اعتماد تھا۔
میر فدو جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا، ناظر شازی کے قریب ہو گیا۔ شازی سکڑ گئی۔
"شازی!" اس نے شازی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
شازی نے موجود ملازم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "احتیاط، یہاں کوئی اور بھی تو موجود ہے۔"
ناظر کی آواز کپکپا گئی: "اس کی پروا نہ کرو۔ جانتی ہو ہم نے یہ دعوت کیوں کی ہے؟"
شازی نے اک ادائے بے نیازی سے جواب دیا: "نہیں!"
ناظر نے افسردگی سے کہا: "آج ہم زیادہ تکلف سے کام نہیں لیں گے، جو کچھ کہنا ہے سیدھے سادے لفظوں میں کہہ دیں گے۔"
شازی اس کی صورت تکنے لگی۔
ناظر اس کی چوٹی ہاتھ میں لے لی اور کہنے لگا: "شازی اس ناگ نے ہمیں ڈس لیا ہے۔ بس کا زہر تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ کیا تم بھی ہمیں چاہتی ہو؟"
شازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس صورت دیکھتی رہی۔
ناظر کا دم گھٹنے لگا: "شازی تم بولتیں کیوں نہیں، ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟"
شازی نے اداسی سے جواب دیا: "ہمیں محبت راس نہیں آتی۔ اگر آپ واقعی ہم سے محبت کرنے لگے ہیں تو آپ کو اس بارے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ آپ ہمیں حاصل نہیں کر سکتے۔"
ناظر کا حوصلہ بڑھا: "شازی! تم اس کی فکر نہ کرو، بس ایک مرتبہ اپنی محبت کا اقرار کر لو اور ہمیں یہ یقین دلا دو کہ تم شادی کر کے ہمارے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو، اس کے بعد کیا ہو گا۔ تمہیں کچھ بھی نہ سوچنا پڑے گا۔"
شازی نے موضوع بدلنے کے لیے میز پر رکھے ہوئے سازوں اور کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "یہ کیوں رکھے ہیں۔ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔"
ناظر کے چہرے پر تازگی آ گئی، کہنے لگا: "ہمیں موسیقی سے بڑی دلچسپی ہے۔ یہ ساز ہم خود بجا سکتے ہیں۔"
شازی نے کہا: "لیکن آپ نے اس کا اظہار پہلے کبھی تو نہ کیا تھا۔"
"ٹھیک ہے، اس وقت اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے کئی دن سے یہ طے کر رکھا تھا کہ تمہاری

شاندار دعوت کریں گے اور اس موقع پر تم پر اپنے اس شوق کا اظہار کریں گے۔" پھر آہستہ سے بولا۔ "سازوں کے پاس رکھی ہوئی کتاب ہماری بیاض ہے۔ ہم بہت خیالی آدمی ہیں اور ہم نے طے کیا ہے کہ جب ہم تمہیں اپنی دلہن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہم دونوں یہاں اس سبزہ زار پر اسی طرح بیٹھا کریں گے اور تم ہماری غزلیں گایا کرو گی۔ ہم یہ ساز بجایا کریں گے۔"

شازی نے جواب دیا۔ "ایں خیال است و محال است و جنوں۔"

ناظر بے چین ہو گیا۔ "کیا تمہیں ہم سے محبت نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں!"

"پھر ہمارا یہ خیال محال اور جنون کس طرح ہوا؟"

"جناب والا! ہم دونوں کا ایک دوسرے سے محبت کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک ہی ہو جائیں گے!"

ناظر بچوں کی طرح اڑ گیا۔ "اگر ہم دونوں کوئی حتمی فیصلہ کر لیں تو ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"

شازی نے کہا۔ "پہلے ہم اپنی محبت کا آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ مشکلات کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔"

ناظر مارے خوشی کے اندھا ہو گیا۔ بے ساختہ اٹھ کے شازی کو گلے لگا لیا اور خوب بھینچ بھینچ کے پیار کرنے لگا۔

شازی کا دم گھٹنے لگا۔ بولی۔ "یہ سب ابھی تو نہ کیجئے، کہیں کوئی دیکھ نہ لے ہمیں۔"

ناظر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ دونوں ایک دوسرے کی سانس اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔ ناظر نے کہا۔ "ہم ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔"

"کس شرط پر؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ اسے مان لو گی!"

"پہلے شرط تو بتایئے۔ اگر ماننے والی ہو گی تو ضرور مان لیں گے۔"

"شرط مشکل نہیں ہے، بہت آسان ہے۔"

"آخر بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

"پہلے وعدہ کرو!"

"چلئے وعدہ!"

ناظر نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو وہاں چلتے ہیں۔ ہم ساز بجائیں گے اور تم ہماری بیاض میں سے کوئی غزل گاؤ گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ بات تم سے آج کہہ ہی دیں۔ جس کے لئے ہم بڑے مضطرب ہیں۔"

شازی تیار ہو گئی۔ دونوں میز کے پاس آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شازی نے میز سے بیاض اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ناظر نے ستار سنبھالا۔ شازی نے کہا "غزل کے انتخاب اور اس کی دھن میں عجلت کے پیش نظر ہم یہ وعدہ نہیں کر سکتے کہ ہم جو کچھ گائیں گے اس سے آپ کو خوش بھی کر سکیں گے اگر اس میں کمی رہ جائے تو اللہ نکتہ چینی نہ کیجئے گا۔ معاف کر دیجئے گا۔"

ناظر نے تاروں کو زخمہ دیا۔ بولا "ہمارے لئے یہی خوشی کیا کم ہے کہ ہم نے جو ایک حسین خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر کا ہلکا سا عکس اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس وقت نکتہ چینی کا ہوش ہی کس کمبخت کو ہے"

شازی نے غزل شروع کر دی۔

"۔۔ سالہ ناکارہ ناصح مجھ سے کہتا ہے تو محبت مت کر۔ میں نے اسے جواب دیا۔ اس نصیحت کے سوا تو اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

محبت کی آگ نے گوشت اور پوست کو تو جلا ہی دیا تھا۔ اب اس کی آنچ ہڈیوں پر بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔

چاند میں وہ متناسب اعضاء کہاں ہیں جو میرے محبوب کے جسم میں پلتے جلتے ہیں پھر چاند سے میرے محبوب کا مقابلہ؟!

خدا کی قسم اگر میرا محبوب مجھ سے یہ وعدہ کرے کہ میں ماگھ پوس کی کڑکڑاتی سردیوں میں تیرے پاس آؤں گا۔ تو برہنہ تن میرا انتظار کر تو میں پورے دو ماہ بغیر لباس کے گزار دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں عشق کی تپش اور مفارقت کی آگ میرے وجود کو گرم رکھے گی۔"

لیکن اس حسین اور پُرکیف محفل کو ایک آواز نے درہم برہم کر دیا۔ باغیچے کے باہر بختاور سنگھ کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ شازی کی سانس رک گئی اور ناظر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بختاور سنگھ کہہ رہا تھا۔ "اجی قبلہ ناظر صاحب! یہ خاکسار دیر سے آپ کی قدمبوسی کا طالب کھڑا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اندر حاضر ہو جائے۔"

ناظر جوش غضب میں اندھا ہو گیا۔ شازی سے کہنے لگا "اس کمبخت کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔ یہ یوں نہ باز آئے گا۔"

جوش میں ناظر باہر پہنچ گیا اور بختاور سنگھ کو ڈانٹتا ہوا بولا۔ "کوتوال صاحب! واللہ ہم نے آپ کا بڑا لحاظ کیا۔ لیکن آپ کی رگوں میں کسی بنئے کا خون گردش کر رہا ہے۔ آپ نے ہمارا یوں پیچھا پکڑ رکھا ہے جس طرح بنیا اپنے مقروض کا پکڑتا ہے۔"

بختاور سنگھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہنس کر بولا۔ "قبلہ ناظر صاحب بات یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ شازی کی حیثیت ایک کرائے کے مکان جیسی ہے جو بھی اس کا کرایہ ادا کرے اس میں رہ سکتا ہے۔ آپ کرایہ ادا کریں گے، آپ رہیں گے میں ادا کروں گا میں رہوں گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہی کرایہ ادا کریں اور مفاہمت کر کے دونوں ہی ایک ساتھ رہنے لگیں۔"

"گستاخ!" ناظر چیخا۔ "ہم تجھے قتل کر دیں گے تو ٹھہر تو جا، ہم طمنچہ لا کے ابھی تجھے ڈھیر کیے دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ناظر تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا اور طمنچہ لے کر فوراً باہر آ گیا لیکن اس وقت تک بختاور سنگھ فرار ہو چکا تھا۔ اس کا دور دور کہیں پتا نہ تھا۔ ناظر غصے میں کانپتا تھرتھراتا شازی کے پاس پہنچا۔ طمنچہ میز پر رکھتا ہوا بولا۔ "واللہ اس بقال کی اولاد کی زندگی تھی جو بچ کر نکل گیا ورنہ اس وقت وہ خون و خاک میں لوٹ رہا ہوتا۔"

اسی لمحے میر فدو بھی واپس آ گیا۔ جب اسے حالات کا علم ہوا تو اس نے ناظر کے رشتۂ امید کو توڑنے کی کوشش کی۔ کہنے لگا۔ "حضور! اپنے کوتوال صاحب بھی بڑے کرم فرما ہیں۔ یہاں آئے تھے تو میزبانی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں بھی اندر بلا لیا جاتا۔" پھر کھوکھلی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ "آپ کا گھر ہے آپ کا اختیار، جیسا کیا، اچھا کیا، میں کیا عرض کر سکتا ہوں، میں کچھ کہوں گا تو چھوٹا منہ بڑی بات کہلائے گی۔"

ناظر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "میر فدو! یہ آپ کیا کہتے ہیں؟"

میر فدو نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ "بندہ پرور کوتوال صاحب نے ہم پر بڑے احسانات کیے ہیں۔"

"کیا احسانات کیے ہیں گنا دو کہ ان کا حساب چکتا کر دیا جائے۔"

میر فدو میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اسی طرح غیر جذباتی آواز میں کہتا رہا۔ "کوئی ایک احسان ہو تو بتا دیا جائے۔ ایک ایک نشست میں سو سو، دو دو سو اشرفیاں شازی کو دے کر گئے ہیں۔ بات حق و انصاف کی کہوں گا جو جیسا ہے۔ اس کی ویسی ہی تعریف کروں گا۔"

ناظر ایک بار پھر تیزی سے اندر گیا اور ذرا سی دیر بعد ہی اشرفیوں کی تین تھیلیاں لے کر واپس آ گیا۔ انہیں میر فدو کی طرف اچھالتا ہوا بولا۔ "میر فدو، تمہیں ابھی تک ہماری طبیعت کا صحیح علم نہیں ہے، ہم پوترڈوں کے رئیس ہیں، کسی بنئے بقال کی اولاد نہیں ہیں۔ یہ اشرفیاں لے جائیں اور جب پھر ضرورت ہو تو

تشریف لائیں۔ انشاءاللہ اس طرح پیشانی پر بل ڈالے بغیر اتنی ہی اشرفیاں اور پیش کر دیں گے۔"
میر فندو نے تینوں تھیلیاں شازی کی طرف بڑھا دیں۔
ناظر کو اتنا غصہ چڑھا تھا کہ اسی وقت ملازم کو حکم دیا کہ "بگھی تیار کی جائے اور ان دونوں کو ان کے گھر پہنچا دیا جائے۔"
حکم کی تعمیل ہوئی اور بگھی دروازے پر آکر لگ گئی۔
شازی کا چہرہ اتر گیا وہ کبھی میر فندو کی شکل دیکھتی تو کبھی ناظر کی صورت تکنے لگتی۔
میر فندو نے اجازت طلب کی۔ "اچھا بندہ پرور! تو اجازت ہے؟"
ناظر نے سر کی جنبش سے اجازت دے دی۔
شازی نے نظروں سے اجازت طلب کی تو ناظر کا جوش ذرا کم ہوا۔ کہنے لگا۔ "تم اپنی طبیعت ملول نہ کرو۔ ہم جلدی ہی تمہارے پاس آئیں گے اور جو کچھ ہم نے سوچا ہے اس سے مطلع کریں گے۔"
لفظ "سوچا" پر میر فندو کے کان کھڑے ہوئے۔ معنی خیز نظروں سے شازی کو دیکھا اور اشرفیوں کی تینوں تھیلیاں سنبھال کر باہر نکل گیا۔ ناظر نے شازی کو بگھی پر بٹھا کر رخصت کر دیا۔
واپس آ کے وہ اسی میز پر بیٹھ گیا، جہاں ساز اور بیاض کے علاوہ بھرا ہوا طمنچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ میز پر سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ جب غصہ ذرا کم ہوا تو اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ بختاور سنگھ کے ساتھ جو سلوک سرزد ہوا تھا اس کے نتائج سے وہ خوفزدہ تھا۔ اس نے سوچا کہ کوتوال اس کے خلاف معلوم نہیں کیا گل کھلائے۔ اس نے اسی فکر اور تردد میں باغیچے میں نصف رات گزار دی۔
ناظر کئی دن تک دربار بھی نہ جا سکا۔ شازی سے ملنے کو جی چاہا لیکن غیرت پیر پکڑتی تھی۔ بڑی ہمت کی پھر بھی قدم نہ اٹھ سکے۔ اس عالم میں تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن ہمت کر کے بہن کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے پہلی بات جو محسوس کی وہ یہ تھی کہ شازی جس گھر میں رہتی تھی اس میں بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ ناظر کا دل دھک سے رہ گیا کہ خدا خیر۔
اوپر بہن کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھنے پر بس اتنی سی بات اور معلوم ہو سکی کہ کل وہ لوگ مکان خالی کر گئے۔ کوتوال انہیں معلوم نہیں کہاں لے کر چلا گیا۔ ناظر کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ بہن سے زیادہ باتیں بھی نہ کر سکا چپ چاپ مسہری پر جا کر پڑ رہا۔
اس بات کو بھی کئی دن گزر گئے اور ناظر بدستور خانہ نشین رہا، دربار بھی نہ جا سکا۔ اب اس کی عقل کچھ بھی کام نہ کرتی تھی۔ اسے بختاور سنگھ پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا۔ بار بار اسے قتل کر دینے کو جی چاہتا لیکن مآل اندیشی

آرہے آجاتی۔ کچھ دن تو یہ آس بھی رہی کہ شازی اس سے محبت کرتی ہے ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئے گی لیکن ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ واپس نہ آئی۔

ایک دن نواب کے دربار سے اس کا بلاوا آگیا، نوابی فرستادے نے اسے یہ پیام دیا تھا کہ نواب صاحب اس کی غیر حاضری سے ناراض ہیں اور ان کا حکم ہے کہ ناظر اپنی اولین فرصت میں نواب کی بارگاہ میں حاضر ہو اور دست بستہ معافی کا طالب ہو۔

ناظر نے جلدی جلدی تیاری کی اور دربار میں حاضری دینے کے لئے بگھی پر روانہ ہوگیا، راستے بھر وہ اپنی غیر حاضری کے جواز کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کوئی زوردار عذر سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جب وہ نواب کے محل میں پہنچا تو پتا چلا کہ نواب صاحب اپنے دربار میں نہیں ہیں، اٹھ چکے ہیں اور اس وقت کہیں اپنے مخصوص مصاحبین کے ساتھ انتہائی ذاتی مشاغل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ واپس بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اسے بلایا گیا تھا اور نواب کی طلبی کے دوران واپسی کا حکم ملے بغیر چلے آنا سنگین جرم تھا۔ ناظر کو وہیں ٹھہرنا پڑا اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح نواب کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔ بڑی دیر بعد اچانک حکم ملا کہ ناظر کو محل خاص میں طلب کیا گیا ہے۔ وہ دھڑکتے دل، مرتعش اعضا اور لڑکھڑاتے قدموں سے نواب کے خواجہ سرا کے ساتھ محل خاص کی طرف روانہ ہوگیا، وہ مختلف کمروں اور برآمدوں سے گزرتا ہوا محل کے انتہائی اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جس کے ملحقہ حصے سے ہنگامہ ہا ہو، شور غل اور چہکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خواجہ سرا اسے یہیں روک کر دوسری طرف چلا گیا اور کافی دیر بعد ناظر کی باریابی کی اجازت کے ساتھ واپس آیا، جب ناظر نے نواب کی بارگاہ میں حاضری دینے کے لئے آخری بار قدم اٹھائے تو وہ بہت بھاری ہو رہے تھے۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا لیکن وہ اپنے وجود کو زبردستی گھسیٹتا ہوا خواجہ سرا کا ساتھ دے رہا تھا۔

اندر کا سماں ہی نرالا تھا۔ ایک لمبی سی میز کے سامنے نواب نصیر الدین حیدر نشے میں بدمست بیٹھے ہوئے تھے، میز پر آلات میکشی رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے مورچھل بردار خواتین کی قطار مورچھل ہلا کر اپنی خدمت اس طرح انجام دے رہی تھیں کہ دو دو خواتین مورچھل ہلاتی ہوئی آگے بڑھتیں اور پھر جب وہ واپس ہوتیں تو دوسری دو خواتین ان کی جگہ لے لیتیں۔ یہ خواتین اتنی حسین تھیں کہ ناظر کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ متناسب جسم سے چپکا ہوا چست لباس ان کے ایک ایک عضو کے زیر و بم کی اس طرح نمائش کر رہا تھا کہ آدمی کے جذبات شہوانی میں آگ لگ جاتی تھی۔ گھنیرے سیاہ گھونگھریالے بالوں کی چوٹیوں میں رنگین زرتار پھندنے قیامت ڈھا رہے تھے۔ ان کے زرد، سرخ اور نیلے لباسوں پر آب رواں کے دوپٹے حشر کا سامان تھے

ناظر تو اس جگہ کے ایک ہی منظر میں کھو گیا۔ اس عالم سرگشتگی میں اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی عام جگہ نہیں ہے۔ نواب نصیر الدین حیدر والی اودھ کی محفل خاص ہے۔ وہ مؤدب ہو گیا اور نواب کے سامنے جھک کر آداب شاہی بجا لایا۔ نواب نشے میں کچھ اتنے دُھت تھے کہ انھوں نے ناظر پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ اچانک اس کی نظر اس حسینہ پر پڑی جو اس محفل خاص میں نواب کے لئے ساقی گری کی خدمت انجام دے رہی تھی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں تلے تاریکی پھیلنے لگی۔ یہ شازی تھی جس کے ایک شانے پر نواب کا ہاتھ تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے نواب کو جام پیش کر رہی تھی، ناظر کو اس منظر پر یقین نہ آیا۔ اس نے فرطِ کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل سینے میں اس بُری طرح ڈوب رہا تھا کہ اسے موت کا مزہ آگیا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تو نواب صاحب شازی کو اپنی آغوش میں لیے چکے تھے اور اس کے لب و رخسار پر بے تحاشہ بوسوں کی بارش فرما رہے تھے۔ اس عالم میں شازی کی نظریں ناظر سے مل گئیں اور وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ ناظر نے اس کی آنکھوں میں موجود حسرت و ناکامی کی افسردہ کیفیات کو محسوس کیا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو" ناظر! میں مجبور تھی، ناظر میں مجبور ہوں"۔

اچانک خواجہ سرا نے نواب کے کان میں کچھ عرض کیا اور نواب نے جھرجھری لے کر ناظر کو گھورا۔ غریب شاعر ان نظروں کی تاب نہ لا سکا پیر تھرائے اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی نواب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا" واللہ! ہمارا بڑا رعب ہے۔ لوگ ہماری نظروں کی تاب نہیں لا سکتے"۔ اس کے بعد خواجہ سرا کو حکم دیا" اس شاعر کو ہوش میں لایا جائے۔ بدولت اس سے چند باتیں کریں گے"۔

حکم کی تعمیل ہوئی ناظر کو ہوش میں لایا گیا اور اسے دو آدمیوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کے نواب کے حضور لے جا کے کھڑا کر دیا۔ نواب صاحب انتہائی ترنگ میں تھے، بدمست شرابی کی طرح سر نہوڑائے ناظر کو ایک نظر دیکھا اور حکم دیا" اسے ہماری داہنی جانب بٹھایا جائے"۔

اس حکم کی بھی تعمیل کر دی گئی۔ ناظر کو داہنی جانب کی ایک کرسی پر زبردستی بٹھا دیا گیا۔ ناظر کو اس وقت اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ اس نے خواب جیسے عالم میں یہ محسوس کیا کہ شرکاء محفل تمسخر و استہزا سے دیکھ دیکھ کر کچھ مسکرا رہے ہیں اور کچھ زور زور سے ہنس رہے ہیں۔

نواب نے بہکے بہکے لہجے میں ارشاد فرمایا" واللہ! یہ شاعر بہت خوش قسمت ہے، اس کے دل پر ہمارا رعب بیٹھ گیا ہے۔ بدولت سمجھتے ہیں کہ جو خود ہی مر رہا ہو اس کا مارنا فضول ہے"۔ اس کے بعد شازی سے پوچھا" کیوں اے دلنواز کشمیر کی کلی! اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

شازی نے عرض کیا "حضور کا ارشاد فرمانِ خداوندی ہے یہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔" اس نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن ان چند لفظوں کی ادائیگی میں اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ ناظر کے دل پر شازی کے یہ الفاظ برق بن کے گرے اور اس میں شازی سے متعلق سارے سہانے خواب جل کر خاک ہو گئے۔

نواب صاحب نے دیوانوں کی طرح شازی کو دیکھا اور ارشاد فرمایا "شازی ہم تجھ سے بہت خوش ہیں۔ آج تو اس محل کی جان ہے ہم تیرا رقص دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور کوئی درد بھری غزل چھیڑ۔"

شازی تعمیل حکم میں فوراً جدا ہو گئی اور رقص پر آمادہ ہو گئی۔

نواب صاحب نے ہوشمند شرابی کے انداز میں ناظر کو دیکھا اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے فرمایا۔ "او نادان کم عقل شاعر! کیا یہ درست ہے کہ تو اس بے مثل حسینہ کے عشق میں اتنا پاگل ہو رہا تھا کہ یہ جو ہماری امانت تھی تو اس سے عشق لڑا رہا تھا اور اس سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا؟"

ناظر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نصیر الدین حیدر نشے میں بہکتے رہے۔ "لیکن تو نے دیکھا ہم ظل اللہ ہیں۔ ہماری امانت کی خدا حفاظت کرتا ہے۔ آج تو نادم و شرمسار ہے اور ہم کامران و بامراد۔ خبردار جو آئندہ ایسی نادانی کی حرکت کی۔ ہم تیری اس ادا سے بہت خوش ہیں کہ تیرے دل میں ہمارا رعب بیٹھ گیا ہے۔ آج اب جو کچھ بھی یہاں ہوگا تیری ضیافت طبع ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کچھ تو بھی خوش ہو لے۔"

لیکن ناظر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ نواب اس کرم فرمائی اور شاعر نوازی کے پردے میں اسے خوب اچھی طرح ذہنی کوفت اور قلبی اذیت پہنچا رہا تھا۔

اس کے بعد وہ دھما چوکڑی مچی اور نواب صاحب نے وہ ہنگامہ کیا کہ شازی رقص و موسیقی کا مظاہرہ بھی نہ کر سکی۔

جب نواب صاحب بالکل بے حال ہو گئے تو نیم وا مخمور آنکھوں سے شازی کو دیکھا اور اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کسی کو حکم دیا "ارے کوئی ہے اس نازک اندام کشمیر کی کلی کو ہزار اشرفیاں عطا کی جائیں۔ ہم اندر جائیں گے۔"

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ نواب نے شازی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہم اندر جائیں گے۔"

شازی نے بجاری بھرکم نواب کو بھرپور سہارا دیا اور نواب لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ حرم سرا کی طرف چل دیئے۔

اندر بیگمات شاہی نے شازی کو دیکھ کر منہ بنایا لیکن نواب نے انھیں ڈانٹ دیا۔ "منہ کیا بناتی ہو" یہ

بیگم ہے۔ اس کا حسن دیکھو ہم اسے سونے کا مکان بنوا دیں گے، اسے اپنی ملکہ بنائیں گے۔" پھر ہنستے ہوئے شازی کو دیکھا اور گال پہ ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیوں ری! تو ہماری ملکہ بنے گی؟"

شازی نے بیگمات کی موجودگی میں شرما کر گردن جھکا لی کوئی جواب نہ دیا۔

نواب نے بیگمات کو ڈانٹا۔ "تم سب دفعان ہو جاؤ یہاں سے، ہمیں اپنی شازی کے ساتھ چھوڑ دو تخلیہ، تخلیہ!" ساری بیگمات ایک دم اِدھر اُدھر ہو گئیں اور وہاں نواب اور شازی کے سوا تیسرا کوئی شخص بھی نہ رہ گیا۔ پھر چوبندی چڑھی ہے اور طوفان اٹھا ہے تو وہ بڑی دیر تک شازی کو زیر و زبر کرتا رہا اور شازی تنکے کی طرح اس طوفان کی زد میں رہی۔

جب ناظر محل سے باہر آیا تو اس کی بختاور سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ناظر بالکل بے جان ہو رہا تھا۔ اس کا دم خم اس سے چھین چکا تھا۔ اس نے بختاور سنگھ کو دیکھا اور اس طرح لاتعلق بن گیا گویا دونوں میں کبھی صاحب سلامت بھی نہ تھی۔

بختاور سنگھ نے اسے چھیڑا، پوچھا "کہاں سے آ رہے ہیں؟ دربار سے؟ وہاں کچھ دیکھا؟"

ناظر نے کوئی جواب نہ دیا، اپنی بگھی کی طرف بڑھا۔

بختاور سنگھ بالکل قریب آ گیا اور ایک بار پھر چھیڑا۔ "نواب صاحب سے ملاقات ہوئی؟ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔"

ناظر پہ جذبات کی شدت کا غلبہ تھا اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس نے ایک نظر بختاور کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

بختاور سنگھ حیران تھا کہ اس گرم مزاج شخص کو کیا ہو گیا۔ وہ ناظر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بولا۔ "اس دن اگر میں بھاگ نہ آتا تو کیا آپ واقعی مجھے قتل کر دیتے؟"

ناظر بگھی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے بختاور سنگھ کو جھڑک دیا۔ "اپنی راہ لو ہمیں مت چھیڑو، ہم اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔"

"دوست!" بختاور سنگھ کہنے لگا۔ "تم نے شازی سے اکیلے ہی اکیلے معاملہ کرنا چاہا۔ وہ بازار کی چیز تھی ہم سب کو اس سے لطف اندوز ہونے کا حق پہنچتا تھا۔ لیکن تم نے خود غرضی سے اسے صرف اپنے لیے ہتھیا لینا چاہا اور مجھ سے اہانت آمیز سلوک کرنے لگے، پھر تو تم یہ جانو کہ تمہارے یار کو بھی ہزار ہتھکنڈے آتے ہیں۔ میں نے یہ سوچا کہ اب معاملہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے تو بہتر یہی ہے کہ شازی نہ تمہیں ملے نہ ہمیں۔ جو اس کا

اصل مستحق ہے اس کے حوالے کر دیا جائے چنانچہ حق بہ حقدار رسید کے مصداق اسے نواب صاحب کے حوالے کر دیا گیا اور اس سے متعلق اِدھر اُدھر سے کچھ روداد بھی گوش گزار کر دی گئی۔"

ناظر نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، پائیدان پر پیر رکھ کر بگھی پر چڑھ گیا اور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کوچوان کو حکم دیا۔ "گھر!"

بگھی چل دی اور بختاور سنگھ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہاں تک کہ بگھی چھوٹی ہوتی چلی گئی اور پھر ٹیڑھے میڑھے راستوں میں کہیں گم ہو گئی۔

ناظر کچھ ایسی بے کیفی، مایوسی اور دل برداشتگی کا شکار ہوا کہ ہر کہیں کا آنا جانا موقوف ہوا۔ سارا سارا دن گھر اور باغیچے کے چکر لگاتا رہتا۔ شعر و شاعری پر بھی طبیعت آمادہ نہ ہوتی۔ کبھی منہ لپیٹ کے پڑ جاتا کبھی رونے لگتا۔ کبھی سوچنے لگتا۔ رنگین ماضی سے سوگوار حال اور ویران مستقبل تک اب کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ اب اسے کسی کا خوف بھی نہ تھا۔ دربار کی آمد و رفت بھی موقوف ہو گئی۔ اسے نوابی عتاب کا بھی ڈر نہ تھا۔ معلوم نہیں اسے اب بھی یہ امید کیوں تھی کہ نواب کا ظالم و جابر ہاتھ شازی کو زیادہ دنوں تک اپنے قابو میں نہ رکھ سکے گا اور شازی محلسرا کی پُرپیچ چہار دیواریوں کو ناگہتی پھلانگتی اس کے پاس آ جائے گی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جائے گی۔ دل کا بوجھ اتارنے کے لئے اس نے شازی کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ یہ خط شازی تک پہنچے گا کس طرح؟ اسے تو بس دل کی بھڑاس نکالنا تھی۔ اس نے لکھا:

"شازی! میرے تیرہ و تار غم خانے کے آفتاب! بالآخر تم محلسرا کے افق میں غروب ہو گئیں۔ کیا تم وہاں خوش ہو؟ اس دن تم نے میری بڑی جان جلائی لیکن تم بھی کیا کرتیں مجبور تھیں۔ شازی! تم نہیں جانتیں یہ نواب لوگ کتنے ظالم اور بے وفا ہوتے ہیں۔ یہ محبت نہیں کرتے، یہ بوالہوس ہوتے ہیں۔ ان کی محبتیں، عنایتیں، کرم فرمائیاں اور نوازشیں وقتی ہوتی ہیں۔ چند دنوں یہ تم سے کھیلے گا اور پھر تم بھی ان سینکڑوں اور ہزاروں محلسرائی بدنصیبوں میں داخل کر دی جاؤ گی جن کی زندگیاں بقیہ زندگی کی آخری سانسوں تک مہجور و محروم رہیں گی یا پھر اپنے جذبات اور خواہشات کی آگ بجھانے کے لئے ان ادنیٰ خدمتگاروں کی منت کش ہوں جو ان کے آس پاس ان کی خدمتگاری اور نگرانی پر متعین ہیں۔

شازی! میں اب بھی تمہارا منتظر ہوں جب چاہو آ جاؤ۔ باغیچے میں میز بچھی ہے، شام ہوتے ہی جب چراغ جل جاتے ہیں۔ میں سازوں کو قرینے سے میز پر سجا کر ان کے قریب ہی اپنی بیاض رکھ دیتا ہوں، اور باغیچے کے در پر نگاہیں جما کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن آؤ گی ضرور کیونکہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے جب تم آ جاؤ گی تو میں اپنے منصوبے کے مطابق ستار بجاؤں گا اور تم میری

غزلیں گایا کرو گی۔ اللہ کیسا پُرلطف سماں ہوگا لوگ ہم پر رشک کریں گے اور ہاں ایک بات اور، بختاور سنگھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اپنی دانست اور اختیار میں جو بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا، پہنچا چکا۔ اب وہ ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔"

ناظر ہر روز اسی نوعیت کے خطوط اور مستقبل نامے شازی کے نام لکھتا رہتا اور لکھ کر احتیاط سے ایک صندوق میں جمع کرتا رہتا۔ ادھر دربار میں بختاور سنگھ موقع موقع سے ناظر کے خلاف نواب صاحب کو ورغلاتا رہتا۔ کبھی کہتا: "ناظر اب دربار میں بھی نہیں آتا۔ کبھی کہتا، ناظر حضور کو نازیبا الفاظ میں یاد کرتا رہتا ہے۔" لیکن نواب کو ایک معمولی شاعر یا رئیس زادے سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ ہاں بختاور سنگھ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ روزمرہ کے نوابی اخراجات بختاور سنگھ کی نگرانی میں ہونے لگے تھے جس سے اس کی دولتمندی میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ میر فدو بھی بہت خوش تھا کیونکہ شازی کا نصیبہ بڑے عروج پر تھا۔ اس کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔ میر فدو کی دولت بھی خوب بڑھ رہی تھی۔ محفل خاص سے محلسرا تک شازی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ چرچے کسی نہ کسی طرح ناظر کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

ایک دن سہ پہر کو ناظر کا بے حد دل گھبرایا تو اس نے بگھی تیار کرائی اور اس پر سوار ہو کے دریائے گومتی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب بگھی دریائے گومتی کی سڑک پر پہنچی تو نوابی سپاہیوں نے اس کی گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لینے پر مجبور کر دیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب کی سواری گزرنے والی ہے۔ ناظر کے جی میں آئی کہ کسی طرح وہ یہاں سے فرار ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اب تو بھاگنے کا وقت بھی نہ تھا۔ خوفزدہ اور پریشان سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد نواب کی سواری گزری۔ اس وقت نواب صاحب اپنی گاڑی سے دریائے گومتی کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ دفعتہً ان کی نگاہ ناظر پر پڑ گئی۔ نواب نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ اس شاعر کو ان کے قریب لایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور لوگ ناظر کی طرف دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں ناظر کو لے کر نواب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

نواب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تاہم صبر و ضبط سے کام لیا اور ناظر سے دریافت کیا "کیوں جی تم دربار کیوں نہیں آتے ہو؟"

ناظر نے عذر کیا۔ "قبلۂ عالم پچھلے دنوں میں سخت بیمار رہا ورنہ یہ غلام حاضری سے محروم نہ رہتا۔" اس نے محسوس کیا اندر سے کسی کی دو آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اسے شبہ گزرا کہ یہ آنکھیں شازی کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتیں۔ اس کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے عجز و انکسار سے گردن جھکا لی۔

نواب نے حکم دیا۔ "ہم راستے میں گفتگو کے قائل نہیں۔ یہ رسمِ شرافت کے خلاف ہے کل تم دربار میں آ جانا!" اور نواب کی سواری آگے بڑھ گئی۔

دوسرے دن دل نہ چاہنے کے باوجود وہ دربار چلا گیا۔ جس وقت وہ دربار میں پہنچا، نواب بختاور سنگھ سے مصروفِ گفتگو تھے اور طبیعت بڑی منقبض سی تھی۔ بختاور سنگھ ایک پوٹلا لئے مودب خمیدہ سر کھڑا تھا۔ ناظر کورنش و تسلیمات بجا لایا۔ نواب نے ایک نگاہ غلط انداز سے اسے دیکھا اور بختاور سنگھ سے دریافت کیا "اس چونگلے میں کیا ہے؟"

بختاور سنگھ نے مختصر جواب دیا۔ "قبلۂ عالم کے ماہانہ خرچ کی فرد ہے یہ۔"

نواب نے کسی کو حکم دیا۔ "اس چونگلے کی پیمائش کی جائے۔"

بختاور سنگھ نے چونگلے کا ایک سرا پکڑ کے چھوڑ دیا جس سے وہ دور تک کھلتا چلا گیا۔ گز آچکا تھا۔ اور دو آدمی چونگلے کی پیمائش کر رہے تھے۔ معلوم ہوا اس کی لمبائی ساڑھے چار گز اور چوڑائی نصف گز ہے۔ چونگلے کا طول و عرض ادب کے ساتھ اونچی آواز میں بتا دیا گیا۔

"کیوں جی! کل خرچ کتنا ہوا ہوگا؟"

بختاور سنگھ نے خود حساب کے میزان پر نظر ڈالی اور با آوازِ بلند عرض کیا۔ "قبلۂ عالم کل بائیس ہزار روپے و بلس" نواب صاحب نے کہا۔ "یہ تو مہینے کے اخراجات معمولہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے!"

بختاور سنگھ نے عجز و انکسار سے وضاحت کی۔ "قبلۂ بندگان! اس میں دو ہاتھیوں کی قیمت بھی شامل ہے!"

"خیر خیر" نواب نے آخر میں دستخط کر دیئے۔ "جاؤ اسی وقت خزانچی سے یہ رقم وصول کر لو۔"

جب بختاور سنگھ چلا گیا تو کسی مصاحب نے کہا۔ "قبلۂ مومناں! اخراجات میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے" نواب نے اسے ڈانٹ دیا۔ "خاموش! ہم بھی سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ بختاور سنگھ دولت مند ہو جائے تو کیا تم ہمیں بخشش و عنایات سے روک لوگے؟"

معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسی وقت اندرونی دروازے سے شازی نمودار ہوئی۔ ناظر نے اسے جیسے ہی دیکھا اپنے آپ میں نہ رہا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ شازی ناز و انداز سے اٹھلاتی آہستہ آہستہ نواب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نواب نے اسے دیکھتے ہی کراہت سے کہا۔ "بھئی کیا مصیبت ہے یہ تو بلائے بے درماں ہو گئی ہے۔ اس سے خدا اپنی پناہ میں رکھے۔"

نواب کے ان فقرات سے ناظر کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ نواب کا دل اب شازی سے بھر

چکا ہے اور اسے بہت جلد قربت سے محروم کر دیا جائے گا۔

شازی نواب کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ نواب کے التفات بے جا اور کرم بے پایاں نے اس میں غرور سے بے نیازی پیدا کر دی تھی۔ نواب نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

آج نواب کے مصاحبین میں چند انگریز بھی شامل تھے۔ نواب کو انگریزوں سے خصوصی اُنس تھا۔ شازی کو حکم ملا کہ انگریز مصاحبین کے اعزاز میں کوئی غزل چھیڑی جائے۔ اس موقع پر ناظر کو یہ محسوس کر کے بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ شازی اس کی موجودگی کو قطعاً نظر انداز کر رہی تھی۔ ناظر کے دل کو سخت دھچکا لگا۔ اسے شازی سے ایسی امید نہ تھی۔

نواب کا حکم پاتے ہی شازی پھرتی سے اٹھی۔ اس کے آس پاس اس کے سنگتی بھی آ کر کھڑے ہو گئے۔

شازی نے وہی غزل چھیڑی جو وہ ایک بار ناظر کے باغیچے میں گا چکی تھی۔

"اسی سالہ ناکارہ ناصح مجھ سے کہتا ہے تو محبت مت کر۔ میں نے اسے جواب دیا۔ اس نصیحت کے سوا تو اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

محبت کی آگ نے گوشت اور پوست کو تو جلا ہی دیا تھا۔ اب اس کی آنچ ہڈیوں پر بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔

چاند میں وہ متناسب اعضا کہاں ہیں جو میرے محبوب کے متناسب جسم میں۔ پھر چاند سے میرے محبوب کا مقابلہ!!

خدا کی قسم اگر میرا محبوب مجھ سے وعدہ کرے کہ میں ماگھ اور پوس کی کڑکڑاتی سردیوں میں تیرے پاس آؤں گا، تو برہنہ تن میرا انتظار کر، تو میں پورے دو ماہ بغیر لباس کے گزار دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، عشق کی تپش اور مفارقت کی آگ میرے وجود کو گرم رکھے گی۔"

آج نواب پر سرد مہری کی کیفیت طاری تھی۔ کوئی داد نہ دی، نہ آواز کی نہ کلام کی۔ آخر میں طنز سے پوچھا۔ "کیوں جی! یہ کس احمق کا کلام ہے؟"

شازی نے نہایت ادب کے ساتھ ناظر کی طرف اشارہ کیا۔ نواب صاحب نے اپنے مصاحبین کی توجہ کو اس طرف منعطف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "بدولت کا خیال ہے کہ غزل کا اسی سالہ سٹھیایا ہوا ناکارہ ناصح خود شاعر ہے جو ایسے بے سروپا مضامین اپنی غزل میں باندھ رہا ہے۔ دیکھو تو یہ احمق کیا کہتا ہے؟ —— کہتا ہے ماگھ پوس کی سردیاں برہنہ جسم پر جھیل سکتا ہے اور اس کے عشق کی آگ اسے حرارت بخشے گی۔ نری بکواس، سرتاپا ہذیان۔" اس کے بعد شازی پر نزلہ گرا اور "تم؟ تم بھی سٹھیا گئی ہو احمق کنیز نہیں

ایسی غزل کا انتخاب ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر روز تم ہر لمحہ تم، ہر آن تم۔ واللہ تم نے ہماری زندگی اجیرن کردی ہے۔" اس کے بعد ایک انگریز مصاحب سے دریافت کیا۔ "کیوں جی! اگر اس کشیرن کو انگریز عورتوں کا لباس پہنایا جائے، تو یہ کیسی لگے گی؟"

انگریز مصاحب نے جواب دیا۔ "جواب میں کچھ عرض کرنا فضول ہے۔ اگر ارشاد عالی ہو تو یہ لباس منگوائے لیتے ہیں۔ اسی وقت پہنا کر دیکھ لیا جائے۔"

حکم ہوا۔ "اسی وقت ابھی منگاؤ، ہم انگریزی لباس میں اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

انگریز مصاحب فوراً وہاں سے چلا گیا اور ذرا سی دیر میں اپنی میم کا لباس لے آیا۔ اس کی میم موٹی تازی رہی ہوگی اور شازی اکہرے جسم کی تھی۔

نواب نے حکم دیا۔ "شازی! یہ لباس پہن کے آؤ۔"

حکم حاکم، مرگ مفاجات، بددلی سے اٹھی اور اندر جا کر مشرقی لباس اتارا اور لیڈی لباس پہن لیا۔ جب پہن کر باہر آئی تو اس کا عجیب مضحکہ خیز حلیہ بن چکا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا، جھاڑ جھول، بدنمائی کے ساتھ کچھ ادھر لٹکتا تھا اور کچھ ادھر لٹکتا تھا۔ اس کی ساری نزاکت پر پانی پھر گیا تھا اور سارا حسن رخصت ہو چکا تھا۔

اس کی شکل دیکھتے ہی نواب صاحب کا قہقہہ بلند ہوا۔ مصاحبین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ پوری مجلس طنز و استہزا کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ دبے دبے، دھیمے دھیمے لہجوں اور آوازوں میں لوگ کہہ رہے تھے۔ "چڑیل بہت سر چڑھ گئی تھی۔ لے اب مزا چکھ!"

ناظر کا غصے اور افسوس سے بہت برا حال تھا۔ اس سے شازی کی بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسی عالم میں جب اس نے دیکھا کہ شازی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو رواں ہو چکے ہیں اور رخساروں سے پھسلتے ہوئے ٹھوڑی کی راہ سے لباس پر ٹپک رہے ہیں تو اس کا دل بھر آیا اور اس سے یہ المناک منظر دیکھا نہ گیا۔

اسی عالم میں شازی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "قبلۂ بندگاں! لونڈی اپنے وطن کشمیر جانا چاہتی ہے اور مرحمت عالی کی خواستگار ہے۔"

"نہیں!" نواب کا قہقہہ بلند ہوا۔ "ہم تمہیں اس حلیے میں ہر روز اور ہمیشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ واللہ کیا تفنن طبع کا نسخہ ہاتھ آیا ہے، واللہ!"

شازی کی خفیف سی آواز سنائی دی۔ "قبلۂ حاجتمنداں! لونڈی رحم کی طلب گار ہے۔"

www.urdunews.com

یہ تماشا جاری ہی تھا کہ بختاور سنگھ پھر حاضر ہو گیا۔ جب اسے لوگوں سے یہ معلوم ہوا کہ شازی نواب کے جی سے اتر چکی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ خوشی میں پھولا نہ سمایا۔ اس نے سوچا۔ اپنا نصیبہ ان دنوں زوروں پر ہے، نواب صاحب اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں کسی موقع پر شازی کو نواب صاحب سے مانگ لیا جائے گا۔ اس خیال میں ایسا نشہ تھا کہ اس دن جب بختاور سنگھ دربار سے واپس ہوا تو وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور وہ پڑتا کہیں تھا۔

ناظر کی دربار جانے کی پھر ہمت نہ پڑی۔ لیکن بختاور سنگھ شازی کی امیدواری میں اور زیادہ مستعدی سے حاضری دینے لگا۔ اب تو یہ دستور ہو گیا تھا کہ شازی روزانہ ہی یورپین خواتین کے لباس میں نواب کے پاس موجود رہ کر ہدف تضحیک بنی رہتی۔ اس نے جتنا عروج دیکھا تھا اس سے کچھ زیادہ بڑا زوال دیکھ رہی تھی بختاور سنگھ موقع کی تلاش میں تھا اسے یقین تھا کہ یہ پکا ہوا پھل عنقریب اس کی جھولی میں گرنے والا ہے۔

ایک دن جب وہ دربار میں پہنچا تو نواب صاحب بہت خوش تھے بات بات پہ مذاق فرما رہے تھے اس روز انہوں نے بھی انگریزی لباس پہن رکھا تھا۔ نواب صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب وہ انگریزی لباس پہنتے تو انگریزی ٹوپی ہاتھ میں لیے رہتے اور مشغلے کے طور پر اسے انگلی پر نچایا کرتے۔ اس روز بھی یہی شغل فرما رہے تھے۔ انگریز مصاحبین بھی موجود تھے۔ اچانک نواب صاحب کہیں جانے کے لئے اٹھے۔ سارے مصاحبین بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انگریزی ٹوپی نواب کی انگلی پر حرکت میں تھی۔ معلوم نہیں کس طرح اس میں سوراخ ہو گیا اور انگلی ٹوپی کے آر پار ہو گئی۔ نواب نے حیرت سے اسے دیکھا اور بے ساختہ بولے۔ "ایں یہ کیا؟"

بختاور سنگھ ادب سے آگے بڑھا اور حاضر جوابی کے نشے میں بول اٹھا "حضور! تاج میں سوراخ ہو گیا۔" نواب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصّے سے چہرہ سرخ ہو گیا مصاحبین کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ بختاور سنگھ کی جان نکل گئی لیکن تیر نکل چکا تھا۔ اس کی واپسی ناممکن تھی۔ نواب نے غصّے میں پیر پٹخے اور چیخ کر کہا "بدشگونی، بدفالی۔ ہمیں اس کی باتوں سے بغاوت کی بو محسوس ہوتی ہے؟" پھر جوش غضب میں تالی بجائی۔ کئی خدمتگار حاضر ہو گئے۔ نواب نے حکم دیا "بختاور سنگھ کو گرفتار کر لو۔"

بختاور سنگھ گرفتار ہو گیا۔ آناً فاناً سارے اعزازات چھن گئے۔

نواب نے دوسرا حکم دیا "اس کے کھوپڑے کو قابو میں کیا جائے اور ہمیں بتایا جائے کہ وہ بھرا ہوا ہے یا خالی ہے۔"

www.taemeernews.com

طمنچہ بھی چھین لیا گیا اور بتایا گیا کہ طمنچہ بھرا ہوا ہے۔

نواب صاحب نے انگریز مصاحبین کو مخاطب کیا۔ "کیوں جی! تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ بختاور سنگھ باغی ہو گیا تھا؟ اور اس کی بغاوت کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ اس نے پہلے تو ہمارے تاج میں سوراخ کیا اور اس نے سوراخ سے پہلے اپنے طمنچے کو بھی بھر رکھا تھا۔"

ایک انگریز مصاحب نے آہستہ سے عرض کیا "پیر و مرشد! بختاور سنگھ کوتوال تھا اسے اپنے منصب کی بجا آوری کے دوران طمنچے کو بھرا ہوا ہی رکھنا چاہیے۔"

نواب نے اس دلیل کو رد کر دیا۔ "تم انگریز ان ہندیوں کی فطرت کیا جانو! اور ہاں ہمیں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے انگلستان میں تمہارے بادشاہ کے روبرو ایسا جرم سرزد ہو تو اسے کیا سزا دی جاتی ہے؟"

انگریز مصاحب نے عرض کیا۔ "قبلۂ عالم، ہمارا بادشاہ پہلے جرم کی خوب اچھی طرح چھان بین کراتا ہے اس کے بعد یا تو چھوڑ دیا جاتا ہے یا ثابت شدہ جرم کی نوعیت پر معمولی یا غیر معمولی سزا دی جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نواب نے اطمینان کی سانس لی۔ "ہم بھی یہی کریں گے۔ رہا جرم کے ثابت ہونے کا سوال تو وہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے۔ بختاور کی بدخواہیِ سلطنت ثابت ہو چکی ہے اور دوسرا سنگین جرم یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا طمنچہ بھرا ہوا تھا۔ بس یہ دونوں باتیں جرم کے سنگین ہونے کی بخوبی دلالت کرتی ہیں۔"

اور فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "بختاور سنگھ کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا ہے، اس کی کل املاک اور جائیداد نیلام کرا کے اس کی رقم داخل خزانہ کی جائے اور بختاور سنگھ کو تازیست بندی خانے میں ڈال دیا جائے۔"

یہ حکمِ حکم نادری تھا۔ دو آدمی انتہائی ذلت اور بدبدی سے اسے کھینچتے ہوئے دربار کے باہر لے گئے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور بختاور سنگھ کی املاک اور جائیداد بحقِ سرکار نیلام کر کے رقم داخل خزانہ کر دی گئی۔

اس واقعے کو کچھ سال گزر گئے۔ نواب نصیر الدین حیدر رحلت فرما گئے۔ ان کی جگہ نواب محمد علی شاہ نے اودھ کا تاج و تخت سنبھالا۔ تخت نشین ہونے کی خوشی میں بہت سے قیدی رہا ہوئے۔ انہی میں بختاور سنگھ بھی تھا۔ وہ بالکل بوڑھا ہو چکا تھا۔ صحت تباہ ہو چکی تھی۔ بینائی بھی جواب دے چکی تھی۔ کسی مسافر کی طرح جب وہ لکھنؤ کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کہاں جائے۔ بیوی بچے نواب مرحوم کے عتاب سے بچنے کے لئے انگریزی علاقے کانپور میں چلے گئے تھے۔ اس کا اپنا لکھنؤ اب ایک اجنبی شہر تھا۔ سڑکیں مانوس سی ضرور لگتی تھیں لیکن ان میں بیگانگی کا عنصر بھی محسوس ہوتا تھا۔ ذہن پہ زور دیا

کہ کہاں جایا جائے، یہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اس غور و فکر میں اسے ناظر یاد آ گیا۔ وہ بدنصیب شاعر اور اس کا رقیب جس کی کئی بے عزتیاں نواب کے دربار میں ہو چکی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ناظر کی طرف چل دیا۔

مغرب کا وقت تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ ناظر کے گھر پہنچا اور اس نے مرتعش ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر بعد اندر سے ایک ملازم نمودار ہوا۔ اس نے پوچھا: "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

بختاور سنگھ نے دھڑکتے دل سے جواب دیا: "میں ناظر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا!" اس نے آہستہ سے کہا: "آپ کی تعریف؟"

بختاور سنگھ کو بڑا دکھ پہنچا۔ یہ آدمی لکھنؤ کے قوال بختاور سنگھ کو نہیں جانتا۔ اس نے سوچا۔ اس کی بھی کیا خطا، اب یہاں اسے کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا: "ہمیں بختاور سنگھ کہتے ہیں۔"

"بختاور سنگھ!" ملازم کو کوئی بات کھٹکی: "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہ کیسا سوال کرتے ہو بھائی!" بختاور کا دل بھر آیا: "اب تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں سے آیا ہوں۔ میرے بھائی! تم اسی لکھنؤ کے رہنے والے ہو یا کہیں مضافات سے آئے ہو؟"

ملازم نے جواب دیا: "میں اسی لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہوں۔"

بختاور سنگھ کو یک گونہ خوشی سی ہوئی، بولا: "تب پھر تم ہمیں بآسانی پہچان لوگے۔ آج سے آٹھ سال پہلے تمہارے لکھنؤ میں کون قوال ہوا کرتا تھا، جانتے ہو؟"

ملازم نے اپنے حافظے پر زور دیا اور پھر فوراً ہی بول اٹھا: "یہ آپ ہیں قوال صاحب!" اس نے نہایت عقیدت و احترام سے بختاور کو سلام کیا۔

بختاور نے افسردگی سے جواب دیا: "ہاں یہ میں ہوں میرے بھائی۔ نواب محمد علی شاہ نے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں جن قیدیوں کو رہا فرمایا ہے انہی میں میں بھی ہوں۔" پھر دریافت کیا: "اپنے ناظر میاں تو خیریت سے ہیں؟"

ملازم بختاور کو باغیچے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اس کے در کی طرف لے کر چلا اور کہنے لگا: "ان کا حال کیا پوچھتے ہیں قوال صاحب! ان کا عجیب حال ہے۔ ہم انہیں لاکھ لاکھ یہ یقین دلاتے ہیں کہ شازی یا تو اپنے وطن کشمیر واپس چلی گئی یا مزید دولت کمانے کی ہوس میں کسی دوسرے دربار کا رخ کر گئی ہے۔

لیکن ان کا تو جیسے ذہنی توازن ہی بگڑ گیا ہے۔ کھاتے پیتے ہیں لیکن بات چیت کم کرتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے بھی نہیں۔ شازی کا کبھی نام بھی نہیں لیتے۔ لیکن جہاں شام ہوتی ہے یہ باغیچے میں بچھی ہوئی میز پر ساز اور بیاض رکھ کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں باغیچے کے در پر لگ جاتی ہیں۔ جیسے شازی بس آنے ہی والی ہو۔ اس انتظار میں جب نصف رات گزر جاتی ہے تو اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں۔"

جب ملازم بختاور سنگھ کو لے کر ناظر کے سامنے پہنچا تو وہ اپنے پرانے رقیب کو پہچان نہ سکا۔ ناظر نے جھرجھری لی۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں بختاور سنگھ کو دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ ناظر کی صحت بھی تباہ ہو چکی تھی۔ آنکھیں ویران اور ایسی خشک تھیں جیسے اب ان میں کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔

اچانک ناظر اٹھا اور بے ساختہ بختاور سنگھ سے لپٹ گیا۔ "کوتوال صاحب!"

بختاور کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں ناظر کی پشت تھپتھپاتا ہوا بولا۔ "ناظر میرے بھائی! صبر کرو صبر! دیکھو تو میں تم سے زیادہ دکھی ہوں۔"

ناظر نے کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن جب بختاور سنگھ کے سینے کے کپڑے کے اس پار جسم نے کچھ نمی محسوس کی تو اسے اندازہ ہوا کہ آج ان ویران آنکھوں سے جو بظاہر خشک اور صحرا کی مانند تھیں ایک چشمہ بہہ نکلا ہے اور اس کی سوت سینے پر عین اس کے دل پر پھوٹ نکلی ہے جس میں ساری کدورتیں، جملہ آلائشیں اور تمام باہمی تکدرات خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں۔